پھٹتے آموں کا کیس
(A Case of Exploding Mangoes)
محمد حنیف
انگریزی سے ترجمہ سیّد کاشف رضا
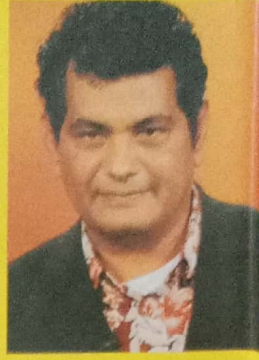
محمد حنیف پنجاب کے ضلع اوکاڑہ میں 1965 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پاک فضائیہ میں بہ طور پائلٹ شمولیت اختیار کی مگر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر کراچی میں صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ وہ نیوز لائن میں رپورٹر اور پھر بی بی سی اردو سروس کے سربراہ رہے۔ اب تک اُن کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز'' 2008 میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول ''آور لیڈی آف ایلس بھٹی'' 2011 میں اور تیسرا ناول ''ریڈ برڈز'' 2018 میں شائع ہوا۔ وہ ''دی لانگ نائٹ'' کے نام سے 2002 میں ایک فلم کا اسکرپٹ لکھ چکے ہیں جب کہ ''واٹ ناؤ، ناؤ دیٹ وی آر ڈیڈ'' کے نام سے ایک ریڈیو ڈراما اور دو ہزار آٹھ میں ''دی ڈکٹیٹرز وائف'' کے نام سے اسٹیج ڈراما لکھ چکے ہیں۔

انگریزی میں ان کا ہفتہ وار کالم نیویارک ٹائمز میں شائع ہوتا ہے، جب کہ بلوچ لاپتا افراد سے متعلق ان کی ایک کتاب ''دی بلوچ ہو از ناٹ مسنگ، اینڈ ادرز ہو آر'' کے نام سے 2013 میں شائع ہوئی جس کا اردو ترجمہ ''غائبستان میں بلوچ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

محمد حنیف اردو میں کالم لکھتے ہیں جو بی بی سی کی ویب سائٹ پر شائع ہوتا ہے۔ پہلے انگریزی ناول سے قبل انھوں نے اردو میں بھی ادبی تحریریں لکھیں جن میں سے دو اردو کے وقیع ادبی جریدے ''آج'' میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے ایک دلچسپ تحریر ان کے اسرائیل کے سفر کے بارے میں بھی ہے۔

محمد حنیف بی بی سی پنجابی سروس کے لیے پنجابی زبان میں وی لاگ بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو سے انگریزی میں تراجم بھی کیے ہیں۔ بہ یک وقت تین زبانوں میں مہارت انھیں پاکستان کے دیگر انگریزی فکشن نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

محمد حنیف کے عالمی شہرت یافتہ انگریزی ناول ''اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز'' کا دنیا کی ڈیڑھ درجن سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس ناول نے دو ہزار نو میں بہترین پہلی کتاب کے لیے دولتِ مشترکہ کا ایوارڈ حاصل کیا۔ اس ناول کو گارڈین فرسٹ بک ایوارڈ کے لیے بھی شارٹ لسٹ کیا گیا۔ دو ہزار آٹھ کے بکر پرائز کے لیے یہ ناول تیرہ بہترین ناولوں کی لانگ لسٹ میں شامل تھا۔ دو ہزار آٹھ میں اسے بہترین پہلی کتاب کے لیے شکتی بھٹ ایوارڈ بھی دیا گیا۔

سید کاشف رضا 1973ء میں پی اے ایف بیس سرگودھا میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد اپنی پوسٹنگ کے سلسلے میں مقیم تھے۔ کراچی اور راول پنڈی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی یونی ورسٹی سے پہلے انگریزی ادبیات اور پھر انگریزی لسانیات میں ایم اے کیا۔ پیشے کے طور پر اخباری اور الیکٹرانک میڈیا کو اختیار کیا۔ اپنے پیشہ ورانہ سفر کے دوران روزنامہ جنگ، ڈان، آج ٹی وی اور جیو نیوز سے وابستہ رہے۔

سید کاشف رضا کی شاعری کے دو مجموعے ''محبت کا محلِ وقوع'' 2003 اور ''ممنوع موسموں کی کتاب'' 2012 میں شائع ہوئے۔ انھوں نے غزل، آزاد نظم اور نثری نظم کی اصناف میں شاعری کی۔ سید کاشف رضا کا ناول ''چار درویش اور ایک کچھوا'' مکتبہ دانیال کے زیرِ اہتمام اکتوبر 2018 میں شائع ہوا اور اس نے ناقدین اور عام قارئین دونوں سے یک ساں داد وصول کی۔ کتابوں اور فلموں کے ساتھ ساتھ انھیں سیاحت سے بھی شغف ہے۔ وہ ایران، چین، بھارت، ترکی، کینیا، زنجبار اور یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کر چکے ہیں۔ سید کاشف رضا کی سفری کہانیوں کا مجموعہ ''دیدم استنبول اور دیگر سفر کہانیاں'' کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

رواں برس انھوں نے ایک کتابی سلسلے ''کراچی ریویو'' کی بھی داغ بیل ڈالی۔ یہ کتابی سلسلہ کتابوں پر تبصروں کے لیے مخصوص ہے اور اب تک اس کے دو شمارے سامنے آ چکے ہیں۔ سید کاشف رضا تنقیدی، سیاسی اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں جو ادبی جرائد اور ویب سائٹس کے ساتھ ساتھ ڈان، دی نیوز انٹرنیشنل اور رونامہ جنگ میں شائع ہو چکے ہیں۔

سید کاشف رضا نے خورخے لوئیس بورخیس، جیمز جوئس، ازابیل آئندے اور دیگر ادیبوں کے تراجم کیے ہیں۔ نوم چومسکی کی تحریروں کے تراجم پر مشتمل ان کی دو کتابیں ''دہشت گردی کی ثقافت'' 2003 اور ''گیارہ ستمبر'' 2004 میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ وہ اقبال احمد کے مضامین کا اردو ترجمہ بھی مرتب اور مدون کر رہے ہیں۔ میلان کنڈیرا کے ناول ''دی جوک'' اور بعض دیگر تراجم اور تحریروں پر بھی کام کر رہے ہیں۔

محمد حنیف کے ناول ''اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز'' کا یہ ترجمہ انھوں نے 2013 میں مکمل کر لیا تھا۔

پھٹتے آموں کا کیس

ناول

محمد حنیف

ترجمہ
سیّد کاشف رضا

مکتبہ دانیال

یہ فکشن ہے۔ اس میں درج تمام واقعات، مکالمے اور تمام کردار، سوائے کچھ معروف تاریخی اور عوامی شخصیات کے کرداروں کے، مصنف کے تخیل کی پیداوار ہیں سو انھیں حقیقی نہ گردانا جائے۔ جہاں کہیں بھی تاریخی اور عوامی شخصیات اپنے اصل نام سے سامنے آئی ہیں، وہاں ان سے منسلک صورت حال، واقعات اور مکالمے مکمل طور پر فکشن ہیں اور ان سے یہ قطعی مقصود نہیں کہ انھیں حقیقی واقعات کی نمایندگی سمجھا جائے، یا ان کی وجہ سے اس کتاب کی مکمل طور پر فکشنی نوعیت کو تبدیل کیا جائے۔ کسی اور صورت میں بھی کسی زندہ یا انتقال کر چکے شخص سے کوئی بھی مماثلت مکمل طور پر اتفاقیہ ہوگی۔ کتاب میں جن مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے ان میں سے زیادہ تر وجود رکھتے ہیں مگر کچھ مقامات کو تبدیل بھی کیا گیا ہے اور ان کے نام بھی بدلے گئے ہیں اور جغرافیے اور تاریخ کے ساتھ چھوٹی موٹی آزادی بھی لی گئی ہے۔

پہلی اشاعت : ۲۰۱۹ء

ناشر : حوری نورانی

طباعت : مقصود دانش پرنٹرز، کراچی

قیمت : ۹۵۰ روپے

ISBN: 978-969-419-095-2

Phaṭṭē Aamon ka Case (NOVEL)

by Muhammad Hanif

Translated by Syed Kashif Raza

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE

مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone: 35681457-35682036-35681239
Email: danyalbooks@hotmail.com

انتساب

مسعود عالم ڈار کے نام

پیش لفظ

کریش کے بعد آپ نے مجھے ٹیلے وژن پر دیکھا ہوگا۔ وہ کِلپ چھوٹا سا ہے اور اس میں بھی ہر شے سورج کی شعاعوں میں چھپی ہوئی اور کچھ مدھم سی ہے۔ ٹی وی پر کچھ ابتدائی خبرناموں کے بعد اسے ہٹا لیا گیا تھا، کیوں کہ اس سے قوم کے مورال پر بُرا اثر پڑنے کا امکان تھا۔ آپ اسے کِلپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اس میں ہم سب پاک ون کی جانب چلتے ہوئے نظر آرہے ہیں، جو رن وے کے وسط میں کیمرا مین کی پشت کے پیچھے کھڑا ہے۔ جہاز اب تک ایک فاضل فیول پمپ سے منسلک ہے اور کیموفلاج یونی فارم میں ملبوس الرٹ کمانڈو ابھی تک اُس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ جہاز سطحِ زمین سے ذرا سے اُٹھے ہوئے سرمئی ڈھانچے کے ساتھ ساحل پر آ جانے والی کسی وھیل مچھلی کی طرح لگتا ہے، جو یہ سوچ رہی ہو کہ کیسے خود کو ایک بار پھر سمندر میں لے جائے، اور جس کی ناک اپنے پیشِ نظر کام کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہو۔

رن وے بحیرۂ عرب سے چھ سو میل دور بہاول پور کے صحرا کے وسط میں ہے۔ سورج کے سفید غضب اور چمکتی ہوئی ریت کی نہ ختم ہونے والی وسعت کے درمیان، سوائے خاکی وردی میں ملبوس جہاز کی جانب چلتے ہوئے ایک درجن آدمیوں کے، کچھ بھی موجود نہیں۔

ایک ذرا سے وقت کے لیے آپ کِلپ میں جنرل ضیا کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں، ایسا

شخص جس کی بہت زیادہ تصویریں اُتاری جا چکیں، اس کی آخری ریکارڈ شدہ یاد۔ اس کے بالوں کے بیچ کی مانگ سورج کی روشنی میں تمتماتی ہے، اس کے غیر فطری طور پر سفید دانت چمکتے ہیں، اس کی مونچھ کیمرے کے لیے اپنا چھوٹا سا روایتی رقص کرتی ہے، لیکن جب کیمرا اس کلِپ سے باہر نکل رہا ہوتا ہے تو آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ مُسکرا نہیں رہا۔ اگر آپ بہ غور دیکھیں تو غالباً آپ بتا دیں گے کہ وہ کسی بے اطمینانی میں مبتلا ہے۔ وہ کسی قبض میں مبتلا شخص کی سی چال چل رہا ہے۔

اس کے دائیں جانب جو آدمی چل رہا ہے وہ پاکستان کے لیے امریکی سفیر آرنلڈ رافیل ہے، جس کا چمک دار گنجا سر اور احتیاط سے پالی پوسی ہوئی مونچھ اسے امریکا کے کسی چھوٹے سے قصبے کے کسی قابلِ احترام ہم جنس پرست بزنس مین کی طرح پیش کرتی ہے۔ اسے اپنے نیوی بلیو کوٹ کی آستین سے ایک نظر نہ آنے والے ریت کے ذرّے کو جھاڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا سمارٹ غیر رسمی انداز، ایک برتر سفارتی دماغ کو چھپائے ہوئے ہے؛ وہ تیکھے اور کاٹ دار میمو لکھتا ہے اور اسے مخاصم ترین بات چیت کے دوران بھی نرمی سے بات کرنے کا گُر آتا ہے۔ جنرل ضیا کے بائیں جانب اس کا سابق سپائی ماسٹر اور انٹر سروسز انٹیلی جینس کا سربراہ جنرل اختر لگتا ہے کہ اپنے سینے پر لگے نصف درجن کے قریب میڈلوں کے بوجھ سے دُہرا ہوا جا رہا ہے اور اپنے پیر ایسے گھسیٹ رہا ہے جیسے اُس گروہ میں وہ واحد آدمی ہو جو یہ جانتا ہو کہ اسے اس جہاز پر سوار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ہونٹ پتلے ہیں، اور اگرچہ سورج کی تپش نے ہر چیز کو اُبال کر سپر انداز کر دیا ہے اور اردگرد کا ہر رنگ اڑا دیا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی عام طور پر مرجھائی ہوئی رنگت والی جلد گیلی اور پیلی ہو چکی ہے۔ اگلے روز کے اخبار میں اس کے یاد نامے میں اسے ایک خاموش مجاہد کے نام سے اور ان دس آدمیوں میں سے ایک بیان کیا جائے گا جو آزاد دنیا اور سرخ فوج کے درمیان کھڑے ہو گئے تھے۔

جب وہ پاک ون کی سیڑھیوں کو جاتے سرخ قالین تک پہنچتے ہیں تو آپ مجھے قدم

آگے بڑھاتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ آپ مجھے دیکھتے ہی جان جائیں گے کہ فریم میں صرف میں ہوں جو مُسکرا رہا ہوں، لیکن جب میں سلیوٹ کرتا ہوں اور جہاز کی جانب چلنا شروع کرتا ہوں تو میری مُسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں مُردوں کے ایک گروہ کو سلیوٹ کر رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ وردی میں ہیں تو آپ کو سلیوٹ کرنا ہوتا ہے۔ بات بس اتنی ہی سی تو ہے۔

بعد میں لاک ہیڈ کے فورنزک ماہرین گر کر تباہ ہو جانے والے جہاز کے ٹکڑے جوڑیں گے اور مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس اسرار کا قُفل کھولنے کی کوشش کریں گے کہ ایک سپر فٹ سی ون تھرٹی جہاز ٹیک آف کے صرف چار منٹ بعد کیسے آسمانوں سے لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ ستارہ شناس اگست اُنیس سو اٹھاسی کے لیے اپنی پیشین گوئیوں پر مشتمل فائلیں نکالیں گے اور طیارے کی جس تباہی نے پاکستان کی اعلا سطح کی فوجی قیادت اور امریکی سفیر کو ہلاک کر دیا اس کا ذمّے دار سیارہ مشتری کو قرار دیں گے۔ بائیں بازو کے دانش ور ایک ظالمانہ آمریت کے خاتمے پر ایک دوسرے کا جامِ صحت تجویز کریں گے اور ان معاملات میں تاریخی جدلیات کی باز خوانی کریں گے۔

لیکن آج سہ پہر تاریخ ایک طویل قیلولے میں مصروف ہے، جیسا کہ وہ ہمیشہ ایک جنگ کے اختتام اور دوسری جنگ کی شروعات کے درمیان عموماً ہوا کرتی ہے۔ ایک لاکھ سے زائد سوویت سپاہی، فوج سے ملنے والی بوٹ پالش سے لتھڑے ہوئے ٹوسٹ کھانے پر مجبور ہو چکنے کے بعد اب افغانستان سے پسپائی کی تیاری کر رہے ہیں؛ اور یہ لوگ جنھیں ہم ٹی وی کلِپ میں دیکھ رہے ہیں وہ غیر متنازعہ فاتحین ہیں۔ وہ امن کی تیاری کر رہے ہیں اور چوں کہ وہ بہت محتاط واقع ہوئے ہیں، اس لیے وہ سرد جنگ کے اختتام کا انتظار کرنے کے دوران ٹینکوں کی شاپنگ کے لیے بہاول پور آئے ہیں۔ انھوں نے اپنا دن کا کام مکمل کیا اور اب جہاز لے کر واپس گھر جا رہے ہیں۔ اپنے بھرے ہوئے پیٹوں کے ساتھ ان کے پاس چھوٹی موٹی بات چیت کے لیے کچھ خاص نہیں بچا؛ ان میں ان نرم خو

لوگوں جیسی بے صبری پائی جاتی ہے جو ایک دوسرے کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ یہ تو بہت بعد میں ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ ذرا یہ کلپ تو دیکھو، ذرا دیکھو کیسے تھکے تھکے قدموں سے اور ہچکچاتے ہوئے جا رہے ہیں یہ، انھیں دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ موت کا دکھائی نہ دینے والا ہاتھ انھیں طیارے کی جانب ہانک رہا ہے۔

جرنیلوں کے اہلِ خانہ کو مکمل زرِ تلافی ملے گا اور انھیں پرچموں میں لپٹے ہوئے تابوت ان سخت ہدایات کے ساتھ موصول ہوں گے کہ اُنھیں کھولا نہ جائے۔ ہوا بازوں کے اہلِ خانہ کو اُٹھا لیا جائے گا اور کچھ روز کے لیے خون آلود چھتوں والے تہہ خانوں میں پھینک کر بعد میں چھوڑ دیا جائے گا۔ امریکی سفیر کا جسدِ خاکی آرلنگٹن قبرستان لے جایا جائے گا اور اس کی قبر کے سنگی کتبے کو کسی چلے ہوئے نیم چست فقرے سے سجایا جائے گا۔ کسی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوگا، کوئی کھوج راستہ نہ دے گی، تفتیش کے راستے میں رکاوٹیں آجائیں گی، اور کور اپ کو کور کرنے کے لیے بہت سے کور اپ کیے جائیں گے۔ تیسری دنیا کے آمر تو ہمیشہ سے عجیب و غریب حالات میں پھٹتے رہے ہیں، لیکن اگر امریکا کی سفارتی سروس کا درخشندہ ترین ستارہ (آرلنگٹن قبرستان میں آرنلڈ رافیل کے جنازے کی تقریب میں اُس کے بارے میں یہی کہا گیا تھا) آٹھ پاکستانی جرنیلوں کے ساتھ زمین پر آ رہتا ہے تو کسی نہ کسی کا دھڑن تختہ ہونے کی تو توقع کی ہی جا سکتی ہے۔ جریدہ وینٹی فیئر ایک تفتیشی رپورٹ لکھوائے گا، نیو یارک ٹائمز دو اداریے تحریر کرے گا، مرنے والوں کے بیٹے عدالت میں درخواستیں دائر کریں گے اور پھر کابینہ کے پُرکشش مناصب پر صابر و شاکر ہو جائیں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ پچھلے سب سے بڑے کور اپ کے بعد یہ ہوابازی کی تاریخ کا سب سے بڑا کور اپ ہے۔

ٹی وی پر دکھائی جانے والی اُس چہل قدمی کے واحد گواہ کو، اس واحد شخص کو جس نے واقعی میں وہ چہل قدمی کی تھی، مکمل طور پر نظرانداز کر دیا جائے گا۔

کیوں کہ اگر آپ نے وہ کلپ نہیں دیکھا تو آپ نے غالباً مجھے بھی نہیں دیکھا۔

تاریخ کی طرح۔ میں ہی وہ شخص تھا جو بچ رہا۔

جہاز کے ملبے سے انھیں جو کچھ ملا اُس میں جسم شامل نہیں تھے، نہ ہی شہیدوں کے باوقار چہرے، جیسا کہ فوج نے دعویٰ کیا، نہ ہی وہ اشخاص جن کے جسموں کو ذرا سا نقصان پہنچا ہو اور جن کے چہروں کی ہیئت تبدیل ہو گئی ہو اور وہ اب ٹی وی کیمروں یا ان کے اپنے خاندانوں کو دکھائے جانے کے قابل نہ رہ گئے ہوں۔ باقیات۔ انھیں باقیات ملی تھیں۔ گوشت پوست کے ٹکڑے جن کے چھینٹے جہاز کے ٹوٹے پھوٹے حصوں پر لگے ہوئے تھے، جلی ہوئی ہڈیاں جو پگھلی ہوئی دھات سے چپکی ہوئی تھیں، جدا ہو چکے اعضا اور چہرے جو پگھل کر گلابی گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آرلنگٹن قبرستان میں جو تابوت دفن کیا گیا اس میں جنرل ضیا کی باقیات کے ٹکڑے موجود نہیں تھے اور جو اسلام آباد میں شاہ فیصل مسجد میں دفن ہے اس میں امریکی محکمۂ خارجہ کے درخشندہ ترین ستارے کے کچھ باقیات شامل نہیں تھے۔ واحد بات جو یقین سے کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ ان دونوں تابوتوں میں میرے باقیات موجود نہیں تھے۔

جی، سر، میں ہی وہ شخص تھا جو بچ رہا۔

شگری کا نام کسی تفتیش کے ضوابطِ کار کا تعیّن کرتے وقت سامنے نہیں آیا، ایف بی آئی کے تفتیش کاروں نے مجھے نظرانداز کیا اور مجھے کسی بلب کے نیچے بیٹھ کر وہ حالات بیان نہیں کرنے پڑے جو حادثے کے مقام پر میری موجودگی کا سبب بنے۔ میرا نام تو ان کہانیوں میں بھی نہیں آیا جو سچ کو چھپانے کے لیے گھڑی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ سازشی تھیوریاں جنھوں نے صدارتی طیارے سے ایک شناخت نہ کی جا سکنے والی اُڑتی ہوئی شے آ کر لگتے دیکھی، یا وہ مخبوط الحواس گواہ جنھوں نے ایک اکیلے گدھے کی پیٹھ سے زمین سے فضا میں مار کرنے والا میزائل چلتا ہوا دیکھا، وردی میں ملبوس اُس لڑکے کے بارے میں کوئی کہانی بُننے میں ناکام رہے جس کا ایک ہاتھ اُس کی تلوار کے دستے پر تھا، جس کے قدم آگے بڑھے تھے، جس نے سلیوٹ کیا تھا اور پھر مُسکرا کر چل دیا تھا۔ میں وہ واحد شخص تھا

جو اُس جہاز میں سوار ہوا لیکن پھر بھی بچ رہا۔

حتیٰ کہ مجھے اپنے گھر واپسی کے لیے لفٹ بھی مل گئی۔

اگر آپ نے وہ کلِپ دیکھا ہے تو شاید آپ نے حیرت سے سوچا ہو کہ پہاڑی ناک نقشے والا یہ لڑکا اس صحرا میں کر کیا رہا ہے، اور چار ستارہ جرنیل اسے کیوں گھیرے ہوئے ہیں، وہ مُسکرا کیوں رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ میں اپنی سزا بھگت چکا ہوں۔ جیسا کہ عُبید نے کہا ہے کہ سزا بھگت لینے کے بعد جرم کا ارتکاب کرنا تو شاعری ہے۔ مجھے شاعری میں زیادہ دلچسپی نہیں، لیکن جرم سے قبل سزا میں کوئی شاعرانہ بات تو ہے ہی۔ مجرم جرم کرتے ہیں، معصوم سزا پاتے ہیں۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ ایسی ہی ہے۔

میری سزا طیارے کے حادثے سے ٹھیک دو ماہ سترہ روز پہلے اس روز شروع ہوئی تھی جب میں صبح بیدار ہوا تھا اور میں نے، چار سال تک عُبید کے ساتھ کمرے کی ساجھے داری کے دوران پختہ کی جانے والی عادت کے تحت، اپنی آنکھیں کھولے بغیر عُبید کا کمبل اُتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ اسے اُٹھانے کا یہی واحد طریقہ تھا۔ میرے ہاتھوں نے ایک خالی بستر کو چُھوا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ بستر ابھی ابھی آراستہ کیا گیا تھا اور وہاں ایک سرمئی اونی کمبل کے اوپر ایک کڑک سفید چادر ایسے بچھی تھی جیسے کوئی ہندو بیوہ سوگ منا رہی ہو۔ عُبید غائب تھا اور وہ حرامی ظاہر ہے کہ مجھی پر شک کرنے والے تھے۔

آپ ہمارے وردی پوشوں کو کوئی بھی الزام دے سکتے ہیں، لیکن آپ انھیں تخیل کی پرواز کے لیے الزام کبھی نہیں دے سکتے۔

فارم پی ڈی ۲۰۵۹

بلا اطلاع چھٹّی یا کوئی مسلمہ وجہ بتائے بغیر غائب ہو جانے سے متعلّق ریکارڈ

ضمیمہ ایک

جونیئر انڈر آفیسر علی شگری، پاک نمبر ۸۹۸۲۴۵، کا بیان

موضوع: کیڈٹ عُبید اللہ کی بلا اطلاع چھٹّی کے حالات سے متعلّق تفتیشی بیان ریکارڈ کیے جانے کا مقام: سیل نمبر ۲، مین گارڈ روم، کیڈٹس میس، پی اے ایف اکیڈمی

میں، جونیئر انڈر آفیسر علی شگری، ولد مرحوم کرنل قلی شگری، یہاں حلفیہ قبول اور بیان کرتا ہوں کہ اکتیس مئی ۱۹۸۸ء کی صبح ریویل میں ڈیوٹی افسر میں تھا۔ میں ٹھیک صبح ساڑھے چھ بجے فیوری اسکواڈرن کی انسپکشن کے لیے پہنچا۔ جب میں دوسری قطار کی انسپکشن کر رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ میری تلوار کی بیلٹ ڈھیلی ہے۔ میں نے اسے ٹائٹ کرنے کی کوشش کی۔ بیلٹ میرے ہاتھوں میں آ رہی۔ میں اسے بدلنے کے لیے بیرکوں کی جانب دوڑا اور کیڈٹ عتیق کو چلّا کر کہا کہ وہ چارج سنبھال لے۔ میں نے اسکواڈرن کو حکم دیا کہ وہ مارک ٹائم کرے۔ مجھے اپنی فاضل بیلٹ اپنی الماری میں نہیں ملی۔ میں نے دیکھا کہ کیڈٹ عُبید کی الماری کھلی ہوئی تھی۔ اس کی بیلٹ وہیں پڑی تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، یعنی پہلے شیلف پر، دائیں ہاتھ کے کونے میں، اس کی سنہری کناروں والی پی کیپ کے پیچھے۔ کیوں کہ میں جلدی میں تھا اس لیے میں نے الماری میں کوئی غیر قانونی چیز نوٹ نہیں کی۔ تاہم میں نے بہ ضرور نوٹ کیا کہ

اس کی الماری کے دروازے پر اندر کی جانب لگی ہوئی نظم غائب تھی۔ مجھے شاعری میں زیادہ دلچسپی نہیں لیکن چوں کہ عُبید ڈورم میں میرا ساتھی تھا، اس لیے میں جانتا تھا کہ ہر مہینے وہ اپنی الماری میں ایک نئی نظم چسپاں کرنا پسند کرتا تھا، لیکن الماری کی ہفتہ وار انسپکشن سے پہلے اسے ہٹا دیا کرتا تھا۔ چوں کہ اکیڈمی کے قواعد و ضوابط میں ڈورم کی الماریوں میں شاعری چسپاں کرنے سے مُتعلّق کوئی ذکر نہیں، اس لیے میں نے یہ معاملہ پہلے رپورٹ نہیں کیا۔

میں چھ بج کر تینتالیس منٹ پر واپس آیا تو میں نے تمام اسکواڈرن کو انڈین پوزیشن میں دیکھا۔ میں نے انہیں فی الفور کھڑا ہونے کو کہا اور کیڈٹ عتیق کو یاد دلایا کہ کسی کو انڈین پوزیشن کی سزا دینا غیر قانونی ہے اور قائم مقام اسکواڈرن کمانڈر کی حیثیت سے اسے قوانین کا علم ہونا چاہیے تھا۔ بعد میں میں نے کیڈٹ عتیق کے لیے ایک سرخ پٹی کی سفارش کی، اس سفارش کی نقل اس ضمیمے کے ساتھ لگائے جانے والے ضمیمے میں فراہم کی جا سکتی ہے۔

اُس موقع پر میرے پاس رول کال کا وقت نہیں تھا، کیوں کہ ہمارے پاس پریڈ گراؤنڈ پر پہنچ کر رپورٹ کرنے کے لیے صرف سترہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ فیوری اسکواڈرن کو میس ہال کی جانب مارچ کرتے ہوئے لے جانے کے بجائے میں نے انہیں ڈبل مارچ کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ میں نے اس روز کی سائلنٹ ڈرل کی مشق کے لیے تلوار پہن رکھی تھی اور مجھے ڈبل مارچ نہیں کرنا تھا، لیکن میں تلوار کو اپنے جسم سے چھ انچ دور رکھے آخری قطار کے ساتھ بھاگتا رہا۔ سیکنڈ آفیسر ان کمانڈ نے ہمیں اپنے باماہا پر سے دیکھا اور ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اُس کی رفتار سست کر دی۔ میں نے اپنے اسکواڈرن کو سلیوٹ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن سیکنڈ او آئی سی نے میرے سلیوٹ کا جواب نہیں دیا اور میری تلوار اور دو ٹانگوں سے مُتعلّق ایک فقرہ کسا۔ وہ فقرہ اس بیان میں دُہرایا نہیں جا سکتا، لیکن میں نے یہ حقیقت اس لیے بیان کر دی کیوں کہ اسکواڈرن میں میری موجودگی پر بھی

تفتیش کے دوران شبہ کیا گیا تھا۔

میں نے فیوری اسکواڈرن کو ناشتے کے لیے چار منٹ دیے اور میں خود ڈائننگ ہال کو جانے والی سیڑھیوں پر انتظار کرنے لگا۔ اُس وقت میں آسان باش پوزیشن میں تھا اور میرے دماغ میں اُس روز کی ڈرل کی کمانڈ چل رہی تھیں۔ یہ وہ مشق ہے جو مجھے ڈرل انسٹرکٹر آن سیکنڈمنٹ لیفٹیننٹ بینن نے سکھائی ہے۔ اگرچہ سائلنٹ ڈرل میں کوئی زبانی کمانڈ نہیں ہوتی، کمانڈر کی اندرونی آواز پانچ درجے کی قوّت کی حامل ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز اُس کے ساتھ کھڑے شخص کے لیے قابلِ سماعت نہیں ہونی چاہیے۔ میں ابھی اپنی سائلنٹ آواز ہی کی مشق کر رہا تھا کہ اسکواڈرن نے ڈائننگ ہال کے باہر جمع ہونا شروع کر دیا۔ میں نے اسکواڈرن کی ایک بہ سرعت انسپکشن کی اور فرسٹ ٹرم کے ایک لڑکے کی وردی والی شرٹ کی جیب میں فرنچ ٹوسٹ کا ایک سلائس دیکھا۔ میں نے ٹوسٹ اُس کے مُنھ میں ٹھونس دیا اور اسے فرنٹ رولنگ کرتے ہوئے اسکواڈرن کے ساتھ ہم رفتار رہنے کا حکم دیا اور خود اسکواڈرن کو مارچ کراتا ہوا پریڈ اسکوائر لے گیا۔

میں نے کمانڈ سارجنٹ آف دی ڈے کے حوالے کی جو لڑکوں کو مارچ کراتا ہوا اسلحہ خانے لے گیا تاکہ وہ وہاں سے اپنی رائفلیں حاصل کر لیں۔ قرآن کی تلاوت اور قومی ترانہ ختم ہونے کے بعد، جب سائلنٹ ڈرل اسکواڈ دو فارمیشنوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا، تب کہیں جا کر سارجنٹ آف دی ڈے میرے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا کہ کیڈٹ عُبید نے ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کیوں نہیں کی۔ اسے تو اس روز کی ڈرل ریہرسل میں اپنی قطار کا لیڈر ہونا تھا۔ میں حیران رہ گیا کیوں کہ میں تو تمام وقت اس خیال میں تھا کہ وہ اُسی اسکواڈرن میں تھا جس کی کمان میں نے سارجنٹ کے حوالے کی تھی۔

'کیا وہ بیمار ہے؟' اس نے مجھ سے پوچھا۔

'نہیں، سارجنٹ' میں نے کہا۔ 'اور اگر وہ ہے بھی تو مجھے اس بارے میں

معلوم نہیں۔'

'اور پتا کس کو ہونا چاہیے؟'

میں نے اپنے کاندھے اُچکائے اور اس سے پہلے کہ سارجنٹ کچھ کہہ پاتا لیفٹیننٹ ہینن نے اعلان کیا کہ سائلنٹ زون موثر ہو چکا ہے۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ ہماری اکیڈمی کے زیادہ تر ڈرل سارجنٹ ہمارے اپنے سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کے قیام کے لیے لیفٹیننٹ ہینن کی کوششوں کی تحسین نہیں کرتے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ سویلینز کو سائلنٹ ڈرل کے مظاہرے سے زیادہ کوئی چیز متاثر نہیں کرتی اور ہمیں لیفٹیننٹ ہینن کے فورٹ بریگ کے چیف ڈرل انسٹرکٹر ہونے کے تجربے سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈرل کے بعد میں یہ دیکھنے کے لیے سِک بے گیا کہ کیڈٹ عُبید نے خود کو بیمار رپورٹ کیا ہے یا نہیں۔ وہ مجھے وہاں نہیں ملا۔ جب میں سِک بے سے واپس آرہا تھا تو میں نے اپنے اسکواڈرن کے فرسٹ ٹرم والے لڑکے کو ویٹنگ ایریا میں دیکھا۔ اس کی وردی والی شرٹ کے سامنے کے حصے پر توسٹ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے جن کی اس نے قے کر دی تھی۔ وہ مجھے سلیوٹ کرنے کے لیے کھڑا ہوا، میں نے اس سے کہا کہ وہ بیٹھا رہے اور اپنی مزید تحقیر سے باز رہے۔

چوں کہ کردار کی تعمیر سے مُتعلّق لیکچر پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، اس لیے میں کلاس روم جانے کے بجائے اپنے ڈورم میں واپس آگیا۔ میں نے اپنے واشر مین انکل سنارچی کو اپنی بیلٹ ٹھیک کرنے کو کہا، اور میں نے کچھ دیر اپنے بستر پر آرام کیا۔ میں نے عُبید کا بستر، اس کے بستر کے ساتھ کی میز اور اس کی الماری کی بھی تلاشی لی تاکہ مجھے اس بارے میں کوئی نشانی مل سکے کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ میں نے ان تمام مقامات پر کوئی ایسی ویسی چیز نہیں دیکھی۔ کیڈٹ عُبید اسکواڈرن میں الماری ترتیب سے رکھنے کا مقابلہ اپنی فرسٹ ٹرم کے وقت سے جیتتا آرہا تھا اور اُس کی الماری میں ہر چیز الماری کے مینوئل کے مطابق تھی۔

میں نے اس روز کی باقی تمام کلاسیں اٹینڈ کیں۔ مجھے ان کلاسوں میں حاضر شمار کیا گیا۔ ریجنل اسٹڈیز کی کلاس میں ہمیں تاجکستان اور اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے بارے میں پڑھایا گیا۔ اسلامک اسٹڈیز میں ہمیں خود سے مطالعے کا حکم دیا گیا کیوں کہ ہمارے استاد مولانا ہدایت اللہ کو ہم پر اس لیے غصّہ تھا کہ جب وہ کلاس میں داخل ہوئے تھے تو کچھ کیڈٹ شادی کے ایک لوک گیت کی فحش پیروڈی گا رہے تھے۔

سہ پہر کی ڈرل ریہرسل کے دوران کہیں جا کر سیکنڈ او آئی سی کے دفتر میں میری طلبی ہوئی۔ مجھے ڈبل مارچ کرتے ہوئے رپورٹ کرنے کا حکم ملا اور میں نے وہاں وردی میں رپورٹ کی۔

سیکنڈ او آئی سی نے مجھ سے پوچھا کہ جب کیڈٹ عُبید صبح کی انسپکشن میں موجود نہیں تھا تو میں نے اسے غیر حاضر شمار کیوں نہیں کیا۔

میں نے انہیں جواب دیا کہ میں نے رول کال لی ہی نہیں تھی۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ سِک بے سے واپسی اور کردار کی تعمیر سے مُتعلّق لیکچر کے درمیان میں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں نے انہیں حقیقت بتا دی۔

انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں گارڈ روم میں رپورٹ کروں۔

جب میں گارڈ روم پہنچا تو گارڈ روم کے ڈیوٹی کیڈٹ نے مجھے سیل میں انتظار کرنے کو کہا۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں حراست میں ہوں تو اس نے سیل کے گدّے میں پہلے سے ہی بہت سے سوراخ موجود ہونے سے مُتعلّق ایک فقرہ کسا۔ وہ فقرہ اس بیان میں دُہرایا نہیں جا سکتا۔

آدھے گھنٹے بعد سیکنڈ او آئی سی آئے اور مجھے بتایا کہ میں حراست میں ہوں اور وہ کیڈٹ عُبید کے غائب ہونے سے مُتعلّق مجھ سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے انہیں سچ نہ بتایا تو وہ مجھے انٹر سروسز انٹیلی جینس کے حوالے کردیں گے جو مجھے میرے خصیوں سے باندھ کر لٹکا دیں گے۔

میں نے انہیں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ سیکنڈ او آئی سی نے مجھ سے ایک گھنٹا اور چالیس منٹ تک عُبید کی سرگرمیوں، میری اس سے دوستی اور اس بارے میں سوالات کیے کہ کیا میں نے ان کے بیان کے مطابق اُس کے غائب ہوجانے سے پہلے کے کچھ دنوں میں اُس کے روّیے میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی دیکھی تھی۔

میں جو کچھ جانتا تھا، انہیں بتا دیا۔ سوال جواب کے سیشن کے بعد وہ سیل سے باہر چلے گئے اور پانچ منٹ بعد کچھ کاغذات اور ایک پین کے ساتھ واپس آئے اور مجھ سے کہا کہ جو کچھ صبح پیش آیا تھا اسے لکھ ڈالوں اور تفصیل سے بتاؤں کہ میں نے عُبید کو آخری مرتبہ کہاں اور کب دیکھا تھا۔

سیل سے جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے ذہن میں کوئی سوال ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں سائلنٹ ڈرل ریہرسل کرسکوں گا، کیوں کہ ہم صدر کی سالانہ انسپکشن کے لیے تیاری کررہے تھے۔ میں نے سیکنڈ او آئی سی سے درخواست کی کہ وہ لیفٹیننٹ بینن کو یہ بتا دیں کہ میں اپنی سائلنٹ آواز کی مشق سیل میں بھی جاری رکھ سکتا ہوں۔ سیکنڈ او آئی سی نے فورٹ بریگ کے غسل خانے میں دو امریکی میرین سپاہیوں اور ایک صابن کے بارے میں ایک فقرہ کسا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ مجھے ہنسنا چاہیے اور میں ہنسا بھی نہیں۔

میں یہاں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے کیڈٹ عُبید کو غائب ہونے سے پہلے آخری مرتبہ اپنے بستر میں لیٹے انگریزی شاعری کی ایک کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا۔ کتاب کی جلد سرخ تھی اور اس پر لگتا تھا کہ کسی آدمی کا لمبا سا سایہ

سا بنا ہوا تھا۔ مجھے کتاب کا نام یاد نہیں۔ روشنیاں بجھانے جانے کے بعد میں نے اُسے دھیمی آواز میں ایک پرانا انڈین گانا گنگناتے ہوئے سنا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا مُنہ بند کرلے۔ نیند آجانے سے پہلے مجھے آخری بات بس یہ یاد ہے کہ وہ تب تک وہی گانا گنگنا رہا تھا۔

میں نے صبح اسے نہیں دیکھا اور میں نے اُس روز کی اپنی تمام سرگرمیاں زیر دستخطی کی موجودگی میں اپنے اس بیان میں ریکارڈ کرا دی ہیں۔

آخر میں مَیں یہ کہنا چاہوں گا کہ عُبید کی جانب سے خود کو بغیر بتائے غیر حاضر کر دیے جانے سے پہلے والے دنوں میں مَیں نے اُس کے روّیے میں کوئی غیر معمولی چیز نوٹ نہیں کی۔ چُھٹّی کے بغیر غیر حاضری سے تین روز پہلے اس نے ڈنر کے بعد کی ادبی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لینے پر چوتھی مرتبہ گرین سٹرپ حاصل کی تھی۔ اس نے ہفتہ وار چُھٹّی پر مجھے آئس کریم کھلانے اور فلم 'ویئر ایگلز ڈیئر' دکھانے لے جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر اس نے کوئی وجہ بتائے بغیر خود کو غیر حاضر کر دینے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا تو اس نے اس بارے میں مجھے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اور کسی کو بھی کبھی کچھ نہیں بتایا۔

میں بڑی عاجزی کے ساتھ یہ درخواست کرنے کی بھی خواہش کروں گا کہ میری حراست غیر ضروری ہے اور اگر مجھے میرے ڈورم تک جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، تب بھی مجھے اپنے سائلنٹ ڈرل اسکواڈرن کی کمان اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی جائے، کیوں کہ کل کی جنگیں آج کی پریڈ سے ہی جیتی جاتی ہیں۔

دستخط گواہ برائے بیان
اسکواڈرن لیڈر کریم اللہ
سیکنڈ او آئی سی، پی اے ایف اکیڈمی

زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر۔۔۔

۱

پتہ نہیں اِن حرامی اسکواڈرن لیڈروں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ آپ کو ایک بِتہ خانے میں بند کر دیں، اپنے بدبودار منہ آپ کے کان سے لگا دیں اور آپ کی ماں کے بارے میں چلا کر کچھ فرمائیں تو انھیں ہر جواب مل سکتا ہے۔ یہ لوگ عموی طور پر ایک اداس قسم کی نسل ہوتے ہیں، وہ لیڈر جن کے پاس قیادت کے لیے کوئی اسکواڈرن نہیں ہوتا۔ یہ ان کی اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی کمی ہوتی ہے جس کے سبب وہ اپنے کیرئیر کے وسط میں ٹھہرے رہ جاتے ہیں، اور ان کے پاس ایک تربیتی ادارے سے دوسرے تربیتی ادارے کو جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ آپ انھیں ان کی ڈھیلی اور نیچے لٹکی ہوئی بیلٹوں سے پہچان سکتے ہیں جو اِن کی گوگڑوں کے وزن تلے پسی جا رہی ہوتی ہیں۔ یا پھر ان کی ٹوپیوں سے جنھیں وہ بہت احتیاط سے سر پر ٹکاتے ہیں، تا کہ ان کا چمک دار گنج چھپ سکے۔ ان کے ہاں پارٹ ٹائم ایم بی اے کرنے اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے کی آرزو نہ ہو سکنے والی ترقیوں اور پنشن پلان کے ساتھ ہم قدم رہنے کی جستجو کرتی رہتی ہے۔

ذرا مجھ پر ستم ڈھانے والے کے سینے پر اس کی وردی والی شرٹ کی بائیں جیب سے اوپر فروٹ سلاد کی ترتیب ملاحظہ کریں تو آپ اس کی ساری سرگزشت پڑھ لیں گے۔ ایک چھاتا بردار کا ننھا منا سا میڈل لینے کے لیے اُسے بیرک سے ضرور نکلنا پڑا۔ میڈلوں

میں سے پہلی قطار والے میڈل تو بس آئے اور اس کے سینے سے چپک کر رہ گئے۔ وہ اُسے اس لیے مل گئے کیوں کہ وہ ان دنوں حاضر سروس تھا۔ آزادی کی چالیسویں سال گرہ کا میڈل۔ اسکواڈرن کی سال گرہ کا میڈل۔ آج میں نے مشت زنی نہیں کی کا میڈل۔ پھر دوسری قطار ہے جس میں اس کی اپنی سخت محنت اور لیڈرشپ کا پھل موجود ہے۔ ایک میڈل اسکواش ٹورنامنٹ کرانے کے لیے، ایک اور میڈل اس جنگ کے لیے جو درحقیقت ہفتہ شجرکاری تھی۔ یہ لیڈر جس نے اپنا مُنھ میرے کان سے لگا رکھا ہے اور جس کے ذہن پر میری ماں سوار ہے، مکہ میں مفتا لگا چکا ہے اور اس نے ایک حج میڈل بھی سجا رکھا ہے۔

جیسا کہ عُبید کہا کرتا تھا، 'اللہ کی شان ہے۔ ہر بندر کے لیے حور و غلمان ہے۔'

سینئر او آئی سی اپنی بدبودار سانسوں اور متواتر چیخ پکار سے مجھے توڑنے کی کوشش کر کے اپنی پہلے ہی سے برباد شدہ زندگی کو مزید برباد کر رہا ہے۔ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ میرے کان میں جو گوبر گھسیڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس میں سے کچھ میں نے ہی گھڑا تھا؟ کیا اسے نہیں معلوم کہ شگری خود کیا کر سکتا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ مجھے تو آدھی رات کے وقت دوسرے اسکواڈرن سے بلاوے آتے تھے کہ نئے آنے والوں کی ماؤں کے بارے میں اپنے تین منٹ کے خطاب سے انھیں رونے پر مجبور کر دوں۔ کیا وہ واقعی سمجھتا ہے کہ اگر پانچ کی قوت سے بھی ماں کی گالی دی جائے تو اس آدمی کے لیے اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں جو صدر کی سالانہ انسپکشن سے اور ایک کمیشنڈ افسر بننے سے بس کچھ ہی ہفتے دور ہو۔

تھیوری بہت ہی سادہ سی تھی: ہر اچھا سپاہی ایسی آوازوں کو بند اور ایسے اظہارات کو ان کے سامنے کے معنی سے جدا کرنا سیکھ لیتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب وہ آپ کی ماں سے مُتعلق وہ والی بات کہتے ہیں، تو اُن کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اور مجھے یقین ہے کہ خواہش بھی نہیں ہوتی، کہ وہ آپ کی ماں کے ساتھ وہ کچھ کریں جسے کرنے کی

خواہش کا وہ اظہار کرتے ہیں۔ وہ یہ گالی اس لیے دیتے ہیں کیوں کہ یہ تیز آگ کی طرح مُنھ سے نکلتی ہے اور سننے میں اچھی لگتی ہے اور اس میں تخیل سے کوئی کام نہیں لینا پڑتا۔ گالی میں سے 'ماں' کا لفظ، جو آپ کے کان سے چپکے ہوئے ان کے ہونٹوں سے نکلتا ہے، کچھ دیر آپ کے دماغ میں گھومتا ہے۔ اور بس اتنی سی بات تو ہے۔ انھوں نے تو آپ کی بے چاری ماں کو دیکھا بھی نہیں ہوتا۔

جو ان گالیوں کی اونچی آواز سے ہی ٹوٹ جائے، اسے چاہیے کہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ہی بیٹھا رہے اور اپنے ابا کی بکریاں چَرایا کرے اور پھر اسے چاہیے کہ حیاتیات کی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بنے اور اپنی زندگی میں جتنا حرام کا چین اور سکون درکار ہے حاصل کرے۔ کیوں کہ ایک سپاہی کی حیثیت سے آواز ہی وہ پہلی چیز ہے جس کے خلاف دفاع کرنا آپ کو سیکھنا پڑتا ہے اور ایک افسر کی حیثیت سے آواز ہی وہ پہلا ہتھیار ہے جس سے آپ حملہ کرنا سیکھتے ہیں۔

لیکن اگر آپ سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کے سپاہی ہوں تو ایسا نہیں ہوتا۔

ذرا صبح کی ڈرل کے دوران پریڈ اسکوائر پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں اس میں کس کی حکم رانی ہے۔ کس کا حکم چلتا ہے یہاں؟ یہاں ہم میں سے ایک ہزار سے زائد لڑکے موجود ہیں، تیرہ کروڑ کی آبادی میں سے منتخب، جنھیں ایسے کڑے نفسیاتی اور جسمانی امتحان سے گزارا جاتا ہے جس میں سو درخواست دہندگان میں سے صرف ایک کام یاب ہوتا ہے، اور جب ہماری قوم کی یہ کریم، جیسا کہ ہمیں متواتر یاد دلایا جاتا ہے کہ ہم ہیں، یہاں پہنچتی ہے تو ان کی قیادت کون کرتا ہے؟ وہ جس کی آواز سب سے اونچی ہو، جس کا گلا سب سے صاف ہو، وہ جس کا سینہ پھیل کر ایسی کمانڈ دے سکے جو صبح نکلنے والے کوّوں کو حیران کر دے اور ضدی ترین کیڈٹوں کو اپنے گھٹنے کمر تک لانے پر مجبور کر دے اور جب وہ اپنی ایڑیاں کنکریٹ کے فرش پر ماریں تو پوری دنیا ساکت و صامت ہو جائے۔

کم از کم میں یہی سمجھتا تھا، اس سے پہلے کہ لیفٹیننٹ بینن اپنی اندرونی آواز،

سائلنٹ کمانڈ اور سب سونک ڈرل تکنیک سے مُتعلق تھیوریاں لیے آ پہنچا۔ 'کمانڈ کے ساتھ کی جانے والی ڈرل تو بس یہی ہوتی ہے، بس ایک ڈرل۔' بینن یہ کہنے کا بہت شوقین ہے۔ 'کمانڈ کے بغیر ڈرل ایک آرٹ ہے۔ جب آپ اپنی آواز کی اونچی ترین سطح سے کوئی کمانڈ دیتے ہیں تو آپ کی آواز صرف آپ کے اسکواڈرن کے لڑکے سنتے ہیں۔ لیکن جب آپ کی اندرونی آواز سرگوشی کرتی ہے، تو دیوتا بھی نوٹس لیتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ بینن کو کسی دیوتا پر یقین ہو۔

مجھے نہیں لگتا کہ وہ یہاں مجھ سے ملنے آئے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اسے اس سیل میں آنے دیں گے۔

سیکنڈ او آئی سی میری ماں کے ساتھ اپنی مصروفیت کے بعد تھک چکا ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ سمجھ داری سے کام لینے کی ایک التجا اُس کے اندر راہ بنا رہی ہے۔ میں آنے والی 'قوم کی کریم' والی تقریر کو روکنے کے لیے اپنے پیٹ کے عضلات جکڑ لیتا ہوں۔ میں اُلٹی نہیں کرنا چاہتا۔ سیل چھوٹا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس میں کتنا عرصہ رہنا پڑے گا۔

'تم ہماری قوم کی کریم ہو۔' وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔ 'تم ہماری اکیڈمی کا فخر رہے ہو۔ میں نے حال ہی میں تمھیں اعزازی تلوار دینے کی سفارش کی ہے۔ تم اسے صدرِ پاکستان سے وصول کرنے والے ہو۔ تمھارے پاس دو راستے ہیں: چار ہفتوں میں اعزاز کے ساتھ گریجویشن کرو یا پھر ڈھول کی آواز پر فرنٹ رولنگ کرتے ہوئے باہر نکل جاؤ۔ کل۔ تالیاں۔ ٹونی سنگھ اسٹائل۔' وہ کسی قوالی کے کورس میں بھارتی فلم کے کسی ایکسٹرا اداکار کی طرح اپنے ہاتھ دو مرتبہ آپس میں بجاتا ہے۔

انھوں نے ٹونی سنگھ کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ بے چارے بے وقوف کو ڈھول تاشوں کے ساتھ باہر نکال دیا۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ٹونی سنگھ آخر اسلامی جمہوریہ کی ائرفورس میں کر کیا رہا تھا۔ ٹونی سنگھ سے ملنے سے پہلے (بلکہ ہمیں تو اسے سر ٹونی کہنا

پڑتا تھا کیوں کہ وہ ہم سے چھ کورس سینئر تھا) واحد ٹونی جسے میں جانتا تھا وہ ہمارے پڑوسی کا کتا تھا اور واحد سنگھ جو میں نے دیکھا تھا وہ اپنی تاریخ کی نصابی کتاب میں دکھائی دینے والا ایک کانا مہاراجا تھا جس نے کچھ صدیاں پہلے پنجاب پر حکومت کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تقسیم نے سارے ٹونیوں اور سنگھوں کا بندوبست کر لیا ہوگا، لیکن بہ ظاہر کچھ کو خبر نہیں ہوئی تھی۔

ٹونی سنگھ کو اس وقت بھی خبر نہ ہوئی جب انھوں نے اس کے ڈورم میں ایک ٹرانزسٹر ریڈیو پایا اور اس پر جاسوسی کا الزام لگا دیا۔ سر ٹونی نے اپنے دفاع میں 'ٹاپ آف دا پاپس' سننے کا بہانا بنایا۔ انھوں نے اس پر لگایا جانے والا الزام کم کر کے 'غیر افسرانہ روّیہ' تک محدود کر دیا، لیکن اسے ڈھول تاشوں کے ساتھ نکال باہر کر کے ہی رہے۔

ایک اکیلا ڈھولچی، ایک کارپورل جو ساری زندگی اکیڈمی کا سب سے بڑا ڈھول اُٹھا اُٹھا کر اب خود بھی ڈھول جیسا ہی لگتا تھا، آگے آگے چلا؛ وہ تھڈ، تھڈ، تھڈا تھڈ کی مارچنگ دھن پر ڈھول بجاتا گیا۔ ہم لڑکوں میں سے ایک ہزار سے زائد اینگلو ایونیو کے دونوں طرف قطار بنائے کھڑے تھے جو گارڈ روم سے مین گیٹ تک جاتی ہے۔

آسان باش، کمانڈ سنائی دی۔

ٹونی سنگھ اِسی گارڈ روم میں چند راتیں گزارنے کے بعد باہر نکلا۔ اس کے سر پر اُسترا پھرا ہوا تھا، لیکن اس نے اپنی وردی ابھی تک پہن رکھی تھی۔ وہ سر اونچا کیے کھڑا تھا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا گوارا نہ کیا۔

تالیاں، کمانڈ سنائی دی۔

ہم نے آہستگی سے تالیاں بجانا شروع کیں۔ سیکنڈ او آئی سی نے ٹونی کی بیلٹ اتاری اور اس کے کاندھے پر سے رینک ہٹائے اور پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر سر ٹونی کے کان میں کچھ کہا۔ سر ٹونی اپنے گھٹنوں کے بل جھک گیا، اپنے دونوں ہاتھ سڑک پر رکھے اور اپنا گنجا کر دیا جانے والا سر زمین سے لگائے بغیر فرنٹ رول کر گیا۔

چوتیے کی گاف آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی تب بھی وہ ڈیڑھ ہشیار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس کا سفر تکلیف دہ حد تک ست رفتار تھا۔ ڈھول کی آواز کچھ دیر بعد ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ کچھ کیڈٹوں نے دوسروں سے زیادہ جوش و جذبے کے ساتھ تالیاں بجائیں۔

میں نے اپنے ایک طرف نگاہ دوڑائی اور عُبید کو اپنے آنسو روکنے کے لیے سخت کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔

'سر، میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے کچھ پتا نہیں کیڈٹ عُبید کہاں گیا ہے۔' میں لجلجانے اور اس کے مُنھ پر تھوک دینے کے درمیان ایک نظر نہ آتی ہوئی لکیر پر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

سیکنڈ او آئی سی گھر جانا چاہتا ہے۔ گھریلو تشدُّد اور بے واچ سیریز کے ساتھ ایک شام اُسے بلا رہی ہے۔ وہ میرا بیان میرے سامنے لہراتا ہے۔ 'تمھارے پاس یہ سب سوچنے کے لیے ایک رات ہے۔ کل یہ معاملہ کمانڈانٹ کے پاس چلا جائے گا اور اسے اپنے غائب ہو جانے والے لڑکوں سے زیادہ نفرت اگر کسی چیز سے ہے تو وہ ہے اُن غائب ہو جانے والوں کے ہشیاری کرنے والے ساتھیوں سے۔ وہ صدر کے دورے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہم سب اس دورے کے منتظر ہیں۔ اسے مت بُھولو۔

وہ جانے کے لیے مُڑتا ہے۔ میرے جسم کا بالائی حصّہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ وہ دروازے کے ہینڈل پر ایک ہاتھ رکھتا ہے اور واپس مُڑتا ہے؛ میرے جسم کا بالائی حصّہ ایک بار پھر ہوشیار پوزیشن پر آ جاتا ہے۔ 'میں نے ایک بار تمھارے والد کو دیکھا تھا۔ پکّا سپاہی تھا وہ۔ اور ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔' اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ اُبھرتی ہے۔ 'تم پہاڑی لڑکے اس لیے خوش قسمت ہو، کیوں کہ تمھارے چہرے پر بال نہیں

ہوتے۔'

میں اُسے سیلوٹ کرتا ہوں اور اس دوران اپنی اندرونی آواز دبانے کے لیے اپنی سائلنٹ ڈرل کی تمام تر مشق سے کام لیتا ہوں جو یہ کہہ رہی ہے، 'تیری بھی ماں کو یَبوں۔'

میں ایک لمحے کے لیے سوچتا ہوں کہ عُبید اس سیل میں کیا کرتا۔ پہلی چیز جو اسے اس سیل میں پریشان کرتی وہ سیکنڈ او آئی سی کی چھوڑی ہوئی بدبو ہوتی۔ یہ جلی ہوئی پیاز، گھر کی بنائی ہوئی اور بو چھوڑ جانے والی دہی جیسی بدبو۔ شک کی بو، ان چیزوں کی بو جو منصوبے کے مطابق انجام نہیں پا سکیں۔ اور ہمارا عُبید، ہمارا بے بی او سمجھتا ہے کہ کلائی پر پوائزن کا چھڑکاؤ کرنے اور ایک پرانا نغمہ سننے کے بعد دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے نمٹا نہ جا سکے۔

اس کی معصومیت ویسی ہی ہے جیسے کسی تنہائی پسند فاختہ کی معصومیت، جو ایک شاخ سے دوسری شاخ تک اُڑتی پھرتی ہیں اور ان کے پروں کی نازک پھڑپھڑاہٹ اور ان کا چند ملی لیٹر خون انھیں اُس زمین کی کششِ ثقل کے خلاف محوِ پرواز رکھتے ہیں جو ہر ایک کو اپنی گلتی سڑتی ہوئی سطح تک کھینچ لانا چاہتی ہے۔

اس سیکنڈ او آئی سی کے خلاف عُبید کے پاس کیا چانس ہوتا؟ بے بی او، قدیم شعروں کی سرگوشیاں کرنے والا، پرانے سنہرے گیت گنگنانے والا۔ آخر وہ سلیکشن کے عمل میں کام یاب کیسے ہو گیا؟ آخر وہ افسری کے ٹیسٹ میں پاس کیسے ہو گیا؟ وہ نقلی جنگل میں زندہ رہنے کے ٹیسٹ میں اپنے ساتھی اُمیدواروں کی قیادت کیسے کر پایا؟ اس نے نفسیاتی پروفائل ٹیسٹ کے دوران کون سے بھرم دکھا کر کام یابی حاصل کی؟

وہ تو بس اس کی پتلون اُتار کر اس کا ریشمی انڈر ویئر ہی دیکھ لیتے تو کافی ہوتا جس کے کمربند پر چھوٹے چھوٹے دل کڑھے ہوئے تھے۔

کہاں ہو تم، بے بی او؟

لیفٹیننٹ بینن نے ہمیں سب سے پہلے سالانہ ورائٹی شو میں دیکھا تھا، جہاں ہم فاختہ اور عقاب والا رقص کر رہے تھے۔ یہ اس سے پہلے کی بات ہے جب کمانڈانٹ نے ایسے ورائٹی شو ختم کر کے قرآن سٹڈی سرکل اور ڈنر کے بعد کی ادبی سرگرمیاں شروع کرادیں۔ تھرڈ ٹرم کے لڑکوں کی حیثیت سے ہمیں تمام واہیات قسم کے گانوں پر پرفارم کرنا پڑا جن میں ہمیں فینسی ڈریس پہننا تھے اور ہمارے سینیر جارج مائیکل کے گانوں پر لپ سِنک کر رہے ہوتے تھے۔ ہم ایک بہت مردانہ اور انقلابی قسم کی نظم کی نقل کر رہے تھے۔ میں ایک استعماری عقاب کی شکل میں عُبید کی تیسری دنیا کی فاختہ پر جھپٹا؛ اُس نے اپنا دفاع کیا، اور آخری حصّے میں میرے سینے پر بیٹھ کر اپنی کارڈ بورڈ سے بنی چونچ کی مدد سے میری گردن سے خون چوسنے لگا۔

بینن اسٹیج کے پیچھے ہم سے ملنے آیا جب ہم اپنے مضحکہ خیز پر اُتار رہے تھے۔ 'ہووو۔ تم زومبیوں کو تو ہولی ووڈ میں ہونا چاہیے!' اس کے ہاتھ کی گرفت غلو آمیز اور سخت تھی۔ 'گڈ شو، گڈ شو۔' وہ عُبید کی جانب مُڑا، جو ایک ٹِشو کی مدد سے اپنے گالوں پر لگی براؤن بوٹ پالش صاف کر رہا تھا۔ 'یار تم تو اس جنگی پینٹ کے بغیر بچّے ہی لگتے ہو۔' بینن نے کہا۔ 'نام کیا ہے تمھارا؟'

بیک گراؤنڈ میں سرٹونی 'کیئرلیس ویپرز' اتنے بے سرے لَت لَتے سے گا رہا تھا کہ مقررین کو چلّا کر احتجاج کرنا پڑا۔

اپنی لال ٹوپی کے نیچے بینن کا چہرہ کسی کوٹے ہوئے چڑے جیسا تھا، اس کی آنکھیں کھوکھلے سبز تالابوں جیسی جنھوں نے برسوں سے بارش کی ایک بوند بھی نہ دیکھی ہو۔

'عُبید۔ عُبیداللہ۔'

'مطلب کیا ہے اس کا؟'

'اللہ کا نوکر۔' عُبید نے ایسے کہا جیسے اسے اس پر یقین نہ ہو، جیسے وہ یہ وضاحت کرنا چاہ رہا ہو کہ اس نے اپنے لیے اپنا نام خود منتخب نہیں کیا۔

'آپ کے نام کا کیا مطلب ہے، لیفٹننٹ بینن؟' میں عُبید کی مدد کو آیا۔

'یہ صرف ایک نام ہے۔' اس نے کہا۔ 'کوئی مجھے لیفٹننٹ نہیں کہتا۔ تم جیسے اسٹیج کے ماموں کے لیے میرا نام لوٹ بینن ہے۔' اس نے اپنی ایڑیاں چٹخائیں اور واپس عُبید کی جانب مُڑا۔ ہم دونوں اس کی توجّہ کا مرکز بن گئے۔ اس نے اپنے اوور دی ٹاپ، دو انگشت سلیوٹ کا رخ عُبید کی جانب کیا اور وہ لفظ کہے جو اس لمحے ہمیں امریکی فوج کی عجیب وغریب زبان کا کوئی حصّہ لگے تھے لیکن جو بعد میں ڈائننگ ہال کی گپ شپ کا حصّہ بن گئے تھے۔

'تم سے اسکوائر پر ملاقات ہوگی، بے بی او۔'

مجھے حسد محسوس ہوا، اس احساسِ قربت کی وجہ سے نہیں جو ان الفاظ سے پھوٹتا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ کاش عُبید کے لیے یہ نک نیم میں نے سوچا ہوتا۔

میں اپنے ذہن میں ان چیزوں کا ایک نوٹ بناتا ہوں جو وہ میرے خلاف ثبوت کے طور پر میرے ڈورم میں پا سکتے ہیں۔

۱۔ مری رَم کا ایک پوّا جس میں ایک چوتھائی شراب موجود تھی۔

۲۔ فرسٹ ٹرم کے لڑکوں کا اپنے انڈر ویئر میں ایک گروپ فوٹو (بلکہ سفید اور دسمبر کی سردی میں گیلے انڈر ویئر)

۳۔ 'Love on a Horse' کی ایک وڈیو۔

۴۔ بینن کے ڈاگ ٹیگز، جو گارڈ روم کے لوسٹ اینڈ فاؤنڈ والے نوٹس بورڈ پر اب بھی غائب شدہ چیزوں کی ذیل میں درج تھے۔

اگر میرا لشکری خون کسی ادبی جرثومے سے اس قدر مکمل طور پر محروم نہ ہوتا تو میں

شے نمبر پانچ کے طور پر شاعری کو درج کرتا، لیکن سیل میں پڑا ہو تو کون بے وقوف شاعری کے بارے میں سوچتا ہے؟ ہاں آپ کمیونسٹ یا کوئی شاعر ہیں تو اور بات ہے۔

سیل کے دروازے میں لیٹر بکس کے لیے ایک درز ہے، جیسے لوگ مجھے وہاں خط بھیجنے والے ہوں۔ ڈیئر علی شگری، مجھے اُمید ہے کہ تمھاری صحت بالکل ٹھیک ہے اور تم مزے سے اپنا وقت گزار رہے ہو ایک۔۔۔

میں اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہوں اور میری آنکھیں لیٹر بکس کی درز کے سامنے آ جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ عُبید ہوتا تو درز پر لگا ہوا ڈھکنا اُٹھاتا اور یہاں بیٹھ کر خاکی وردی میں ملبوس ٹانگیں دیکھتا رہتا اور یہ اندازہ لگا کر خود کو محظوظ کرتا رہتا کہ کون سی گاف کس کی ہے۔ ہمارا بے بی او فقط یہ دیکھ کر لوگوں کی شخصیت کا تفصیلی تجزیہ کر لیتا تھا کہ وہ اپنی بیلٹ کہاں اور کتنی ٹائٹ باندھتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ میں ڈھکنا اُٹھاؤں اور کوئی مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ لے۔ بات شاید پہلے ہی نکل چکی ہے۔ وہ قصائی شگری جتھے دی کھوتی، اتھے آن کھلوتی، اب چابی وابی پھینک دو۔

ڈھکنا خود اُٹھ جاتا ہے، اور ایک فرسٹ ٹرم کے لڑکے کا منحوس مُنھ میرے ڈنر کا اعلان کرتا ہے۔ میں 'دفع دوڑ' کہتا ہوں اور فوراً اس پر افسوس کرتا ہوں۔ خالی پیٹ سونے کا مطلب ہے ڈراؤنے خواب۔

خواب میں مجھے ایک ہرکولیس سی ون تھرٹی طیارہ نظر آتا ہے جو ویسے شوخ پھولوں سے لدے ہوئے ہیں جیسے آپ ٹرکوں کی گاڑیوں پر دیکھتے ہیں۔ جہاز کے پروپیلز چٹے سفید ہیں اور آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں اور ان سے یاسمین کے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ بے بی او دائیں پر کے کونے پر پروپیلر سے ذرا سا پیچھے کھڑا ہے اور اس نے ایک سیاہ ریشمی چغا اور اپنی روایتی پی کیپ پہن رکھی ہے۔ میں بائیں پر کے کنارے پر پوری وردی میں کھڑا ہوں۔ بے بی او ائرکرافٹ کی آواز سے بھی اونچی آواز میں کچھ چلّا رہا ہے۔

مجھے اس کے کسی لفظ کی سمجھ نہیں آتی لیکن اس کے اشارے مجھے بتاتے ہیں کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ جیسے ہی میں بے بی او کی جانب اپنا پہلا قدم بڑھاتا ہوں، سی ون تھرٹی ڈگمگاتا ہے اور تیس کے زاویے پر بائیں مُڑنے لگتا ہے اور اچانک ہم پروں پر سے پھسلتے ہوئے فراموشی کی جانب محوِ سفر ہونے لگتے ہیں۔ میں ایک ایسی چیخ کے ساتھ بیدار ہوتا ہوں جو آپ کے سارے جسم میں گونج جاتی ہے لیکن حلق میں پھنسی رہ جاتی ہے۔

صبح کے وقت وہ میرے مُنھ پر شاعری دے مارتے ہیں۔ جو لوگ شاعری میں دلچسپی رکھتے ہیں انھیں بتا دوں، رلکے کی شاعری۔

ہماری اکیڈمی کا آفیسر ان کمانڈ یا، جیسا کہ وہ خود کو کہلانا پسند کرتا ہے، کمانڈانٹ بہت نفیس ذوق کا مالک شخص ہے۔ اچھی طرح بنائے ہوئے بال، وردی نجی طور پر تیار کرائی ہوئی، کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کے میڈل اچھی طرح پالش کیے ہوئے۔ کندھے کے فلیپ بے شکن۔ ٹھیک ہے کہ ابھی اس کی وردی پر دو ستارہ جرنیل کا ہلال اور بھڑی ہوئی تلواریں نہیں پہنچیں، لیکن یہ شخص ان کے انتظار میں اچھا وقت گزار رہا ہے۔

میرے گدّے کے اندر کاغذ کے کچھ مُڑے تُڑے ٹکڑے ہی وہ واحد شے تھی جو انھیں مل سکی۔ ان کا خیال ہے کہ اُنھیں جرم کا سراغ مل گیا ہے۔

میں شاعری نہیں پڑھتا اور میں نے تو شاعری کی اُن کتابوں کو پڑھنے کے مُتعلق جھوٹ بولنا بھی بند کر دیا تھا جو عُبید مجھے دیتا رہتا تھا۔ میں یہ بہانا بنایا کرتا کہ میں صرف اردو شاعری کا لطف اُٹھا سکتا ہوں اس لیے اس نے قلم ہاتھ میں لیا اور میری سال گرہ کے لیے اس جرمن شخص کی نظموں کو اردو میں ترجمہ کر ڈالا، پھر اس نے ان میں قافیے بٹھائے کیوں کہ میں نے ایسی شاعری پڑھنے سے بھی انکار کر دیا تھا جن میں قافیہ بندی نہ ہو۔ اُس نے اپنی خطاط کی سی ہینڈ رائٹنگ میں پانچ نظمیں ترجمہ کیں، جن میں چھوٹی چھوٹی قوسیں اور چابک دستی سے لگائے جانے والے نقطے موجود تھے اور انھیں میری الماری کے

اندرونی حصے میں چسپاں کر دیا۔

جس صبح وہ غائب ہوا، اس روز کلین اپ آپریشن کے دوران میں نے انھیں اس اُمید میں اپنے گدے کے سوراخ میں ٹھونس دیا تھا کہ سیکنڈ او آئی سی چچ کی کھوج میں اتنی دور نہیں جائے گا۔

میں زیادہ تر چیزوں کے بارے میں سوچ چکا ہوں اور میرے پاس ان کے جواب تیار ہیں، لیکن اس سوال کا جواب مجھے واقعی معلوم نہیں۔ وہ مجھ پر الزام کس بات کا لگائیں گے؟ غیر ملکی شاعری کو ملکی زبان میں ترجمہ کرنے کا؟ سرکاری اسٹیشنری کا غلط استعمال کرنے کا؟

میں اس بارے میں بالکل سچ بولنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

کمانڈانٹ کو میرا جواب مضحکہ خیز لگتا ہے۔

'اچھی نظم ہے۔' وہ مُڑے تُڑے کاغذ کو سیدھا کرتا ہوا کہتا ہے۔ 'صبح کی ڈرل کے بجائے ہمیں یومیہ مشاعرہ شروع کر دینا چاہیے۔'

وہ سیکنڈ او آئی سی کی جانب مُڑتا ہے۔ 'یہ تمھیں ملا کہاں سے؟'

'اس کے گدے کے سوراخ، سر۔' سیکنڈ او آئی سی خود پر مسرور ہو کر کہتا ہے کیوں کہ اس نے اپنے فرض سے کہیں بڑھ کر کام کر دکھایا ہے۔

رقعے والے کاغذ کو پھر سے بھینچ دیا جاتا ہے اور کمانڈانٹ سیکنڈ او آئی سی کی آنکھوں میں اپنی نظریں ایسے گاڑتا ہے جس کی صلاحیت صرف ان افسران میں ہوتی ہے جن میں جرنیلوں والے جینز ہوں۔

'میرا تو خیال تھا کہ ہم اس مسئلے کا بندوبست کر چکے ہیں؟'

اب مزہ آیا، گاف پھٹے، میری اندرونی آواز لہراتی ہے۔

کمانڈانٹ کا ہاتھ قوم کی نبض پر ہے اور وہ ہمیشہ آرمی ہاؤس کی جانب سے چلنے والی ہوائیں دیکھ کر اپنی کشتی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ ان دنوں اس کے آرڈر آف دا ڈے

میں 'اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ' اور 'اپنے گھوڑے تیار رکھو کیوں کہ روسی کافر آ رہے ہیں' جیسے اظہارات راہ پا رہے ہیں، لیکن وہ اب تک فوم کے سوراخ والے گدوں سے چھٹکارا پانے کے اپنے سیکولر مشن کو تج نہیں سکا۔

'تمھیں کچھ پتا ہے کہ ہم افسروں کی ایک بہتر قسم کیسے بنے؟ سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ انسٹرکٹروں کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ہم روئی کے پتلے گدے پر سوتے تھے، کھردرے اونی کمبلوں کے نیچے، جو گدھے کی پشت جیسے محسوس ہوتے تھے۔'

میں اس کے سر کے اوپر دیکھتا ہوں اور دیوار پر لگی صدارتی انسپکشن کی تصویروں کا سروے کرتا ہوں اور شیشے کی الماری میں بند بڑی چمک دار ٹرافیوں کا، اور اپنے ڈیڈی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہاں، یہ نو انچ کا کانسی کا آدمی، جس نے پستول پکڑا ہوا ہے، میرا ہے۔ شارٹ رینج شوٹنگ کی شگری میموریل ٹرافی، جس کا نام کرنل قلی شگری کے نام پر رکھا گیا، جسے انڈر آفیسر علی شگری نے جیتا۔

ابھی میں کرنل شگری یا چھت کے پنکھے یا بستر کی اس چادر کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا جو ان سب کو جوڑتی ہے۔ ڈیڈی اور چھت کے پنکھے اور بستر کی چادر کے بارے میں سوچ کر میں ہمیشہ بہت غصّے میں آ جاتا ہوں یا بہت اداس ہو جاتا ہوں۔ یہ جگہ ان دونوں جذبوں کے لیے مناسب نہیں۔

'اور انھیں دیکھو ذرا۔' کمانڈانٹ میری جانب مُڑتا ہے۔ میرے بازو میرے اطراف جم کر رہ جاتے ہیں اور میری گردن بڑی مہارت سے خود کو ایسی جگہ لے آتی ہے جہاں سے میں کانسی کے آدمی کو دیکھتا رہ سکوں۔

'مجھے جانے دو۔' میں سوچتا ہوں۔ 'میں نے وہ حرام کی ٹیکنالوجی ایجاد نہیں کی جس سے فوم کے گدے بنتے ہیں۔'

'اور دیکھو ذرا ان نوخیز کلیوں کو۔۔۔' نیا لفظ اچھا ہے، میں خود سے کہتا ہوں۔ اسی

طرح تو وہ اپنی اتھارٹی برقرار رکھتا ہے۔ ایسے نئے الفاظ گھڑ کر جو آپ کو واقعی سمجھ میں نہ آئیں لیکن آپ اتنا جانتے ہوں کہ خود آپ کے لیے ان کا مطلب کیا ہے۔

'یہ کلیاں نونو انچ موٹے گدّوں پر ریشمی کمبلوں کے نیچے سوتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بلڈی مغل شہزادی ہے جو ہنی مون پر آئی ہے۔' وہ مُڑے تُڑے رُکے کو سیکنڈ او آئی سی کے حوالے کرتا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ تفتیش جاری رہ سکتی ہے۔

'کیا یہ تمھاری ہے؟' سیکنڈ او آئی سی نظموں کو میرے مُنھ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھتا ہے۔ میں نظموں میں سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ایک آدھا یاد آیا ہوا مصرع ہی میرے ذہن میں اٹک کر رہ جاتا ہے جو کسی 'کان سے پھوٹے ہوئے درخت' کے بارے میں تھا اور جو انگریزی میں ہی بہت عجیب و غریب تھا لیکن قافیہ بند اردو میں مکمل پاگل پن کا نمونہ لگتا ہے۔ پتا نہیں وہ چوتیا جرمن زبان میں کیا کیا کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'نہیں، لیکن میں ہینڈ رائٹنگ پہچانتا ہوں۔' میں کہتا ہوں۔

'ہینڈ رائٹنگ ہم بھی جانتے ہیں۔' وہ فاتحانہ لہجے میں کہتا ہے۔ 'یہ تمھارے گدّے میں کیا کر رہا ہے؟'

میں سوچتا ہوں کہ کاش انھوں نے رم کی بوتل یا ویڈیو ڈھونڈ نکالی ہوتی۔ کچھ چیزیں اپنی وضاحت آپ ہوتی ہیں۔

میں سچ پر قائم رہتا ہوں۔

'یہ کیڈٹ عبید کی جانب سے میری سال گرہ کا تحفہ تھا۔' میں کہتا ہوں۔ سیکنڈ او آئی سی نظمیں کمانڈانٹ کو واپس کر دیتا ہے، جیسے وہ اپنا کیس مکمل کر چکا ہو، چاہے کیس جو بھی ہو۔

'میں نے اس کام میں ہر قسم کے چوتیے دیکھے ہیں۔' کمانڈانٹ آہستگی سے اپنی بات کا آغاز کرتا ہے۔ 'لیکن ایک نوخیز کلی کا دوسری نوخیز کلی کو شاعری دینا، اور پھر دوسری نوخیز کلی کا وہ شاعری اپنے گدّے کے سوراخ میں ٹھونسنا کچھ ایسی فحاشی ہے جو میری سمجھ سے تو باہر ہے۔'

میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ایک نیا لفظ زیادہ استعمال کرنے سے کتنی جلدی اپنا چارم کھو دیتا ہے، لیکن ابھی اس نے بات ختم ہی کہاں کی ہے۔

'وہ سمجھتا ہے کہ ہم سے ہشیاری دکھائے گا۔' وہ سیکنڈ او آئی سی سے مخاطب ہوتا ہے جو واضح طور پر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ 'آئی ایس آئی سے کہو کہ اس سے ذرا بات کر کے تو دیکھے۔'

مجھے یقین ہے کہ اس کی بات اب بھی ختم نہیں ہوئی۔

'اور سنو، لڑکے، تم ہشیار بھلے ہو گے اور تم نے دنیا کی ساری پھو شاعری بھلے ہی پڑھ رکھی ہو گی لیکن ایک چیز ایسی ہے جسے تم مات نہیں دے سکتے۔ تجربہ۔ شاعری اس کے مقابلے میں ہے کیا؟ میں نے جب یہ وردی پہننا شروع کی تھی ۔۔۔'

میں پستول پکڑے ہوئے کانسی کے شخص پر آخری نظر ڈالتا ہوں۔ کرنل شگری کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں مجھے گھورتی ہیں۔ یہ کوئی مناسب جگہ نہیں، میں خود کو بتاتا ہوں۔

کمانڈانٹ کو میری لمحاتی غائب دماغی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنے الفاظ دُہراتا ہے۔ 'میں نے جب یہ وردی پہننا شروع کی تھی، تب تم صرف مائع حالت میں موجود تھے۔'

سیکنڈ او آئی سی مجھے مارچ کراتا ہوا کمانڈانٹ کے دفتر سے باہر لے آتا ہے۔ اپنی واپسی کے سفر میں مَیں اپنے پاس سے گزرنے والے کیڈٹوں کے سلیوٹ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں جیسے میں سیکنڈ او آئی سی کے ساتھ تفریحی چہل قدمی کر رہا ہوں، جو بالآخر سیل کے بجائے میرے ڈورم پر جا کر ختم ہو گی۔

میں آئی ایس آئی کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ پاتا۔

یہ یقیناً بس خالی خولی دھمکی ہو گی۔ وہ صرف اس لیے انٹر بلڈی سروسز بلڈی انٹیلی جینس والوں کو نہیں طلب کر سکتے کہ ایک کیڈٹ بھگوڑا ہو گیا ہے۔ آئی ایس آئی تو قومی سلامتی اور

جاسوسوں سے معاملہ کرتی ہے۔ اور ان دنوں کسی چوتیا کو جاسوس رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے پاس تو مواصلاتی سیارے ہیں جن میں اتنے طاقت ور کیمرے لگے ہوئے ہیں جو آپ کی گاف پر موجود سارے بال بھی گن سکتے ہیں۔ بینن نے ہمیں ایسے ہی ایک مواصلاتی سیارے کی تصویر دکھائی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ اس نے پٹھوں کی خلا سے اتاری ہوئی تصویریں بھی دیکھ رکھی ہیں لیکن وہ ہمیں نہیں دکھا سکتا کیوں کہ وہ کلاسیفائیڈ ہیں۔

آئی ایس آئی منشیات کو بھی دیکھتی ہے لیکن ہم اس میں تو کبھی نہیں پڑے۔ ہاں، ہم نے ایک بار حشیش پی تھی، لیکن ان پہاڑوں میں جہاں سے میں آیا ہوں حشیش تو باورچی خانے کے ایک مصالحے کی حیثیت رکھتی ہے اور سر درد اور ایسی ہی چیزوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ عُبید نے ہمارے واشر مین انکل ستار جی سے کچھ حشیش لی تھی اور ایک چاندنی رات ہم نے پریڈ اسکوائر کے وسط میں اس کے کش لگائے تھے۔ عُبید کو گانے کا دورہ پڑ گیا تھا اور مجھے اسے عملی طور پر اپنی پیٹھ پر لاد کر اپنے ڈورم تک لانا پڑا تھا۔

مجھے بینن کو ایک ایس او ایس پہنچانا پڑے گا۔

Shit on a Shingle, Shit on a Shingle

۴ سیٹ

پندرہ جون ۱۹۸۸ء کو فجر کی نماز سے پہلے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے جنرل ضیا کی انگشتِ شہادت سورۃ الانبیاء کی ستاسی ویں آیت پر ٹھٹھک کر رہ گئی اور اس نے اپنی مختصر زندگی کا باقی عرصہ وہیل مچھلی کی آنتوں کے بارے میں خواب دیکھتے ہوئے گزارا۔ اس آیت کے نتیجے میں ایک سیکیورٹی الرٹ بھی نافذ کر دیا گیا جس نے جنرل ضیا کو اس کی سرکاری قیام گاہ، آرمی ہاؤس، تک محدود کر دیا۔ دو ماہ اور دو روز کے بعد وہ پہلی مرتبہ آرمی ہاؤس سے باہر نکلا اور طیارے کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ قوم خوش ہو گئی اور کبھی نہ جان سکی کہ موت کی جانب جنرل ضیا کا سفر ایک بدقسمت دن کی اس الجھن سے شروع ہوا جو اُس نے قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ پڑھتے ہوئے تجربہ کی تھی۔

مرمڈوک پکتھال کے انگریزی ترجمۂ قرآن میں سورۃ الانبیا کی ستاسی ویں آیت کچھ یوں تھی:

''اور ذوالنون (کو یاد کرو) جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہو کر) غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم اُن پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ آخر اندھیرے میں (اللہ کو) پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے (اور) بے شک میں قصور وار ہوں[1]''

جب جنرل ضیا کی انگشت 'اِنّی کُنتُ مِن الظّالِمین' پر پہنچی تو رُک گئی۔ اس نے

[1] ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری

اپنی انگلی سے لائن کو پھر سے تلاش کیا، اور اس اُمید میں بار بار انھیں الفاظ کو پڑھتا رہا کہ ان کی اصل تعبیر ڈھونڈ سکے۔ اُس نے اِس آیت کو پہلے جب بھی پڑھا تھا تو اس کی یادداشت کے مطابق وہ کچھ مختلف تھی۔

عربی میں یہ آیت یوں تھی:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنتَ سُبحٰنَكَ اِنِّی کُنتُ مِنَ الظّٰلِمِین

جس کا ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ:

اور میں ہوں ان میں سے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

لیکن اس ترجمے میں یہ بتایا گیا تھا کہ:

'میں قصور وار ہوں'

جنرل کو حضرت یونس کا قصہ خوب معلوم تھا۔ یہ حقیقت کہ یہاں یونس کو ہی ذوالنون کہا گیا ہے، اس کے لیے الجھن کا سبب نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یونس اور ذوالنون ایک ہی ہیں، اور حضرت یونس پریشان ہو جانے والے ایک نبی تھے جو اپنا قبیلہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بالآخر انھیں ایک وھیل کے پیٹ میں جگہ ملی۔ پھر انھوں نے یہی آیت بار بار دُہرائی یہاں تک کہ وھیل نے انھیں زندہ اور ٹھیک ٹھاک حالت میں باہر اُگل دیا۔

جنرل ضیا نے فجر کی نماز سے پہلے قرآن کے انگریزی ترجمے کے مطالعے کی عادت ڈال لی تھی کیوں کہ اس سے اسے نوبیل انعام کی تقریب کے لیے اپنی تقریر تیار کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اس انعام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ اپنی تقریر سے پہلے قرآن کی تلاوت پر اصرار کرنے والا تھا۔ انعام کا اعلان تو ابھی تک نہیں کیا گیا تھا، لیکن اسے اُمید تھی اور وہ موقع کی مناسبت سے قرآن سے کوئی حصہ نقل کرنے کے لیے تلاش کر رہا تھا۔

تقریر میں حضرت یونس کی دعا تو نہیں ہونی تھی، البتہ جنرل ضیا کو پہلے سے جو ترجمہ یاد تھا اُس میں اور جو کچھ وہ ورق پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا، اس میں بہ ظاہر نظر آنے والا فرق اسے اب بھی پریشان کر رہا تھا۔ اس نے غائب دماغی کے ساتھ اپنا وزن دوسرے کولہے پر دھرا اور مصلے پر اپنا بایاں کولہا کھجایا۔ اس دوران اس کی شہادت کی انگلی اس آیت پر آگے پیچھے پھرتی رہی جس نے اسے مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ مُصلّیٰ بخارا کا چار ضرب دو فٹ کا ایک قدیم قالین تھا، جس میں سونے کی زردوزی لگی ہوئی تھی اور جو دائیں جانب کے کونے پر خالص سونے کے قطب نما سے سجایا گیا تھا جو ہمہ وقت مکّہ میں خانہء کعبہ کی جانب اشارہ کرتا رہتا تھا۔

یہ مُصلّیٰ جنرل کو پیش کرتے ہوئے سعودی عرب کے ولی عہد دُوم شہزادہ نائف نے مذاقاً کہا تھا، 'اگر آپ خلا میں بھی ہوں گے تو یہ آپ کے لیے مکّہ کی نشان دہی کر دے گا۔'

اور جنرل ضیا نے جواب اسی مزاح کے ساتھ دیا تھا جو ان کے تعلقات کا غماز تھا، 'اور اگر خواہشات الہ دین کا قالین ہوتیں تو میرے جیسے گناہ گار ہر وقت مکّہ کی جانب محوِ پرواز رہتے۔'

جنرل ضیا نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی تقریر اردو میں کرے یا پھر اپنی عربی کو بہتر کر کے اپنے سعودی دوستوں کو حیران کر دے۔ اقوامِ متحدہ کے اپنے دوروں کے دوران سوٹ میں ملبوس اچھی تن خواہیں پانے والی خواتین سے اس کی ملاقاتیں رہی تھیں جو آپ کی باتوں کا تمام زبانوں میں ترجمہ کر دیتی تھیں۔ یقیناً سویڈن والے انھیں پیسے دینے کے قابل تو ہوں گے۔ پھر اسے اپنے اچھے دوست رونلڈ ریگن کا خیال آیا کہ وہ اپنے ہیڈ فون کے ساتھ الجھ رہا ہوگا، بے چین ہو جائے گا، اور سوچا کہ وہ تقریر انگریزی میں ہی کرے گا۔ چلو کوئی اور ترجمہ دیکھتے ہیں، اس نے خود سے کہا۔ وہ مُصلّے سے اُٹھا اور اپنا ریشم کا بُنا ہوا چینی شبینہ گاؤن اپنے پیٹ کے اُبھار کے گرد باندھ لیا۔ 'میرے جسم کا واحد سویلین حصّہ ہے، اسی لیے قابو سے باہر ہے۔' وہ کہنا پسند کرتا تھا۔

جب وہ یہاں نہیں آیا تھا تو سنگِ مرمر سے بنے فرش اور مہوگنی کے ستونوں والی دیواروں والے اس کمرے میں عسکری تاریخ پر کتابیں اور اس کے پیش رووں کے پورٹریٹ موجود تھے۔ اس نے تمام کتابیں اور تصویریں مہمانوں کے کمرے کی انیکسی میں

رکھوا دی تھیں اور اسے عبادت کا کمرا بنا دیا تھا۔ آرمی ہاؤس جو اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر کا بھی کام کرتا تھا، انگریزوں کے دور کا ایک بنگلا تھا، جس میں چودہ بیڈ روم، اٹھارہ ایکڑ پر مشتمل لان اور ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ یہ اسے پرانی بلیک اینڈ وائٹ دور کی فلموں کی یاد دلاتا تھا، جن میں رحم دل حکم راں اپنے عوام کے قریب ہوا کرتے تھے۔ نیا ایوانِ صدر بن چکا تھا۔ وہ ہر ہفتے کچھ روز اسی میں غیر ملکی معززین اور مقامی ملاؤں کو ٹھہراتا تھا، لیکن وہاں خود منتقل ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ ایوانِ صدر کی محل نما راہ داریوں میں خود کو کھویا ہوا محسوس کرتا اور اس نے اپنے چیف اسٹاف افسر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ خاتونِ اوّل کو یہ بتایا کرے کہ وہاں کام ابھی جاری ہے۔

جب کبھی وہ اسے گھر تبدیل کرنے کے لیے تنگ کرتی وہ کہتا، 'ابھی غسل خانے مکمل نہیں ہوئے اور کچھ سیکیورٹی کے مسائل بھی ہیں۔' نیا ایوانِ صدر اسے شہزادہ نائف کے محل کی یاد دلاتا اور اگرچہ وہ شہزادہ نائف سے کسی بھائی کی طرح محبت کرتا اور اس کا احترام کرتا تھا، لیکن ضروری نہیں کہ جو چیز تیل کی دولت سے مالامال صحرائی سلطنت کے ولی عہد کے لیے درست تھی وہ تیرہ کروڑ لوگوں پر مشتمل ایک غریب قوم کے منکسر مزاج حکم راں کے لیے بھی مناسب ہوتی۔

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہی تعداد درست ہو، لیکن یہ ایک ستھرا عدد تھا اور جب تک وہ نئی مردم شماری کا حکم دیتا وہ اسی پر یقین کرتے رہنے پر تیار تھا۔

اس نے پکتھال کا ترجمہ سبز رنگ کے مخملیں غلاف میں لپیٹ دیا اور شیلف میں قرآن کے دوسرے نسخوں، تفاسیر و تفاہیم کے ساتھ رکھ دیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ فجر کی نماز سے پہلے اپنی وردی پہن لے۔ انٹر سروسز انٹیلی جینس کا سربراہ ساڑھے چھ بجے اس سے ملاقات کرنے والا تھا، نماز سوا چھ بجے ختم ہونا تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کچھ وقت آرمی ہاؤس کی مسجد کے امام کے ساتھ بات چیت میں صرف کرے۔

کوئی فیصلہ کرنے اور پھر اسے نافذ کرنے کے درمیان، جنرل ضیا کبھی کبھار الوہی

رائے سے رجوع کرنا بھی پسند کرتا تھا۔ اور اگرچہ فجر کی نماز سے پہلے یا بعد میں وردی پہننا اس کی تیرہ کروڑ رعایا کے مقدر پر اثر انداز ہونے کا امکان نہیں رکھتا تھا، پھر بھی اس نے شیلف میں سے قرآن کی ایک اور جلد نکالی، اپنی آنکھیں بند کیں، کتاب کھولی اور بند آنکھوں کے ساتھ ہی کتاب کے صفحوں پر انگلی پھیرنے لگا۔ اس نے اپنے اور اپنے ملک کے لیے ایک محفوظ دن کی خواہش کی، اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی انگلی کو اس آیت پر پایا:

لا اِلٰہَ اِلّا اَنتَ سُبحٰنَکَ اِنّی کُنتُ مِنَ الظّٰلِمِین

اس کی مطالعہ گاہ کے باہر فجر کی نماز سے قبل کے وہ معاملات شروع ہو چکے تھے جو آرمی ہاؤس کو اپنی رعایا پر تفوق دیتے تھے۔ رات کی شفٹ کے کمانڈو اپنی اپنی کلاشنکوفوں کے سیفٹی کیچ بند کر رہے تھے اور اپنے بازو اور ٹانگیں سیدھے کر رہے تھے؛ مرکزی گارڈ روم میں مالیوں کی ایک ٹیم کی جسمانی تلاشی لی جا رہی تھی؛ جنرل ضیا کا ذاتی بیٹ مین سات مختلف وردیوں پر ایک ہی قسم کے سات میڈلوں کے سات سیٹ لگا رہا تھا؛ آرمی ہاؤس کو سیکیورٹی کور فراہم کرنے والی فلڈ لائٹ اور اَیک اَیک گنوں کے پیچھے چھپی سیکڑوں چڑیوں میں سے پہلی چڑیا صبح کی بات چیت شروع کرنے کی کوشش میں چہچہا رہی تھی۔

جنرل ضیا نے آہ بھری، قرآن کو اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا، اسے چوما اور اسے شیلف پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی سرسراہٹوں پر قابو پانے کے لیے خود کو بانہوں میں بھر لیا۔ اتنی صبح ہی صبح قرآن کی دو مختلف جلدوں سے ایک ہی آیت کا سامنے آ جانا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

فوجی انقلاب کی رات سے اب تک، اس نے ہمیشہ اپنی رہ نمائی کے لیے کتاب سے رجوع کیا تھا اور اسے ہمیشہ وہ جواب ملا تھا جس کی اسے تلاش ہوا کرتی۔ گیارہ سال پہلے اپنے دستوں کو آپریشن فیئر پلے کا حکم دینے سے پہلے، جس کے نتیجے میں وزیرِاعظم بھٹو کو ہٹا کر ملک کے سربراہ کے طور پر اسے فائز کر دیا گیا، اس نے قرآن کھولا تھا اور اسے یہ آیت ملی تھی۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ[1]

پھر دو سال بعد بھٹو کو پھانسی نہ لگانے کے لیے عالمی رہ نماؤں کی جانب سے درخواستوں اور اس کے موت کے وارنٹ پر دستخط کے درمیان ضیا نے کتابِ پاک کو کھولا اور وہاں یہ پایا:

وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا[2]

اس نے مودودی کو اتنا تو پڑھ ہی رکھا تھا کہ اسے معلوم ہو جاتا کہ قرآن کوئی پیش گوئیوں کی کتاب نہیں جسے دنیاوی امور میں استعمال کیا جا سکے، لیکن ایک ایسے بچے کی طرح جو اپنے سال گرہ کے ڈھکے ہوئے تحفوں کو جھانک کر دیکھتا ہو، وہ ایسی ترغیب کی مدافعت نہیں کر پاتا تھا۔

تاریخ کے دوراہے پر کھڑا ہوا ایک تنہا آدمی کیا کر سکتا ہے؟

گیارہ سال کے بعد اس نے خود میں ایک عادت کو پختہ ہوتے ہوئے محسوس کر لیا تھا۔ اب اس نے کتابِ پاک سے ہر روز رجوع کرنا شروع کر دیا تھا جیسے وہ خدا کا کلام نہیں بلکہ پاکستان ٹائمز کے پچھلے صفحے پر چھپا ہوا اس کا روز کا زائچہ ہو۔ اس صبح اس نے خود کو ایک ایسے شخص کے طور پر محسوس کیا جو ایک مدت بعد آئینے میں خود کو دیکھتا ہے اور جو کوئی آئینے میں نظر آ رہا ہوتا ہے اسے پہچان نہیں پاتا۔ اس نے اپنے اندر ایک زوردار خواہش محسوس کی کہ وہ قرآن کی ایک اور جلد ملاحظہ کرے۔ اس نے قرآن کی ایک اور جلد اُٹھائی، لیکن اسے کھولے بغیر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوبارہ شیلف میں رکھ دیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے؛ اسے آرمی ہاؤس کی مسجد کے امام سے بات

[1] آیت ۳۹، سورۃ فاطر، ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔
ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری

[2] آیت ۵۳، سورۃ الکہف: ترجمہ: اور گنہ گار لوگ دوزخ کو دیکھیں گے تو یقین کر لیں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں اور اس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ پائیں گے۔ ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری

کرنے کی ضرورت تھی۔

مسجد تک جانے والی راہ داری میں چلتے ہوئے وہ اپنے بیڈ روم کے پاس سے گزرا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ ٹیبل لیمپ روشن تھا اور اس کی بیوی اپنی وافر پشت اس کی جانب کیے سو رہی تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا اسے شہزادہ نائف کی بات یاد آ جاتی کہ بدوؤں کے عضو اتنے بڑے کس لیے ہوتے ہیں۔ شہزادے کے مطابق وہ اپنی عورتوں کے وسیع داغیے[1] کے جواب میں ارتقا پذیر ہوئے ہیں۔

'ریگستان میں ارتقا کا عمل کافی جلدی ہو جاتا ہے۔' جنرل ضیا نے مذاق میں کہا تھا۔

اس کی بیوی اپنی نیند میں ہلی، اس کے وسیع گنبدوں پر مشتمل پیٹھ لرزی اور جنرل نے آہستگی سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے کمرے کی جانب چلا گیا، جو اس کے رات کے دفتر کے ساتھ ساتھ ایک ایسی الماری کا کام بھی دیتا تھا جس میں آپ چل پھر کر گھوم سکتے ہیں۔ اس نے نماز سے پہلے کپڑے تبدیل کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آئی ایس آئی کا سربراہ اس کا انتظار کرتا رہے۔

اس کے کمرے میں اشیا کی تعداد انتہائی قلیل تھی، فوج کا ایک لکڑی کا اسٹینڈرڈ ڈبل بیڈ، بستر کے ایک جانب میز پر صبح کے اخبارات کا ایک پلندا اور دوسرے میز پر دودھ سے بھرا ایک گلاس جو ایک کاڑھے ہوئے نیپکن سے ڈھکا ہوا تھا۔

دودھ کا گلاس ان گھریلو عادات میں سے ایک تھا جن کے معنی اس کی چونتیس سالہ ازدواجی زندگی کے دوران تبدیل ہو گئے تھے۔ جب وہ ایک نو بیاہتا کپتان تھا تو اس کی بیوی جنسی اشتہا بڑھانے کے ایک معصومانہ گھریلو سے ٹوٹکے کے طور پر اسے ان کی میز پر ایک طرف رکھ دیتی تھی۔ جب ایک میجر کی حیثیت سے اس نے اپنے افسران کو متاثر کرنے کے لیے وسکی کا تجربہ کیا تو یہی دودھ اس کے ہینگ اوور کا علاج بن گیا۔ اپنی

[1] داغیے: Derriere فرانسیسی زبان کا لفظ، جس کے معنی ہیں 'پیٹھ'

کرنیلی کے دنوں اور پھر بریگیڈیئر کے عہدے کے دوران اپنی ترقی سے متعلق اضطراب کے دوران اسے السر رہنے لگا تو یہ دودھ اس کا بھی دھیان رکھنے لگا۔ خاتونِ اوّل کچھ آیتیں پڑھتی، دودھ پر پھونک مارتی اور پھر اسے اس یقین کے ساتھ اس کے بستر کے ساتھ لگے میز پر رکھ دیتی کہ وہ اسے پیے گا نہیں۔ 'تمھاری لمبی عمر کے لیے' وہ کہتی۔ 'تمھارے دشمنوں کی سازشیں ناکام بنانے کے لیے۔' اس نے اب کئی برسوں سے دودھ کے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے یہ گلاس رکھنے سے روک دے۔ عورت سے بحث کون کرے؟ اگر اس کی قیام گاہ کو حصار میں لیے رکھنے والی اسپیشل سروسز گروپ کی تین پلاٹونیں، اینٹی ائرکرافٹ گن کی ایک بیٹری، اس کے بیڈ روم کے ایک میز پر ترتیب سے رکھے چھ مختلف ہاٹ لائن کو جوڑنے والے چھ مختلف رنگوں کے فون اسے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے تو ایک دودھ کا گلاس کیسے اسے ان سازشوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا جن کے بارے میں خاتونِ اوّل خواب دیکھتی رہتی تھیں؟ لیکن ایک ایسی خاتونِ اوّل سے کون بحث کر سکتا تھا جو گھر کے عمدہ نہ ہونے اور قومی ٹیلی وژن پر دیکھنے کے لیے کوئی اچھی چیز نہ ہونے کی شکایت ہی کرتی رہتی تھی۔

اس نے اپنی گھڑی پر دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے اپنی وردی پہننا شروع کر دی تو اسے نماز کے لیے دیر ہو جائے گی۔ ایسا بھی نہیں کہ اس سے کوئی فرق پڑ جاتا کیوں کہ امام کو تو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کے آ جانے کا انتظار کرنا ہی تھا۔ لیکن حضرت یونس والی آیت نے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں اور اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ مسجد میں ہی سکون پا سکے گا۔

جب اس نے آرمی ہاؤس کے اس بغلی دروازے سے باہر قدم نکالا جو مسجد کی طرف جاتا تھا تو سائے میں کھڑے دو کمانڈو نے اسے سلیوٹ کیا۔ جنرل ضیا جو وہ آیت دُہرانے میں مصروف تھا جو وہ صحیح قدم باہر رکھنے سے پہلے دُہراتا تھا، کنکریٹ پر پڑنے والے جوتوں کی ضرب سے چونک گیا۔ وہ دہلیز پر لڑکھڑا گیا اور اس نے ایک قدم پیچھے کو

ہٹایا۔ اس نے دوبارہ قدم باہر دھرا اور ان کا سلیوٹ لوٹانے کے بجائے ان کی جانب سر ہلا دینے پر اکتفا کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر وہ آیت دُہرانے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن حضرت یونس کی بار بار کی التجاؤں کی جانب لوٹ چکا تھا۔

جیسے ہی جنرل ضیا امام کے پیچھے اپنی جگہ پر پہنچا، اس نے نماز شروع کرا دی۔ انٹر سروسز انٹیلی جینس کا سربراہ جنرل اختر اس کے دائیں جانب کھڑا تھا۔ اس کی حرکات جنرل ضیا کی حرکات سے ذرا سی سست تھیں، جیسے اللہ کے سامنے جھکتے وقت بھی جنرل اختر اپنے باس سے اشارہ پانے کا منتظر ہو۔ جنرل ضیا کے لیے یہ بات تقویت کا باعث تھی کہ کوئی ایسا شخص اس کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے جو اس کی آنکھیں اور کان ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا ایک مومن بھائی ہے اور پھر یہ بھی کہ یہ بھائی کہیں اور کسی سیاہ خواہش کو پالنے کے بجائے اس کے ساتھ یہیں موجود تھا۔

پانچ وقت نماز پڑھنے والوں کی اکثریت کی طرح جنرل ضیا بھی نماز میں پڑھی جانے والی دعاؤں پر توجہ برقرار رکھنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ آیتیں بالکل ٹھیک دُہراتے، اس کے ہاتھ اس کے کانوں تک بلند ہوتے، اس کے گھٹنے امام کے کہے پر جھک جاتے اور اس کا ماتھا پختہ مشق سے حاصل ہونے والی مستعدی سے زمین کو چھو جاتا، لیکن اس کا ذہن حضرت یونس کی اس دعا میں اٹکا ہوا تھا جو انھوں نے وھیل مچھلی کے پیٹ میں کی تھی۔ اسے کسی شے کے ابلنے کی آواز آتی، بڑے بڑے بلبلے دکھائی دیتے اور اندھیرے میں حضرت یونس کے زور زور سے ہلتے ہوئے بازو نظر آتے۔ اس نے تھوک نگلا اور محسوس کیا کہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا ایک گروہ اس کے جسم کو اپنے مہین دانتوں سے کھاتا ہوا اس کے دل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسے وھیل سمندر میں گہری چھلانگ لگاتی ہوئی محسوس ہوئی تو اسے اُبکائی سی آئی اور اس نے سانس لینے کے لیے ہوا کا گھونٹ بھرا۔ گوشت کی گرم فربہ دیوار سے ٹکرانے سے پہلے جنرل ضیا لعاب جیسے دلدلی سمندر میں پھسلتا چلا گیا۔ وہ وھیل کی آنتوں کے اندر ایسا مصروف تھا کہ اسے یہ سمجھنے میں کچھ وقت لگا کہ

امام کیا کہہ رہا ہے۔

جب جنرل ضیا نے فوجی بغاوت کی اور خود کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تعینات کیا تو اسے آرمی چیف بنے صرف سولہ ماہ ہوئے تھے۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس نے جن آٹھ جرنیلوں کی مدد مارشل لا لگایا ہے وہ اس پر کتنا اعتماد کرتے ہیں یا، جو زیادہ اہم تھا، اس کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ وہ سب اسے سیلوٹ کرتے تھے، اپنی نجی بات چیت میں بھی، ٹیلی فون بات چیت کی اس تحریری صورت کے مطابق جو جنرل ضیا نے دیکھ رکھی تھی، اسے چیف کہہ کر پکارتے اور اس کے احکامات پر عمل کرتے۔ لیکن کیا وہ اس داڑھی مونچھ مُنڈے، وسکی خور اور اشرافیہ سے تعلّق رکھنے والے گروہ پر صحیح معنوں میں اعتماد کر سکتا تھا؟ کاندھے پر دو سے زیادہ ستارے رکھنے والے ہر شخص کے لیے اپنی بے اعتمادی کی بہ دولت یہ بات قابلِ فہم تھی کہ بغاوت کی رات کے بعد ہونے والی پہلی کور کمانڈر کانفرنس میں جنرل ضیا میں عزم وتیقّن کی کمی سی تھی اور اسے ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں کہ اب وہ اس ملک کے ساتھ کیا کرے۔ انھوں نے بغاوت تو کچھ یوں کر دی تھی جیسے وہ ڈرل انسپکشن کے حکم پر عمل درآمد کر رہے ہوں لیکن جنرل ضیا جانتا تھا کہ اسے ان کی وفاداری بیٹھے بٹھائے نہیں ملنے والی۔ اسے گُربہ کشتن روزِ اوّل پر عمل کرنا ہوگا۔

جنرل ضیا نے شادی کی تو وہ بکتر بند ڈویژن میں کپتان تھا۔ وہ تب تک کنوارا تھا۔ اس کی شادی کی رات اسے اُس کا ایک ماموں ایک کونے میں لے گیا اور فارسی زبان کی ایک پرانی کہاوت اس کے گوش گزار کی: 'گُربہ کشتن روزِ اوّل۔' ماموں نے اس کے کاندھے دبائے، ایک فحش قہقہہ لگایا اور اسے اس کمرے کے اندر دھکیل دیا جہاں مستقبل کی خاتونِ اوّل سرخ ریشم کی ایک گٹھڑی سی بنی، بستر پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ضیا کو فارسی نہیں آتی تھی اور اسے اُس رات مارنے کے لیے کوئی بلّی ملی بھی نہیں۔

'کیا آپ یہ لباس تبدیل کر کے کوئی زیادہ آرام دہ لباس پہننا پسند کریں گی؟' جنرل ضیا نے اس کی سرخ ریشمی قمیص کے کڑھے ہوئے دامن کو مروڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

'اس میں بہت آرام ہے۔' اس نے اس کے ہاتھ سے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ پھر اس نے اُس کی طرف پیٹھ موڑ لی اور سو رہی۔

وہ جانتا تھا کہ اُس پہلی رات کی ناکام ٹوئیاں مارتی ہوئی اس ناکامی کا نتیجہ ایک ایسی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں اس کی اتھارٹی کبھی پوری طرح نافذ نہ ہو سکی۔ تیس سال بعد، نصف شب کی بغاوت کے بعد والی صبح، وہ اس کہاوت کا مطلب جان چکا تھا۔ اب وہ بلی کو مار کر، اسے دفنا دینا اور اس کی قبر پر اپنا پرچم لہرا دینا چاہتا تھا۔ بس اسے ٹھیک سے یہ نہیں پتا تھا کہ اسے یہ سب کرنا کیسے تھا۔ اللہ میری مدد کرے گا، اس نے کانفرنس روم میں داخل ہونے سے پہلے سوچا۔

جنرل ضیا کی بغاوت کے بعد پہلے اجلاس میں بحریہ اور فضائیہ کے سربراہوں سمیت آٹھ جرنیل جنرل ہیڈکوارٹرز کے کانفرنس روم میں میز کے گرد بیٹھے تھے۔ اجلاس کی تاریخی نوعیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردلیوں نے گلاب کی خوش بُو والے ائر فریشنر کا بے دریغ چھڑکاؤ کیا تھا اور کمرا ابھی ابھی مُہر بند کیے ہوئے تابوت کی طرح مہک رہا تھا۔ ایڈجوٹنٹ جنرل، جنرل بیگ، ایک دو ستارہ جرنیل جسے غیر متوقّع طور پر چھینک آ جایا کرتی تھی، ایک سفید رومال اپنے ناک پر رکھے، کونے میں بیٹھا تھا اور کانفرنس میں بولے جانے والے ہر لفظ کو ریکارڈ کرنے کے لیے تیار تھا۔ سب کے سامنے ایجنڈے کی کاپی رکھی تھی جو ایک سبز رنگ کے چمڑے کے فولڈر میں تھی۔ جنرل ضیا نے نوٹ کیا کہ اگرچہ اس کے آنے پر سب کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اسے سیلوٹ بھی کیا لیکن وہ سب اس کے نشست سنبھالنے سے پہلے ہی بیٹھ گئے۔ وہ اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ اجلاس کے آغاز کا اعلان کرتا نیول چیف نے کہا، 'میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ جب مجھے کُو کے بارے میں بتایا گیا تو یہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔۔۔'

ایڈجوٹنٹ جنرل کی دبائی ہوئی چھینک نے ایک لمحے کے لیے سب کی توجہ بٹا دی اور جنرل ضیا کو وہ شروعات مل گئی جس کی اسے شدّت سے ضرورت تھی۔ اس نے نیول

چیف پر ایک پُر شفقت گھوری مرکوز کی اور ملتجیانہ آواز میں گویا ہوا۔ 'آف کورس ہم آپ کا احتجاج سنیں گے اور آف کورس ہم جو کچھ بھی کرنے جا رہے ہیں اس میں ہمیں آپ کی رہ نمائی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن چوں کہ ہم خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنے ملک کو بچا لینے کے بعد پہلی مرتبہ ملاقات کر رہے ہیں، کیا ہمیں یہ اجلاس قرآن کی تلاوت سے نہیں شروع کرنا چاہیے؟ اللہ تمام ارادوں میں ہماری رہ نمائی فرمائے۔'

ان سب نے اپنی اپنی نشستوں پر پہلو بدلے، کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایسی صورتِ حال سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ وہ سب مسلمان تھے اور جانتے تھے کہ چیف بھی مذہبی رجحان رکھتا ہے۔ جب وہ محفوظ ٹیلے فون لائنوں پر بات کر رہے ہوتے تو ان میں سے کچھ اسے 'مُلّا' بھی کہتے۔ لیکن اجلاس تو اجلاس تھا اور ملک چلانے کے معاملات میں مذہب کو شامل کرنا ایک ایسا تصور تھا جو ان کے لیے قابلِ فہم نہیں تھا۔ ربع صدی کی فوجی تربیت نے انھیں کئی کاموں کے لیے تیار کر دیا تھا؛ وہ پانچ مختلف زبانوں میں جامِ صحت تجویز کر سکتے تھے، وہ دنیا کی بہترین افواج کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقیں کر سکتے اور ان کے قدم بہ قدم مارچ کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی وردیاں اتارنے کا فیصلہ کرتے تو وہ سفارتی کیریئر اپنا سکتے یا یونی ورسٹیاں چلا سکتے تھے۔ لیکن ان کے تمام اسٹاف اینڈ کمانڈ کورس اور ان کی ہر سروائیول سکل یہاں ناکافی ثابت ہوئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اپنے چیف کی جانب سے قرآن کی تلاوت کرنے کی پیش کش پر وہ انکار کیسے کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی نشستوں پر مزید پہلو بدلے۔ انھوں نے گلاب سے مہکی ہوئی مزید ہوا اپنی سانسوں میں اتاری۔

جنرل ضیا نے اپنے فولڈر سے قرآن کی ایک نیلے رنگ کی چھوٹی سی جلد باہر نکالی، اپنے مطالعے کا چشمہ چڑھایا اور تلاوت شروع کی۔ تمام کمانڈر احترام سے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے اور خاموشی سے سن رہے تھے؛ کچھ نے اپنے ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے اور سوچنے لگے کہ کیا وقت نہیں آ گیا تھا کہ وہ خدا کی نافرمانی کا مزہ چکھ سکیں۔

تلاوت تین منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ جنرل ضیا کی آواز ڈرانے جیسی تھی، لیکن قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے میں ایسا کچھ ہے کہ بہت بھدی آواز بھی ایسے میں قابلِ برداشت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس نے تلاوت ختم کی اور قرآن کی جلد اپنے بائیں جانب بیٹھے جنرل کو تھما دی۔

'چوں کہ جنرل اختر بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں، میں ان سے درخواست کروں گا کہ ان لوگوں کے لیے اس کا ترجمہ کر دیں جنھیں عربی سمجھ میں نہیں آتی۔'

یہ کیا بکواس بات ہے۔ نیول چیف نے سوچا۔ ہم میں سے تو کسی کو بھی عربی نہیں آتی۔

جنرل اختر نے رُک رُک کر پڑھنا شروع کیا: 'میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو بڑا پاک، بڑا رحم کرنے والا ہے۔' وہ ترجمہ پڑھ رہا تھا تو جنرل ضیا پلک جھپکے بغیر اسے گھورتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے سنانا ختم کیا، جنرل ضیا نے جلد اس کے ہاتھ سے لے لی اور اپنے جرنیلوں کے سامنے اسے اونچا کر کے دکھانے لگا۔

'آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نے جو حصّہ آپ کو سنایا ہے، یہ کیا کہتا ہے؟' ایک لمحے تک خاموشی طاری رہی۔ جنرل بیگ نے رومال کے پیچھے اپنی ناک سُڑکی۔ 'کم آن، بتائیے۔' جنرل ضیا نے اپنی آواز بلند کر دی۔ پھر اس نے اپنے حکم کی خود تعمیل کی: 'عربی میں یہاں کہا گیا ہے کہ "اللہ کے نام پر"۔ یہاں یہ نہیں لکھا گیا کہ گاڈ کے نام پر، نہ یہ لکھا گیا ہے کہ دیوتاؤں کے نام پر، نہ ہی یہاں کسی بے نام بت کا کوئی تذکرہ ہے۔ یہاں لکھا ہے: "اللہ کے نام سے"۔' اس نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ 'یہاں مجھے اپنے بھائیوں کو یاد دلانے دیجیے کہ مسلمان بننے کے لیے ایک غیر مسلم کو سب سے پہلی چیز جو کہنا ہوتی ہے، اور وہ پہلا ایمان کا کلمہ جس کی گواہی ہر ایمان والے کو دینا پڑتی ہے، یہ ہے کہ: نہیں ہے کوئی خدا سوائے۔۔۔' اس نے پھر وقفہ کیا اور میز کے گرد اس توقع سے دیکھا کہ کوئی وہ پہلا کلمہ مکمل کر دے گا۔ کوئی نہیں بولا۔ اس نے دُہرایا۔ 'نہیں ہے کوئی خدا سوائے۔۔۔'

'اللہ۔' وہ سب اسکول کے ایسے بچوں کی طرح بُڑبُڑائے جنھیں ٹھیک سے یہ نہ پتا

ہو کہ ان سے پوچھے جانے والے سوال میں کوئی چال تو نہیں۔

'جی ہاں۔' جنرل ضیا نے میز پر مُکا مارتے ہوئے کہا۔ 'میرے پیارے جرنیلو، آپ کا احتجاج اور تجاویز سننے سے پہلے مجھے ایک بات واضح کر لینے دیں: نہیں ہے کوئی خدا، سوائے اللہ کے۔ اور چوں کہ خود اللہ کہہ رہا ہے کہ نہیں ہے کوئی خدا، اس لیے چلیے اس لفظ کو ہی ختم کیے دیتے ہیں۔ یہ دھوکا دینا چھوڑ دیتے ہیں کہ گاڈ اللہ ہے۔ یہ ایک مغربی تصور ہے، جو یہ بات سمجھنے میں مشکل پیدا کرنے کا آسان طریقہ ہے کہ خالق کون ہے اور فنا کرنے والا کون۔ ہم تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں، خصوصاً عیسائیت اور یہودیت کے مذاہب کا۔ لیکن کیا ہم انھی کے جیسا بننا چاہتے ہیں؟ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ کیا ہم یہ یقین کر لیں کہ جب بی بی مریم سو رہی تھیں تو کوئی خدا... یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کو قریب قریب اپنا خدا ہی کہتے ہیں۔ آپ لوگ سوچیں گے کہ ہمارے لوگوں کے لیے بھی ایک ہی بات ہے چاہے گاڈ ہو یا اللہ، سیم ڈفرنس؟ اس نے ہونٹ سکیڑ کر انگریزی بولنے کے اس انداز کی نقل اتاری جو اس کے بہت سے جرنیلوں کو پسند تھا۔' لیکن انھیں بتائے گا کون کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، کسی اور خدا پر نہیں؟ کیا اللہ نے ہمیں منتخب نہیں کیا کہ ہم اس مخمصے کو ختم کریں؟' پھر بعد میں آئے ہوئے ایک خیال کے تحت اس نے اپنے ساتھی جرنیلوں کے جذبۂ حب الوطنی کو آواز دی۔ 'ہندو بھی اپنے چھ چھ بازوؤں والے عفریتوں کو خدا کہتے ہیں۔ کیا یہ دلیل کافی نہیں کہ گاڈ اور خدا جیسے لفظوں سے پرہیز کیا جائے؟ اور اگر آپ میں سے کسی کو یہ تشویش ہے کہ لوگ گاڈ اور اللہ میں فرق پہچان نہیں سکیں گے تو میری تجویز یہ ہے کہ یہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔'

اس کی مختصر تقریر کے بعد جو مکمل سکوت طاری ہوا اس نے جنرل ضیا کو مطمئن کیا۔

'کیا اب ہم نیول چیف کا احتجاج سماعت کر سکتے ہیں؟'

نیول چیف جس پر خدا کے نام سے متعلق لیکچر کے اثرات ابھی زائل نہیں ہوئے تھے، اچانک خود کو بہت حقیر محسوس کرنے لگا۔ پورا ملک اللہ کو ہر قسم کے غلط نام سے پکار

رہا تھا اور ایک وہ تھا جسے پروٹوکول کی ذرا سی خلاف ورزی کی پڑی تھی۔

وہ جرنیل جو ضیا کو اس کی پیٹھ پیچھے مُلّا کہا کرتے تھے، اس کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگانے پر شرمندگی محسوس کر رہے تھے: نہ صرف یہ کہ وہ ایک مُلّا تھا بلکہ ایک ایسا مُلّا تھا جس کا مذہب کا فہم اس سنی سنائی کو طوطے کی طرح دُہرا دینے سے زیادہ نہیں تھا جو وہ دوسرے مُلّا سے سنتا تھا۔ بغیر داڑھی کے مُلّا، چار ستارہ جرنیل کی وردی میں مُلّا، ایک بدعنوان ٹیکس انسپکٹر کی سی جبلّت رکھنے والا مُلّا۔

باقی لوگ میز کے گرد حیران بیٹھے تھے اور اُس سب کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جو انھوں نے ابھی ابھی سنا تھا۔ اگر جنرل ضیا ان کے ذہن پڑھ سکتا تو اسے وہاں یہ تحریر لکھی ہوئی نظر آتی:

- یہ پڑھایا ہے اسے سینڈھرسٹ والوں نے؟
- وہ ملک جس کے عوام سوچتے تھے کہ اسے خدا نے تخلیق کیا ہے اسے بالآخر وہ مل ہی گیا جس کے وہ مستحق تھے: ایک بڑبڑانے والا احمق جو سمجھتا ہے کہ اللہ نے اسے اپنا نام صاف کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔
- بات تو منطق کر رہا ہے۔ مجھے اس کا پہلے کبھی خیال کیوں نہیں آیا؟
- وہ اپنا ڈپٹی کسے بنائے گا؟
- یار یہ میں فوجی کمانڈروں کے اجلاس میں ہوں یا گاؤں کی کسی مسجد میں؟
- میں اپنے گھر میں گاڈ کے نام پر پابندی لگا دوں گا۔
- ہمیں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ اس وردی میں ایک کلامی نابغہ بیٹھا ہوا ہے۔
- یار اب ایجنڈے پر بھی بات ہو جائے؟ ہم نے ابھی ابھی ایک بلڈی سویلین حکومت کا تختہ الٹا ہے، آخر ہم اس ملک کو چلائیں گے کیسے؟ کیا اللہ خود نیچے اتر کر ان بلڈی سڑکوں پر گشت فرمائے گا؟

واحد آدمی جس نے اپنے خیالات کو زبان دی، جنرل اختر تھا۔ ایک سابق مڈل ویٹ

باکسر، قبائلی پس منظر رکھنے والا ایک داڑھی مونچھ مُنڈا آدمی جو سپاہیانہ وقار سے اس قدر بھرپور تھا کہ وہ دنیا کے پانچ آباد برِاعظموں میں سے کسی کے بھی کسی ملک میں پیدا ہو جاتا، وہاں جنرل ہی بنتا۔ فوجی وقار کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس میں اپنے سینئر کے تلوے چاٹنے کی بھی ایسی صلاحیت تھی کہ خندقوں میں مشہور ہو جانے والے ایک لطیفے کے مطابق وہ دشمن کے ایک پورے یونٹ کو ان کی پیٹھ چاٹ چاٹ کر ختم کر سکتا تھا۔

دوسرے جرنیلوں نے سوچنا چھوڑ دیا اور جنرل اختر کو سننے کے لیے اپنی کرسیوں پر آگے ہو کر بیٹھ گئے۔ 'اللہ کے کرم سے آپ اس ملک کو تباہی کے دہانے سے بچا کر لے آئے ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے آپ نے اس ملک کو اُس وقت بچایا جب سیاست دان اسے چٹان کے کنارے سے دھکا دینے ہی والے تھے۔ میں شکر ادا کرنا چاہتا ہوں۔۔' اس نے اپنے آپ کو روک لیا کیوں کہ وہ خدا کا شکریہ ادا کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے کٹے باز ہاتھوں کو سبز فولڈر پر احترام سے دھرا۔ 'میں شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اللہ کا اور ہمارے صاحب بصیرت چیف آف اسٹاف کا جنھیں اللہ نے یہ فہم عطا کیا کہ وہ درست وقت پر درست فیصلہ کر سکیں۔' اس نے مزید بولنے سے پہلے میز پر اردگرد دیکھا۔ 'میں اس میز کے گرد بیٹھے اپنے بہت ہی پیشہ ور کمانڈروں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہمارے چیف کے حکم پر اس گو کو ایسے نظم و ضبط کے ساتھ عملی جامہ پہنایا کہ ایک بھی گولی نہیں چلانی پڑی، اور خون کا ایک بھی قطرہ نہیں بہانا پڑا۔'

کمرے میں طاقت کا توازن اچانک تبدیل ہو گیا اور آٹھ آدمی، مذہب سے اپنی وابستگی کی مختلف سطحیں رکھنے کے باوجود، اور وھسکی اور خواتین کے مختلف النوع ذوق کے باوصف اور انگریزی کے مختلف لہجوں کے لیے ترجیح کے ہوتے ہوئے ایک ہی نتیجے پر پہنچ گئے: جنرل اختر ان پر بازی لے گیا تھا۔ یہ لفظ تو انھیں ادا کرنے چاہیے تھے۔ کمرے میں پھیلی ہوئی گلاب کی خوش بو اچانک باسی محسوس ہونے لگی۔ جنرل بیگ نے اپنی ناک پونچھی اور اپنا رومال پھر سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کانفرنس آگے بڑھی اور اس میں اب ایجنڈے یعنی ملکی سرحدوں کے تحفظ، گو کے لیے قانون کی اوٹ کے حصول اور ایسے سیاست دانوں کی فہرستوں کی تیاری پر غور ہونے لگا جن پر فوجی حکومت کی حمایت کے لیے اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ جنرل ضیا نے آگے آنے والی اچھی چیزوں کی جانب اشارہ بھی کیا: مجھے صوبوں کے لیے گورنروں کی ضرورت ہے، مجھے وزارتوں کے لیے وزرا کی ضرورت ہے۔ میں کس پر بھروسا کر سکتا ہوں، سوائے ان پیشہ ور سپاہیوں کے جو اس میز کے گرد بیٹھے ہیں۔

وہ اُٹھے اور زیادہ پر یقین ہو کر کمرے سے باہر نکلے، لیکن کسی نے بھی اپنے چیف کا پیغام بھلایا نہیں۔ اگلے گیارہ برسوں میں ان جرنیلوں میں سے بہت سوں کو ریٹائر ہونا تھا۔ کچھ صوبوں کے گورنر بنیں گے، باقی کی جگہ ان کے جونیئر لے لیں گے۔ دو چیزیں ایسی تھیں جو ایجنڈے پر نہیں تھیں، لیکن بعد میں آنے والی ہر قیامت کو سہار گئیں۔ جنرل اختر تب تک جنرل ہی رہا جب تک وہ مر نہیں گیا، اور خدا کے باقی تمام نام قوم کی یادداشت سے آہستہ آہستہ خارج ہو گئے، جیسے دھرتی پر کوئی ہوا چلی ہو جو انھیں اُڑا لے گئی ہو۔ بے ضرر اور جانے مانے سے نام: فارسی کا خدا جو غزل کے شاعروں کے لیے بہت کار آمد ہوا کرتا تھا کیوں کہ یہ زیادہ تر افعال کا ہم صوت تھا؛ رب، جسے غریب لوگ مصیبت کے وقت بلاتے تھے؛ مولا، جسے صوفی لوگ حشیش کی محفل کے دوران پکارتے تھے۔ اللہ نے خود کو ننانوے نام دیے تھے۔ اس کے لوگوں نے مزید کئی نام گھڑ لیے تھے۔ مگر یہ تمام نام آہستگی سے غائب ہونا شروع ہو گئے: سرکاری کاغذات سے، جمعے کے خطبوں سے، اخبارات کے اداریوں سے، ماؤں کی دعاؤں سے، تہنیتی کارڈوں سے، سرکاری رقعوں سے، ٹیلے وژن پر کوئز شو کرنے والے میزبانوں کے ہونٹوں سے، بچوں کی کہانیوں کی کتابوں سے، محبت کرنے والوں کے گیتوں سے، عدالتی احکامات سے، ٹیلے فون آپریٹروں کے خوش آمدیدی کلمات سے، حبسِ بے جا کی درخواستوں سے، بین المدارس تقریری مقابلوں سے، کرکٹ کے کھلاڑیوں کی گالیوں سے؛ حتیٰ کہ بھیک کے لیے لگائی گئی

گداگروں کی صداؤں سے بھی۔

خدا کے نام پر، خدا کو دھرتی سے دیس نکالا دے دیا گیا اور اس کی جگہ اللہ وحدہٗ لاشریک نے لے لی جو، جنرل ضیا نے خود کو یقین دلایا کہ صرف اسی کے ذریعے بولتا تھا۔ لیکن آج، گیارہ سال بعد، اللہ اسے کچھ ایسی نشانیاں بھیج رہا تھا جو ایک ایسی تاریک، اور ایسی حتمی جگہ کی جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ جنرل ضیا نے آرزو کی کہ وہ اس کتاب میں کوئی شک کرنے کی ہمت پیدا کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر آپ کے پاس حضرت یونسؑ جیسی رجائیت نہ ہو تو کسی وہیل کا پیٹ آپ کی آخری آرام گاہ بن سکتا ہے۔

جب امام نے نماز کے بعد دعا پڑھنی شروع کی تو جنرل ضیا کو یہ بات محسوس کرنے میں ایک لمحہ لگا کہ اسے ایک مرتبہ پھر حضرت یونسؑ کی کہانی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسے یہ محسوس کرنے میں ایک لمحہ لگا کہ امام نے اس سے پہلے فجر کی نماز میں وہ آیت کبھی نہیں پڑھی تھی: وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دوسرے نمازی اپنی نماز میں مشغول رہے۔ انھیں کبھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ ایسا اپنی عقیدت کی شدت کی بنا پر کرتا تھا، اپنے دماغ کو مشغول رکھنے والے ریاستی امور کی وجہ سے کرتا تھا یا خاتونِ اوّل کی جانب سے کسی اور زبانی ڈانٹ ڈپٹ کی بنا پر۔ ہر ایک نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ صدارتی آنسوؤں کو نظرانداز کر رہا ہو۔ جنرل ضیا نے اپنا چہرہ بائیں جانب موڑا، پھر اپنا چہرہ دائیں جانب موڑا، پوری دنیا کو دعا دی اور جنرل اختر کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بولنا شروع کیا، لیکن اس کے الفاظ اس کی رندھی ہوئی آواز میں دب کر رہ گئے۔ جنرل اختر نے جنرل ضیا کا ہاتھ دبایا اور اسے پیٹھ پر تھپکی دی تاکہ وہ پُرسکون ہو جائے۔ بالآخر اس کے منھ سے الفاظ نکل آئے: 'کیا تم مہربانی کر کے میرا سیکیورٹی لیول بڑھا سکتے ہو' جنرل اختر نے پُرجوش طریقے سے سر ہلایا اور ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ ایک مُکّا باز کی گرفت سے دبایا۔ جنرل ضیا کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی، اس کی بائیں آنکھ نے ایک آنسو بہایا، اس کی دائیں آنکھ شک کے ساتھ امام کی طرف دیکھتی رہی۔ 'لیول کو بڑھا کر ریڈ کر دو پلیز'

۳

'میں نہیں چاہتا کہ انٹر سروسز انٹیلی جینس والے ہمارے کام میں ٹانگ اڑائیں' سیکنڈ او آئی سی میرے ساتھ کمانڈانٹ کے دفتر سے میرے سیل تک چلتے ہوئے بُڑبُڑاتا ہے۔' میں کہنا چاہتا ہوں۔ 'آمین، سر۔ آمین۔' لیکن اس پر ایک نظر ڈالتے ہی میں اپنا منھ بند رکھنے کا فیصلہ کر لیتا ہوں۔ وہ چپ چاپ سوچنے کے موڈ میں لگتا ہے۔ کمانڈانٹ کے دفتر میں سیکنڈ او آئی سی کی ہر پیشی اس کے کیریئر سے متعلق باقی ماندہ ذوق و شوق کچھ اور زائل کر دیتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اُس پر ترس آتا ہے۔ مجھے اس کی ڈھیلی ڈھالی چال پر ترس آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی وردی والی شرٹ کے بٹنوں سے زور آزمائی کرتے اس کے پیٹ پر تھپکی دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے جوتوں کی پھٹی پرانی ایڑیوں کی مرمت کر دوں۔

ہم اپنی وار سٹڈیز کی کلاس میں 'جنگ کا فن' پڑھ رہے ہیں اور سُن زو کے اقوالِ زرّیں کے ٹکڑے ابھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر دشمن کوئی دروازہ کھلا چھوڑ دے تو ہچکچاؤ مت، فوراً اندر چلے آؤ؟

'سر، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، اگر آئی ایس آئی کو بلانا پڑا تو یہ اکیڈمی کے لیے ذلّت کا مقام ہوگا۔' میں تشویش آمیز لہجے میں کہتا ہوں۔

'اور اس ذلّت کا ذمّے دار کون ہے؟ کون ہے جو تفتیش میں تعاون نہیں کر رہا؟' وہ

اپنی تفتیشی فائل میرے چہرے کے سامنے لہراتا ہے۔

'میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، سر۔' میں کہتا ہوں اور اپنا مُنھ بند کر لیتا ہوں، کیوں کہ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر مُڑتا ہے اور مجھے میرے سیل کی جانب لے جانے کے بجائے مسجد کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے۔

مسجد کی طرف جانے والی فالکنز روڈ میرے بوٹوں کے نیچے پگھلی جا رہی ہے۔ میرے ساتھی کیڈٹ یا تو اپنی کردار کی تعمیر والی کلاس میں ہیں یا پھر کاک پٹ کے سیمولیٹروں میں اپنی نشستوں سے بندھے ایمرجنسی لینڈنگ کی مشق کر رہے ہیں۔ اور یہاں میں ہوں جسے ایک مینڈک کی طرح مارچ کرا کے اللہ میاں کے گھر لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی تو نماز کا وقت تک نہیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ سیکنڈ اِن کمانڈ او آئی سی کوئی نمازی قسم کا آدمی بھی نہیں۔ میں بھی کوئی پرہیزگار نہیں لیکن جب سے کمانڈانٹ نے دن کی پانچوں نمازوں کو لازمی قرار دے کر ان کے لیے رول کال شروع کیا ہے، میں نے اللہ میاں کے گھر کا چند مرتبہ دورہ کیا ہے۔

عُبید کچھ روز کے لیے بہت پرہیز گار ہو گیا، حتیٰ کہ اس نے لائبریری سے میرے لیے 'صحت، دولت اور بصیرت، نماز کی مدد سے' نامی کتاب بھی لا کر دی۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مسجد میں صرف کرنے لگا۔ اس کا یہ شوق اس روز ختم ہوا جس روز ایک ڈیوٹی کیڈٹ نے اسے نماز کے دوران یوگا کی مشق کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ ایک لمحے تو وہ وہاں کنول آسن میں بیٹھا تھا، اس کے انگھوٹے اور شہادت کی دونوں انگلیاں اس کے گھٹنوں پر تھیں اور وہ اپنی کنڈلنی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسرے لمحے اس پر مسجد میں ہندو پوجا انجام دینے کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس کی جان بخشی تبھی ہوئی جب میں نے ڈیوٹی کیڈٹ کو دھمکی دی کہ اسے ہماری ویڈیو راتوں میں پھر کبھی بلایا نہیں جائے گا۔

میرا نہیں خیال کہ سیکنڈ اِن او آئی سی اپنی فائل میں شامل کرنے کے لیے مسجد سے بھی کچھ ڈھونڈ سکتا ہے۔

اگر اللہ میاں خود میرے خلاف گواہی دینے کھڑے ہو جائیں تو اور بات ہے۔

مسجد پرانی بیرکوں کی ایک قطار کو نیچے چھت والے ہال میں تبدیل کر کے بنائی گئی ہے جس پر ایک پلائی ووڈ کا مینار بھی کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ ایک عبوری انتظام ہے اور اللہ میاں کے اس نئے گھر کے آرکی ٹیکچر کا ایک ماڈل مسجد کے داخلی دروازے کے ساتھ شیشے کے ایک ڈبے میں بند ہے۔ اس ماڈل میں مسجد کا گنبد سبز ہے جس پر سنہری پٹیاں لگی ہیں، چار مینار ہیں اور پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے جسم صحن میں عبادت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ہم مسجد کے گیٹ پر رک جاتے ہیں۔ سیکنڈ او آئی سی اپنے جوتے اتارنے کے لیے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ میں کھڑا رہتا ہوں کہ مجھے پتا نہیں مجھ سے کس بات کی توقع کی جا رہی ہے۔

'تم میرے ساتھ اندر آ رہے ہو، انڈر آفیسر۔' وہ کہتا ہے۔

'میرے کپڑے پاک نہیں ہیں، سر۔' میں وہی آدھا سچ مُنھ سے اُگلتا ہوں جو میں نے لازمی نماز سے بچنے کے لیے مہینوں استعمال کیا ہے۔

'پریشانی کی کوئی بات نہیں، بس بات کرنی ہے ہمیں۔'

میرے معدے میں منفی کششِ ثقل کے اثرات محسوس ہونے لگتی ہے۔ سُن زو کو اچانک حملے کے عنصر کا علم تو تھا لیکن اس نے یہ نہیں لکھا کہ جب آپ خود اس کے شکار ہوں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔

دن کے اس وقت مسجد خالی ہے، بس شلوار قمیص اور سر پر پہنی ہوئی ٹوپیوں میں کچھ کیڈٹ ہیں جو لگتا ہے کہ تاش کی کسی بازی میں بہت شدت سے محو ہیں۔ میں ان کے چہرے نہیں پہچانتا، لیکن ان کے کپڑوں سے بتا سکتا ہوں کہ وہ کلف لگے کپڑے پہننے کی مہم کے تازہ ترین شکار ہیں۔ ہمارا کمانڈانٹ جون کی گرمی میں بھی چاہتا ہے کہ سب لوگ ڈبل کلف لگی وردیاں پہنیں، جس کے باعث یہاں خارش اور جلد کی بیماریاں عام ہیں۔ سِک بے پر ہمیشہ کیڈٹوں کی لمبی قطاریں لگی ہوتی ہیں جن کی ٹانگیں ان کی پتلونوں کی ریزر کی طرح کاٹ دار کریز سے بچنے کی کوشش میں مشقت کر رہی ہوتی ہیں اور جن کے

ہاتھ ناقابلِ رسائی جگہوں پر کھجانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ میڈیکل اسکواڈرن ان وردیوں کو صحت کے لیے خطرہ قرار دیتا ہے اور اس نے کوئی وبا پھوٹنے کے خطرے سے بچاؤ کے لیے اپنے ہی قواعد وضوابط وضع کر رکھے ہیں۔ جس کسی کو بھی کلف لگی وردی کی وجہ سے جلد کی بیماری ہو جاتی ہے، اسے نسخے پر لکھ کر دیا جاتا ہے 'کلف لگی وردی سے پرہیز۔' کمانڈانٹ کو ایکٹو ڈیوٹی پر کوئی بغیر کلف والی وردی پہننے والا گوارا نہیں اور وہ اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ لوگ اپنے ڈورم میں بیٹھے رہیں، اس لیے ان تمام کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنا دن مسجد میں گزاریں۔

'یہ سزا ہے یا انعام؟' عُبید کہا کرتا تھا۔ ہماری طبی اسٹیبلشمنٹ اور کمانڈانٹ کے درمیان اس لڑائی کے واحد فاتح خود اللہ میاں ہیں۔ مسجد میں ان دنوں جتنے عبادت گزار موجود ہوتے ہیں، پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔

جب سفید شلوار قمیص میں ملبوس ہمارے لڑکے سیکنڈ او آئی سی کو آتا دیکھتے ہیں تو وہ جلدی سے اپنے تاش کے پتے اور سکے سمیٹتے ہیں اور خود کو رمی کھیلنے والے چھٹ بھیّوں کے بجائے پرہیزگار نوجوانوں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ سیکنڈ او آئی سی انھیں تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے جیسے فقط عبادت کا بہانا بنا کر ہی انھوں نے خود کو اس کی اور اللہ میاں کی نظروں میں بخشوا لیا ہو۔ مجھے تب بھی سمجھ نہیں آتی جب وہ نماز کے مرکزی ہال کی دیوار کے ساتھ بنے کتابوں کے ریک میں سے قرآن پاک کی ایک جلد اُٹھاتا ہے، اسے میرے ہاتھ میں دیتا ہے اور وہیں کھڑا ہو کر مجھے گھورنے لگ جاتا ہے۔ میں اس کی اگلی کمانڈ کا منتظر ہوں۔

'اب اپنا دایاں ہاتھ اس پر رکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم یہ نہیں جانتے کہ عُبید کہاں غائب ہو گیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمھیں پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔'

اگر میں مسجد میں نہ کھڑا ہوتا تو اسے بتاتا کہ وہ جہنم میں جائے۔

'میں قسم نہیں کھا سکتا، سر، قرآن پاک پر نہیں۔' میں کہتا ہوں۔

'اچھا تو تم جانتے ہو اس بارے میں۔' وہ کہتا ہے۔ 'قسم اُٹھانے سے انکار کر کے تم اپنا گناہ قبول کر رہے ہو؟ دیکھو، یہاں صرف تم ہو اور میں ہوں اور اللہ کی ذات ہے۔' وہ قرآن پاک پر خود اپنا دایاں ہاتھ رکھتا ہے۔ 'مجھے سچ سچ بتاؤ اور میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ میں تمھیں اس مصیبت سے باہر نکال لاؤں گا۔'

'میرے والد نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں قرآن پر کبھی قسم نہیں اُٹھاؤں گا، چاہے مجھ سے سچی قسم ہی لی جا رہی ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر سچی قسم اُٹھا رہا ہوں تب تو بالکل نہیں۔' میں تھکی تھکی آواز میں کہتا ہوں اور میری انگلیاں قرآن کے مخملیں سرپوش کے گرد پسینے سے بھیگنے لگی ہیں۔

'تمھارے والد نے تو زندگی میں کبھی نماز ہی نہیں پڑھی۔' وہ کہتا ہے۔

'آپ ٹھیک کہتے ہیں، سر، لیکن وہ روحانیت پر بہت یقین رکھتے تھے۔ وہ قرآن پاک کا بہت احترام کرتے تھے اور دنیاوی کاموں میں اسے کبھی استعمال نہیں کرتے تھے،' میں کہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کرنل شگری خود کو روحانیت پر یقین رکھنے والا شخص بیان کیے جانے پر کیا کہتے۔

کرنل صاحب ایک بے قرار روحانی دور سے ضرور گزرے تھے جس کے دوران وہ آدھی رات کے وقت وِسکی پینا بند کر کے اپنی باقی راتیں قرآن کی تلاوت میں صرف کرنے لگے تھے۔ اور انھوں نے واقعی مجھ سے کہا تھا کہ کبھی اس پاک کتاب پر قسم نہ اُٹھاؤں۔ لیکن ان کا یہ روحانی سفر اتنی دیر جاری ہی نہ رہ سکا کہ کسی کو معلوم ہو سکتا کہ یہ سفر، خود ان کے اپنے الفاظ میں 'کوئی قلبِ ماہیت تھی یا صرف مُنھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔' جس صبح وہ خود اپنے ہی بستر کی چادر کے ساتھ چھت کے پنکھے سے لٹکے ہوئے پائے گئے، ان کے مطالعے کی ڈیسک پر قرآن کی ایک جلد کھلی پڑی تھی۔

چھت کا پنکھا۔

بستر کی چادر۔

آنکھوں کے حلقوں سے ان کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی۔

کرنل صاحب کا وزن پوراٹن تو ہوگا ہی۔ فزکس کے قوانین کا کیا ہوا؟

'کچھ لوگ اپنی قبر خود کھودنے پر اصرار کرتے ہیں۔' سیکنڈ او آئی سی قرآن میرے ہاتھ سے چھین لیتا ہے اور اسے واپس شیلف میں رکھ دیتا ہے۔

'سر، مجھے واقعی کچھ نہیں معلوم، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے ڈھونڈنے میں آپ کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔' میں اس ساری صورتِ حال میں خود اپنا پیدا کردہ حیرت کا عنصر داخل کرنے کی بے قراری سے کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

'مت چ چ۔۔' وہ کہنا شروع کرتا ہے لیکن پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ تو مسجد میں ہے۔

'چلو نکلو اور مسجد کے باہر فال ان ہو جاؤ۔' وہ کلف لگی وردی کے شکار لڑکوں پر چلّا کر کہتا ہے۔

'میں نہیں جانتا کہ کمانڈانٹ صاحب اس معاملے میں آئی ایس آئی کو کیوں ملوث کرنا چاہتے ہیں۔' میں کہتا ہوں۔ 'کیوں کہ، سر، آپ جانتے ہیں کہ عُبید میرا دوست ہے اور آپ ہی کی طرح میں بھی یہ سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں گیا اور کیوں گیا؟' سُن زو نے ہمیں تربیتی جنگ جوؤں کی ہماری حیثیت میں ہمیں جو کچھ سکھایا تھا، اسے پاؤں تلے روندتے ہوئے میں کہتا ہوں۔

'بکواس بند کرو' وہ بھونک کر کہتا ہے۔ 'مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے تمھارے جذبات سے۔'

وہ باہر نکل جاتا ہے اور سفید شلوار قمیص میں ملبوس کیڈٹوں پر پل پڑتا ہے۔

'اچھا تو تم خدا کے گھر کو جوا خانہ بنا رہے ہو۔۔۔'

مسجد جانے میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس سے کبھی کبھار مجھ جیسے گناہ گاروں کو

بھی سکون مل جاتا ہے۔ اب معاملہ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کرنل شگری اپنے روحانیت والے دور میں کہا کرتے تھے۔

مجھے سیل میں دوسری رات ہے اور میں ابھی سے یہاں گھر جیسا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ڈنر دیا گیا ہے۔ میں فرسٹ ٹرم والے لڑکے کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیتا ہوں اور چکن کا سالن، چاول اور کھیرے کا سلاد کھانے میں خود کو مصروف کر لیتا ہوں۔ جب تک میں کھانا ختم کرتا ہوں، کیڈٹ کوک کی ایک بوتل اور دو گولڈ لیف سگریٹوں کے ساتھ واپس آ جاتا ہے۔ میں دو بڑے بڑے گھونٹ بھر کر بوتل ختم کرتا ہوں اور گولڈ لیف سلگاتا ہوں جبکہ دوسرے سگریٹ کو بعد کے وقت کے لیے سنبھال لیتا ہوں۔

'تمھیں کوئی میگزین وغیرہ ملتے ہیں؟' میں ڈیوٹی کیڈٹ سے پوچھتا ہوں۔

وہ غائب ہو جاتا ہے اور ریڈرز ڈائجسٹ کی ایک سال پرانی کاپی کے ساتھ واپس آتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ ذرا کم انٹلیکچوئل قسم کی چیز لائے گا۔ لیکن بھئی قیدی اپنی تفریح کا انتخاب خود تو نہیں کر سکتے نا۔ ڈیوٹی کیڈٹ ڈنر کی ٹرے کے ساتھ چلا جاتا ہے اور مجھ سے ماچس کی ڈبیا لینا بھول جاتا ہے۔

ایک دن اس چوتیا کا بھی کورٹ مارشل ہوگا۔

اپنا گولڈ لیف کے سگریٹ کا ٹکڑا بجھاتے ہوئے میں اپنے جوتے، بیلٹ اور شرٹ اتارتا ہوں اور رات کی تیاری کرنے لگتا ہوں۔ میں سب سے پہلے 'وردی والوں کے لطیفے' پڑھتا ہوں۔ ان میں کچھ بھی ہنسنے کے قابل نہیں۔ رسالے میں خاتون کی واحد تصویر نینسی اور رونلڈ ریگن سے مُتعلق ایک فوٹو فیچر میں ہے جس کا عنوان ہے 'جب وہ جوان تھے'۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بھی نینسی کی شکل کسی بڈھی بلی کی گاف جیسی لگتی تھی۔ اکیڈمی کے سینسر والوں نے اچھا کیا کہ اس کے نا موجود پستانوں کو مٹانے کے لیے ان پر سیاہ مارکر پھیر دیا۔ اتنے مایوس کن وقت میں بھی میں ان تصویروں کا صفحہ پلٹ دیتا ہوں اور 'کولڈٹز سے فرار' کی تلخیص پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

میں اسے آدھا پڑھ کر چھوڑ دیتا ہوں اور اپنی صورتِ حال کا موازنہ لیفٹیننٹ رولٹ کی صورتِ حال سے کرتا ہوں۔ مجھ پر یہ ظاہر ہے کہ میری صورتِ حال بدتر ہے۔ اگر میں اپنے فوم کے گدّے اور ماچس کی تیلیوں کی مدد سے ایک ہینگ گلائیڈر بنا بھی لوں تو کودوں گا کہاں سے؟

میں دلچسپی تلاش کرنے کی آخری کوشش میں صفحات پلٹتا ہوں۔ 'زندگی تو ایسی ہی ہے' کی ذیل میں کسی شیری سلیون سے مُتعلق ایک پانچ لائنوں کی حکایت ہے جو ایک اوورآل پہن کر اپنی کار دھو رہی تھی کہ اس کے پڑوسی نے اسے اس کا شوہر سمجھ لیا۔ اس نام کا مجھ پر کچھ اثر ہوتا ہے اور میری فوجیں اچانک مارچ شروع کر دیتی ہیں۔ میں گدّے میں موجود سوراخ سے پرہیز کرتا ہوں۔ ایسے سوراخ ہائی وے پر ملنے والی رنڈیوں جیسے ہوتے ہیں، گندے اور تھکے ہوئے۔

شیری سلیون کے ساتھ میری ملاقات جذبات کے ایسے شدید جھٹکوں میں اختتام پذیر ہوتی ہے کہ میں گولڈ لیف کا دوسرا سگریٹ پھونکنا بھول جاتا ہوں اور ایک ایسی پُرسکون نیند سو جاتا ہوں کہ میرے ٹیکنی کلر خوابوں میں سیکنڈ او آئی سی میرے بوٹ پالش کرنے لگتا ہے اور کمانڈانٹ اپنی زبان کی نوک سے میری تلوار چمکانے لگتا ہے۔ کیپٹن رولٹ کا ہینگ گلائیڈر حفاظت سے ٹرافالگر اسکوائر پر لینڈ کر جاتا ہے۔

صبح اور بھی شان دار ہے۔ میں اولڈ سپائس کی خوش بو کے جھونکے سے بیدار ہوتا ہوں۔ لوٹ بینن دروازے پر کھڑا ہے۔ 'جاگو جاگو، پیارے قیدی۔'

میرے پاس تقریباً ایک سو پچاس چیزیں ہیں اس سے پوچھنے کے لیے۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی اچھے موڈ میں ہے۔

'بڑا اچھا گدّا ملا ہوا ہے بھئی تمھیں یہاں۔' وہ کہتا ہے۔

'یہ اتنا برا نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔' میں کہتا ہوں۔ 'آپ نے اپنے لیے نیا سائلنٹ ڈرل کمانڈر تو ڈھونڈ لیا ہوگا؟' طنز کرنے کی میری کوشش نظر انداز کر دی جاتی

ہے۔ میں اپنا دوسرا گولڈ لیف سلگا لیتا ہوں۔

'آئی سی، تمھاری سپلائی لائنز محفوظ ہیں۔' اب مذاق کرنے کی باری اُس کی ہے۔

'کیا عُبید نے آپ کو کچھ بتایا تھا؟' میں پوچھتا ہوں۔ میرا روزمرہ بات چیت جیسا لہجہ مجھے حیران کر دیتا ہے۔ خالی پیٹ گولڈ لیف پینا مجھے ہمیشہ ایک لاتعلُّق مفکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے اور عُبید کو ہماری پیٹھ پیچھے کیا کہتے ہیں۔

فورٹ بریگ کی کتیائیں۔

صرف اس لیے کہ ہم بینن کے یار ہیں۔ اگرچہ بینن محض ایک ڈرل انسٹرکٹر ہے جو فورٹ بریگ سے آیا ہے، محض ایک لیفٹیننٹ، مگر اکیڈمی کی فوڈ چین میں اسے کسی شارک اور دھاری دار چیتے کے درمیان کی کوئی قسم سمجھا جاتا ہے۔

'بے بی او لام پر گیا ہوا ہے۔' وہ ایسے کہتا ہے جیسے بلڈی بریکنگ نیوز سنا رہا ہو۔

میں سگریٹ سے ایک آخری طویل کش بھرتا ہوں، ایک جلتا ہوا سانس سینے میں کھینچتا ہوں اور یکا یک کھانسنے لگتا ہوں۔

'میں اپنی روٹین کے مطابق آج سہ پہر جناب کمانڈانٹ سے ملنے والا ہوں۔ اس کے بعد میرے پاس تمھارے لیے کوئی ٹاپ کی انفارمیشن ہوگی۔' وہ اچانک ایک لاتعلُّق یانکی بن گیا ہے۔

'اور بائی دا وے، کمانڈانٹ صاحب چاہتے ہیں کہ تم سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کے ساتھ اپنا اچھا والا کام جاری رکھو۔' وہ کہتا ہے۔

اپنے سکون کے اس لمحے میں مَیں فلسفے کے ساتھ جڑا رہنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

'تمھیں پتا ہے سُن زو نے کیا کہا تھا؟ اپنے دشمن کو انتظار کرا کرا کے تھکا دو تو تم آدھی جنگ جیت لو گے۔'

'کیا اُس بڈّھے چنک نے واقعی یہ کہا تھا؟'

'اگر اس نے اس سیل میں ریڈرز ڈائجسٹ پر مشت زنی کر کے رات گزاری ہوتی تو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوتا۔'

جب میں گارڈ روم سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہوں اور دنیا کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہوں جن سے اسے پیرول پر رہا ہونے والا ایک قیدی ہی دیکھ سکتا ہے تو میرا سامنا اپنی آزادی کی حدود سے ہوتا ہے۔ ملٹری پولیس کا ایک درمیانی عمر کا سپاہی ایک پرانی سی این فیلڈ تھری ناٹ تھری رائفل لیے میرا انتظار کر رہا ہے۔

'مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھاری کڑی نگرانی کروں۔' وہ کہتا ہے۔ مجھے اس کی توقع کرنی ہی چاہیے تھی؛ وہ مجھے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دینے والے۔ حیرت کی بات صرف یہ ہے کہ بینن اس انتظام سے متعلق مجھے آگاہ کرنا بڑی سہولت سے بھول گیا تھا۔ بینن کی یادداشت میں اس سے زیادہ سوراخ ہیں جتنے کسی بہت استعمال کیے جانے والے شارٹ رینج شوٹنگ ٹارگٹ میں ہوتے ہیں۔

اب دیکھتے ہیں میرا گارڈ کتنا تیز دوڑ سکتا ہے۔

پریڈ اسکوائر تک پہنچنے کے لیے کافی وقت ہے۔ غالباً میں ماتمی مارچ کرتا ہوا اپنے ڈورم تک جا سکتا ہوں، وہاں آرام سے نہا سکتا ہوں اور اس کے بعد بھی پریڈ کے لیے وقت پر پہنچ سکتا ہوں، لیکن میں خود میں توانائی کی ایک لہر سی محسوس کرتا ہوں اور ڈبل کرتا ہوا حرکت شروع کر دیتا ہوں اور میرا گارڈ اور اس کی تھری ناٹ تھری رائفل میرے ہم رفتار ہونے کے لیے بھرپور کوشش کرنے لگتے ہیں۔ صبح کی ہوا میری معاونت کرتی ہے اور میں اچانک اڑنے لگتا ہوں۔ میرے اور میرے گارڈ کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگتا ہے۔ نئے رنگروٹوں کی ایک فارمیشن میرے قریب سے گزرتی ہے اور وہ مجھے ایک نئی زندگی شروع کرنے والوں کے سے جوش و جذبے کے ساتھ سٹرینتھ فائیو کی سطح پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ 'شاباش، جوانو۔ ملک کو ضرورت ہے تمھاری۔' میں چلّا کر انھیں جواب دیتا ہوں۔

میں ٹیلے فون کے پول پر چومتی کووں کی ایک جوڑی کو سیٹی مارتا ہوں۔ ہمارا بوڑھا

دھوبی جو اپنی گدھا گاڑی پر ہماری لانڈری لے جا رہا تھا میرے بلند آواز سلام پر اپنی اونگھ سے چونک کر اُٹھ جاتا ہے: 'صبح بخیر انکل سٹارچی، ذرا سفید والے کپڑے احتیاط سے، ہاں۔'

میرے اسکواڈرن میں لڑکے سویرے کی ڈریس انسپکشن کے لیے پہلے ہی سے قطار بنائے کھڑے ہیں۔ جمائیاں لیتے ہوئے چھپاسی چہرے مجھے اتنی صبح دوڑ لگاتے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ کسی ٹارمک پر بہت دیر تک بھلا کر چھوڑ دیے جانے والے طیارے کے چُر چُر کرتے پہیوں کی طرح فوراً ہوشیار پوزیشن میں آ جاتے ہیں۔

میں فارمیشن کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں اور اپنی جگہ پر اچھلنا شروع ہو جاتا ہوں۔ 'کم آن، آنکھیں کھولو۔' میں چلّاتا ہوں۔ 'میں ایک دن کے لیے غائب کیا ہوا تم لوگ رن زنانے بن گئے۔ فیوری اسکواڈرن کی اسپرٹ کہاں گئی تمھاری؟'

کسی اور کمانڈ کے بغیر ہی وہ میرے ساتھ اچھلنے لگتے ہیں، پہلے کچھ ہچکچاتے ہوئے، پھر میرے ردھم کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ہی جگہ پر کھڑے ہو کر دوڑنے کی مشق کرنے لگتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ ان کے سینوں کی سطح پر رکھے قطاروں کا معائنہ کرتا ہوں اور جلد ہی وہ سب میرے ہاتھ کو چھونے کے لیے اپنے گھٹنے بلند کرنے لگتے ہیں۔

وہ مجھے واپس پا کر خوش ہیں۔

جیسے ان چوتیوں کے پاس اپنی بھی کوئی چوائس ہو۔

پولیس گارڈ کونے میں کھڑا رہتا ہے جس کی سانسیں دوڑنے کے باعث اب تک ناہم وار ہیں اور جو اپنے قیدی کے اس والہانہ استقبال پر کچھ حیران سا ہے۔

'داہنے مُڑ۔ جلدی چل۔' میں حکم دیتا ہوں۔ 'اسکوائر میں ملتے ہیں، بوائز۔'

میں پولیس گارڈ کی طرف دیکھے بغیر اپنے ڈورم کی جانب دوڑ لگا دیتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اتنا ہی ہوشیار ہے یا نہیں جتنا وہ نظر آتا ہے۔ اور وہ مجھے آخر کس چیز سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے؟

وہ میرے پیچھے پیچھے آتا ہے۔ وہ ڈھکّن میرے کمرے تک میرا پیچھا کرتا ہے اور دروازے کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے، اور اب تک بہت الرٹ ہو چکا ہے۔ میں اپنی الماری کھولتا ہوں اور اپنی آنکھ کے کونے سے عُبید کے بستر کی جانب دیکھتا ہوں۔ وہاں ایک سرمئی کمبل پر ایک کڑک سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی ہندو بیوہ سوگ میں بیٹھی ہوئی ہو۔ میں ایک لمبی سی سانس بھرتا ہوں اور اپنی الماری کا جائزہ لیتا ہوں۔ یہاں میری ساری کی ساری زندگی چھوٹی چھوٹی نفیس ڈھیریوں میں پڑی ہے: وردی والی شرٹیں بائیں جانب، پتلونیں دائیں جانب، پی کیپ سے دائیں کے زاویے پر کاندھے پر لگانے والی میری انڈر آفیسر والی سنہری جھالر، ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ ٹوتھ برش اور شیونگ کے پیالے پر توازن سے رکھی میری شیونگ کریم اور اس کے متوازی پڑا میرا شیونگ برش؛ میری روزمرہ زندگی کے تمام نمونے الماری کے معیاری مینوئل کے مطابق دکھائی دے رہے ہیں۔ میں دراز کھول کر وہ چیز چیک کرتا ہوں جس کا مجھے پہلے ہی سے علم ہے۔ وہ اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔ میں الماری کے دروازے پر اندر کی جانب لٹکنے والی تلوار کو دیکھتا ہوں۔ اس کے پھندنے دار دستے سے نکلا ہوا ایک سبز رنگ کا ریشمی دھاگا اس کی نیام کے بالائی جانب بس ایسے ہی باندھ دیا گیا ہے؛ میں نے اسے بالکل اسی طرح چھوڑا تھا۔ میں عُبید کے بستر کی جانب جانے کا سوچتا ہوں۔ میرا گارڈ بھی بستر کی جانب دیکھتا ہے۔ میں کپڑے اتارنا شروع کر دیتا ہوں۔

میرے ہاتھ میری شرٹ کے سامنے کی جانب نچلے حصے کی طرف بڑھتے ہیں اور بٹن کھولنے لگتے ہیں جبکہ میں تیزی سے اپنی آپشنز پر غور کرتا ہوں۔ میں پیچھے دیکھے بغیر اپنی شرٹ اپنے کاندھے کے اوپر سے اچھال کر پھینک دیتا ہوں اور اپنی بنیان اپنی پتلون سے باہر نکال لیتا ہوں۔ گارڈ اپنا وزن دوسرے پیر پر منتقل کرتا ہے، اس کی انگلیاں اس کی پرانی دھرانی رائفل کی نال کے اردگرد کچھ ٹٹولتی ہیں۔ ڈھکّن کا ہلنے جلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس کی جانب مُڑتے ہوئے میں اپنی پتلون کی زپ کھول دیتا ہوں اور پھر اپنے انڈر

ویئر کے کمر بند کو اپنی انگلیوں سے نیچے کرتے ہوئے اس کی طرف جاتا ہوں۔

'انکل تھری ناٹ تھری، واقعی دیکھنا چاہتے ہو کیا؟'

وہ شرمندہ سا ہو کر چلتا ہوا کمرے سے پسپا ہو جاتا ہے۔

میں دروازے کی کنڈی لگا دیتا ہوں اور عُبید کے بستر کی جانب لپکتا ہوں۔ اس کے بستر کے ایک جانب رکھی میز کو دیکھنے کی کوئی تک نہیں۔ وہ سب کچھ لے جا چکے ہیں۔ میں گدا الٹتا ہوں۔ انھوں نے ظاہر ہے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ گدے میں ایک لازمی سوراخ کے علاوہ کچھ اور جگہیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کے ایک جانب ایک زپ ہے، میں اسے کھولتا ہوں، اپنا ہاتھ اندر ڈالتا ہوں۔ میری انگلیاں آگے اور پیچھے گھومتی ہیں اور فوم کے گدے کی مردہ اسفنجی سطح میں کچھ تلاش کرتی ہیں۔ مجھے ایک درز ملتی ہے اور میں فوم کی سرنگ میں اپنا ہاتھ ڈال دیتا ہوں۔ میری انگلیاں ریشمی کپڑے کے ایک نرم سے ٹکڑے کو چھوتی ہیں اور میں ہاتھ باہر نکال لیتا ہوں۔

عُبید کا رومال ہے یہ، جس پر گلاب کڑھے ہوئے ہیں۔ اس سے پوائزن اور عُبید کی خوش بو آ رہی ہے اور اس پر ایک پانچ اعداد کا نمبر لکھا ہوا ہے۔ یہ عُبید کی ہینڈ رائٹنگ ہے، نفیس نقطوں اور قوسوں کے ساتھ۔

جیسے وہ مجھے فون کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت دیں گے۔ اکیڈمی سے باہر کسی کا نمبر ملانے کے لیے واحد فون بِک بے میں ہے۔ اور میرا گارڈ دروازے کو بے صبری سے پیٹ رہا ہے۔

عُبید ہماری ٹریننگ شروع ہونے کے دو روز بعد وہاں پہنچا تھا اور اپنی چال ڈھال میں ایک ایسا شخص دکھائی دیتا تھا جو زندگی میں بس ایک دو قدم پیچھے رہ گیا ہو۔ میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو اس نے جعلی لیوائز کی پتلون، آکسفرڈ کے نہایت چمک دار جوتے اور ایک سیاہ ریشمی شرٹ پہن رکھی تھی جس کی جیب پر ایک لوگو بنا ہوا تھا جسے

پڑھیں تو لکھا تھا 'اُونتی'۔ اس کے بلو ڈرائی کیے ہوئے، بالکل سیاہ بالوں نے اس کے کان ڈھانپے ہوئے تھے۔ اور اگر خاکی وردی میں ملبوس پینڈوؤں کے ہجوم میں اس کے شہری بابو قسم کے سویلین ڈریس کے سبب اس کے سب سے الگ دکھائی دینے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو اس کے بندوبست ۔کے لیے اس نے اپنے کالر کے نیچے بڑی احتیاط سے فولڈ کر کے ایک رومال بھی اڑسا ہوا تھا جس پر گلاب کڑھے ہوئے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ماتھے پر آنے والے مگر نہ دکھائی دینے والے پسینے کے قطرے جذب کرنے کے لیے اس رومال کو کالر سے نکالا کرتا تھا۔ وہ اپنا تمام تر وزن ایک ٹانگ پر لیے کھڑا تھا، اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کی جینز کی جیب میں ڈلا ہوا تھا، بایاں بازو بے مقصد طریقے سے لہرا رہا تھا، پیٹھ پتلون میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ دور درختوں کے اوپر کہیں دیکھ رہا تھا جیسے اسے کسی طیارے کے ٹیک آف کرنے کی توقع ہو۔

اسے اپنی آنکھیں اس دروازے پر لگا کر رکھنی چاہئیں تھیں جہاں سے کچھ روز بعد ڈھول تاشوں کے بعد نکال دیا جانے والا سرٹونی ہماری ڈریس انسپکشن کے لیے باہر نکلا۔ اس کی کلف لگی شرٹ کے بٹن اس کی ناف تک کھلے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ اس کی بیلٹ کے بکل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ وہ ہمارے قریب پہنچا تو میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیلٹ بند کر رہا ہے، لیکن اس نے وہ لہرا کر کھول دی اور چلایا، 'اٹینشن۔' میں نے اپنی ایڑیاں جوڑیں، اپنا سینہ پھلا کر باہر نکالا، اپنے کاندھے پیچھے کیے، اپنے بازو اپنے اطراف جوڑ دیے اور عُبید کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اس نے اپنا وزن اپنے دائیں پیر پر دھرا اور اپنا بایاں انگوٹھا بھی جینز کی جیب میں اڑس لیا جیسے وہ لیوائز کے اشتہار کے لیے پوز دے رہا ہو۔ سرٹونی اس قسم کا سر تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ اتھارٹی نامکمل جملوں اور چبائے ہوئے لفظوں کا ہی نام ہے۔

'شن، باسٹرڈز، شن۔' وہ اسکواڈرن پر چارج کرتے ہوئے بھونک کر بولا۔

میری ریڑھ کی ہڈی کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی

بیلٹ لہرائی اور میری آنکھیں جھپک سی گئیں۔ میں نے اُس بیلٹ کو عُبید کی پتلون میں پھنسی ہوئی پیٹھ پر ضرب لگاتے ہوئے سنا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ عُبید بس کراہ کر ہی رہ گیا۔ اس کے گھٹنے بیٹھ گئے اور وہ زمین پر گر گیا، جب کہ اس دوران اس کا ایک ہاتھ زمین پر ٹکا اور دوسرا اپنی پیٹھ کو مزید حملے سے بچانے کے لیے بے طاقت سی کوشش کرنے لگا۔ دوسرا حملہ ہوا نہیں۔

سرٹونی نے اس کی فل ڈریس انسپکشن کی۔ اس کے کپڑوں کا سب سے پہلا حصہ جو اتارا گیا، اس کا رومال تھا جس پر گلاب کڑھے ہوئے تھے۔ سرٹونی نے اسے اپنی انگلی کے گرد لپیٹا اور اسے سونگھا۔ 'فیک فکنگ پوائزن'؛ اس نے پرفیوم کی صفت کے سلسلے میں اپنی معلومات کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ سرٹونی نے رومال عُبید کے مُنھ میں ٹھونس دیا، پھر اپنی دائیں ٹانگ بڑھائی اور اپنا بوٹ عُبید کے چہرے کے اوپر لہرایا۔ عُبید اس اشارے کا مطلب سمجھتا تھا، لیکن بہ ظاہر یہ علامت اسے اس وقت سمجھ نہیں آئی۔ وہ اپنے گھٹنوں کے بل جھکا، اپنے مُنھ سے رومال باہر نکالا اور سرٹونی کا دایاں بوٹ پونچھنے کی کوشش کی، جو اب اس کی ناک کے برابر آ چکا تھا۔ سرٹونی اپنے ہاتھ اپنی کمر پر رکھے ہم سب باقی لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہم پہلے ہی دو روز تک اس کی خرمستیوں کا نشانہ بنتے رہے تھے اور ہم جانتے تھے کہ جس کسی نے بھی اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا، وہی اس کا اگلا ہدف ہوگا، اس لیے ہم کھڑے رہے، اور آنکھیں کھول کر گھورتے رہے، گھورتے رہے اور بس کھڑے رہے۔ اس نے رومال ایک مرتبہ پھر اس کے مُنھ میں ٹھونسا اور بوٹ کو پالش کرنا شروع کر دیا، جب کہ اس کا چہرہ ٹونی کے پیر کے گرد چھوٹے چھوٹے دائرے بنانے لگا۔

جب دونوں بوٹ اس کے اطمینان کے مطابق پالش ہو چکے تو سرٹونی نے خود کو عُبید کے باقی ماندہ ملبوسات کے ساتھ مصروف کیا۔ اس نے عُبید کی شرٹ پر اُونتی کے لوگو والی جیب پھاڑنے کی کوشش میں کافی وقت صرف کیا۔ وہ ریشمی تھی؛ پھٹ نہیں رہی تھی۔

اس نے تمام بٹن توڑ ڈالے اور شرٹ اتار لی۔ عُبید اس کے نیچے کچھ بھی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ جب سرٹونی نے اس کی پتلون کی جانب اشارہ کیا تو عُبید ہچکچایا، لیکن پھر سرٹونی نے اپنی بیلٹ کے بکل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور کچھ ہی سیکنڈوں میں عُبید وہاں صرف اپنے انڈر ویئر اور سفید موزوں اور چمکتے ہوئے آکسفرڈ جوتوں کے ساتھ کھڑا تھا، جب کہ گلابوں سے کاڑھا ہوا رومال اب تک اس کے مُنھ میں تھا۔ سرٹونی نے رومال اس کے مُنھ سے نکالا اور کچھ شفقت کے ساتھ اسے عُبید کی گردن کے گرد باندھ دیا۔ عُبید اب اٹینشن کھڑا تھا، کچھ کپکپا بھی رہا تھا، لیکن وہ سیدھا اور سختی سے کھڑا تھا اور اس کے بازو اس کے اطراف جمے ہوئے تھے۔

'ٹیک چارج۔' سرٹونی نے عُبید کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اپنی بیلٹ ٹائٹ کرتے ہوئے وہاں سے چلتا بنا۔ ہم عُبید کے پیچھے فال ان کر گئے اور وہ ہمیں مارچ کراتا ہوا ہمارے ڈورم تک لے گیا۔ جب وہ ہمارے سامنے اپنے انڈر ویئر اور آکسفرڈ جوتوں کے علاوہ ننگا کھڑا، اسکواڈرن میں اپنی پہلی رات ہمیں ہمارے ڈورم تک لے جاتے ہوئے ہماری رہ نمائی کر رہا تھا تبھی میں نے دیکھا کہ اس کا انڈر ویئر بھی ریشمی ہے، بہت چھوٹا ہے اور بہت ٹائٹ، جس کے کمر بند پر چھوٹے چھوٹے دل کڑھے ہوئے ہیں۔

'جینز اچھی ہے۔' ڈورم میں اس کی پہلی رات لائٹس آؤٹ کی گھنٹی بجنے کے بعد میں نے اپنے بستر سے سرگوشی کی۔ عُبید میرے ساتھ والے بستر پر تھا، اس کا کمبل چمک رہا تھا کیوں کہ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی ٹارچ حرکت کر رہی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا یا اپنے خفیہ اعضا دیکھ کر کسی ممکنہ نقصان کا جائزہ لے رہا تھا۔

'میرے ابا بناتے ہیں۔' اس نے ٹارچ بند کی اور کمبل اپنے سر سے ہٹا دیا۔ اس نے جس انداز میں 'میرے ابا' کہا اس سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ انھیں زیادہ پسند نہیں کرتا۔

'تمھارے ابا لیوائز کے مالک ہیں؟'

'نہیں وہ بس ایک فیکٹری کے مالک ہیں۔ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ، بنکاک۔'

'بڑے پیسے بنا لیتے ہوں گے۔ تم کیوں نہیں گئے اپنے فیملی بزنس میں؟'

'میں اپنے خواب پورے کرنا چاہتا تھا۔'

'ایسی کی تیسی۔ یار ان پاگل سویلینز میں سے ہر کوئی غلط جگہ شہادت کی تلاش میں ہے۔'

'کون سے خواب؟ دوسروں کے بوٹ چاٹنے کے؟'

'میں اُڑنا چاہتا ہوں۔'

لونڈے نے ظاہر ہے کہ اپنے ابا کے وئیر ہاؤسز میں بہت سا وقت گزارا تھا جعلی لیبلز کے اسپیلنگ چیک کرنے میں۔ میں ایک لمحے کے لیے چپ بیٹھا رہا۔ پڑوس کے ڈورم میں کوئی سبکیاں لے رہا تھا، شاید اس کے کانوں میں اس کی ماں سے مُتعلق، جس کی کمی وہ واقعی محسوس کر رہا تھا، جتنے گاف اور چے والے الفاظ انڈیلے گئے تھے، وہ ان کا عادی نہیں ہو پا رہا تھا۔

'میں؟ ارے میں نے تو اس جیسے ڈورم میں اپنی چھٹی سال گرہ بھی منائی تھی۔ مجھے ایسا مسئلہ کبھی نہیں ہوا۔

'تمھارے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟' اس نے اپنی ٹارچ روشن کر دی اور اس کا رُخ میری طرف کر دیا۔

'یار اسے تو بجھا دو۔ تم ہمیں مصیبت میں ڈالو گے۔' میں نے کہا۔ 'وہ آرمی میں تھے۔'

'ریٹائر ہو گئے؟'

'نہیں۔ وہ فوت ہو گئے۔'

عُبید اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنا کمبل ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر سینے

سے لگا لیا۔

'آئی ایم سوری۔ ہوا کیا تھا؟'

'وہ ایک مشن پر تھے۔ کلاسیفائیڈ۔'

عُبید ایک لمحے کے لیے چپ رہا۔

'پھر تو تمھارے والد ایک شہید ہوئے۔ میرے لیے تمھارا روم میٹ ہونا اعزاز کی بات ہے۔'

میں نے سوچا کہ پتا نہیں مجھے ایسا باپ پسند کرنا چاہیے جو زندہ ہو اور امریکی برینڈز کی نقلیں تیار کرتا ہو یا ایک لیجنڈ جو چھت کے پنکھے سے لٹک رہا ہو۔

'اور کیا تم نے واقعی آرمڈ فورسز کو جوائن کرنے کا خواب دیکھا تھا؟'

'نہیں۔ کتابیں۔ مجھے کتابیں پڑھنا پسند ہے۔'

'کیا تمھارے ابا کتابیں بھی بناتے ہیں؟'

'نہیں۔ انھیں کتابوں سے نفرت ہے۔ لیکن یہ میری ہابی ہے۔'

پڑوس کے ڈورم سے آنے والی سسکیوں کی آواز اور ہلکی ہلکی ریں ریں میں تبدیل ہو چکی تھی۔

'کیا تمھاری بھی کوئی ہابی ہے؟'

'میں ٹکٹ جمع کرنے کے لیے فوج میں نہیں آیا،' میں نے کمبل اپنے سر پر کھینچتے ہوئے کہا۔

میں اپنے بوٹوں کے تسمے کھولتا ہوں، موزے اتارتا ہوں، ہینگر سے کلف لگی ہوئی پتلون اور ایک شرٹ نکالتا ہوں۔ میری پتلون کی دونوں ٹانگیں ایک دوسری کے ساتھ کارڈ بورڈ کے گلیو لگا کر جوڑے ہوئے دو ٹکڑوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں اور جب میری ٹانگیں انھیں کھولتی ہیں تو ان سے کپڑا پھٹنے کی آواز آتی ہے۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی سخت شرٹ

پتلون میں سیدھی کرتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولتا ہوں۔

'مبارک ہو، انکل تھری ناٹ تھری، تمھارا قیدی فرار نہیں ہوا۔'

میں آئینے میں دیکھتا ہوں۔ شیو کیے ہوئے تین دن ہو گئے اور میری ٹھوڑی پر اب بھی فقط اکا دکا بال نظر آ رہے ہیں۔ کیکٹس کے کانٹوں کی طرح، عُبید کہا کرتا تھا، کم لیکن چبھنے والے۔

میں دراز سے ریزر نکالتا ہوں۔ کچھ ہی خشک وار کانٹوں سے چھٹکارا دلا دیتے ہیں۔ میں نے کرنل شگری کے چہرے پر ایک بھی بال نہیں دیکھا۔ جب انھوں نے انھیں چھت کے پنکھے سے نیچے اتارا تو انھوں نے تازہ تازہ شیو کی ہوئی تھی۔

میں آئینے میں دیکھ سکتا ہوں کہ میرے پیچھے کھڑا میرا گارڈ مُسکرا رہا ہے۔

میں پریڈ اسکوائر پہنچتا ہوں تو میرا سائلنٹ ڈرل اسکواڈرن اٹینشن ہو جاتا ہے۔ بینن وہاں نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ اپنے 'ٹھنڈ رکھ یار' والے موڈ میں ہے جس کا مطلب ہے نیس کفے انسٹنٹ کے پہلے کپ کے ساتھ حشیش کا ایک سوٹا لگانا۔ مجھے اس کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ میرے لڑکے، جو تعداد میں اٹھارہ ہیں، تین قطاروں میں کھڑے ہیں، اور ان کے دائیں ہاتھ ان کی جی تھری رائفلوں کی نالوں کے ساتھ ٹکے ہوئے ہیں جن کی سنگینیں ننگی ہیں اور آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

میں ڈریس انسپکشن شروع کرتا ہوں جس کے دوران میں فراغت کے ساتھ نرم خرام مارچ کر رہا ہوں، میرا بایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر ہے، اور میرے مُڑے تُڑے چہرے کا عکس ان کے جوتوں کے اگلے حصوں میں دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بہترین لڑکوں میں سے اٹھارہ لڑکے ہیں: اس گروپ سے کسی دراڑ دار جوتے، یا مُڑی تُڑی کریز یا ڈھیلی بیلٹ کی توقع نہیں، لیکن جب تک آپ کسی کو پکڑ نہ لیں انسپکشن صحیح معنوں میں مکمل نہیں ہوا کرتی۔ میں جیسے ہی تیسری قطار کے آخری شخص سے پہلے والے تک پہنچتا ہوں، اپنے

ہدف کو نشان زد کر لیتا ہوں۔ میں اپنے دائیں ہاتھ سے تلوار باہر نکالتا ہوں، مُڑتا ہوں اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکا اپنی آنکھ جھپکے، تلوار کی نوک اس کی بیلٹ سے ذرا سا اوپر اس کے پیٹ پر رکھ دیتا ہوں، جو میرے سر کے تحسینی اشارے کے بعد ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پیٹ فی الفور اندر کھینچ لیا جاتا ہے۔ صرف وہ ایک لڑکا نہیں جسے میں نے اپنی تلوار کی نوک پر رکھا ہوا ہے، بلکہ ہر طرف پیٹوں کو بے آواز طریقے سے اندر کو کھینچ لیا جاتا ہے؛ ریڑھ کی ہڈیاں، جو پہلے ہی سے سیدھی ہیں، اپنے امکان کی آخری حد تک سخت ہو جاتی ہیں۔ میری تلوار ہوا میں ایک قوس بناتی ہے، اس کی نوک اپنی نیام کا منھ تلاش کرتی ہے اور اس کے مخملیں اندرون میں داخل کر دی جاتی ہے۔ تلوار کا دستہ نیام کے بالائی حصے کے ساتھ چھنکتا ہے اور میں اپنا مارچ پھر سے شروع کر دیتا ہوں۔ ایک لفظ بھی کہا یا سنا نہیں جاتا۔ میری آنکھیں ساکت، سخت چہروں اور نہ جھپکتی ہوئی آنکھوں پر سے بہتی چلی جاتی ہیں۔

اچھے لڑکے ہیں بھئی یہ۔

اب ہم شروع کر سکتے ہیں۔

یہ جو خاموشی کی آواز کے بارے میں اتنی ساری بکواس کی جاتی ہے، صرف بکواس ہے۔ خاموشی خاموشی ہوتی ہے اور ہمارے سائلنٹ ڈرل اسکواڈ نے یہ بات اب تک سیکھ لی ہے۔ ہم نے ہفتے کے ساتوں دن اب تک ایک سو دس روز تک یہ کیا ہے۔ وہ جن کی اندرونی گھڑیوں میں کوئی خرابی تھی، وہ جو اپنا کیو لینے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کے عادی تھے، وہ جو اپنی حرکات کو دوسروں کے ساتھ رکھنے کے لیے خاموشی سے گنتیاں گنا کرتے تھے اور وہ جو خون کی روانی برقرار رکھنے کے لیے اپنے جوتوں میں موجود پیروں کی انگلیاں مروڑا کرتے تھے، سب نکالے جا چکے ہیں۔

یہاں، میری خواہش، ان کے لیے حکم ہے۔

بیٹن جو میری انسپکشن کے دوران خاموشی سے وہاں آن موجود ہوا ہے، اچانک کنکریٹ کے فرش پر زوردار طریقے سے اپنا بوٹ مار کر اٹینشن ہو جاتا ہے، جو میرے لیے اس بات کا اشارہ ہے کہ اب شروع ہو جاؤں۔ میں اس کی جھکی ہوئی پلکوں کے نیچے کشادہ ہوتی ہوئی سرخ رسیوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں اور ایک اباؤٹ ٹرن کی کمانڈ دے کر اپنی تلوار باہر نکال لیتا ہوں؛ اسے اپنے سینے کے سامنے رکھے، میں اس کا دستہ اپنے ہونٹوں کے ساتھ لیول کر لیتا ہوں۔ یہ وہ سلیوٹ ہے جو خاموشی کے ساتھ کیا گیا اور قبول بھی کیا گیا، میں مُڑتا ہوں اور سائلنٹ اسکواڈ کی جانب چار قدم مارچ کرتا ہوا جاتا ہوں۔ جیسے ہی میری ایڑی چوتھے قدم پر پڑتی ہے، اسکواڈ ایک ساتھ اٹینشن ہو جاتا ہے۔

پرفیکٹ سٹارٹ۔

میری تلوار نیام میں واپس جاتی ہے اور اس کا دستہ جب اپنی جگہ داخل ہو کر کلک کی آواز پیدا کرتا ہے تو ساتھ ہی ہوا سے بھی کوڑا لہرانے کی آواز آتی ہے۔ رائفلیں دائیں ہاتھوں سے نکلتی ہیں اور اپنی سنگینوں کے ساتھ ہوا میں بلند ہو جاتی ہیں، لڑکوں کے سروں کے اوپر ایک دائرہ مکمل کرتی ہیں اور حفاظت کے ساتھ ان کے دائیں ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ پھر دونوں ہاتھ رائفلیں تھام لیتے ہیں، انھیں اپنے سینوں کے سامنے تھام لیتے ہیں اور تین مرتبہ میگزینوں کو بجاتے ہیں۔ میرا رائفل آرکسٹرا پانچ منٹ کے لیے بجتا ہے، اور رائفلیں ہوا میں لہراتی ہوئی دائرہ بناتی ہیں۔ میگزینوں کو بجاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کی ٹائمنگ پرفیکٹ ہے۔ میری سائلنٹ کمانڈ پر دس پاؤنڈ کی دھات اور لکڑی خود کو سدھا لیتی ہے۔

میری اندرونی آواز حکومت کر رہی ہے۔

اسکواڈ خود کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتا ہے، دونوں قطاریں مخالف سمتوں میں دس قدم تک مارچ کرتی ہیں، اور پھر ہالٹ ہو جاتی ہیں، پیچھے مُڑتی ہیں اور، ایک پُرسکون نفاست کے ساتھ، واحد قطار میں گھل جاتی ہیں۔

اب ان ڈھکنوں کو یہ بتانے کا وقت آ گیا ہے کہ یہ سب ہوتا کیسے ہے۔

میں قطار کے لیڈر سے تین قدم دور کھڑا ہوتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں

میں دیکھ رہے ہیں۔ بس ایک ہی جھجکی یا اِدھر اُدھر کو پڑنے والی ایک نظر ہمارے لیے موت کا پیام ہو سکتی ہے۔ قطار کا لیڈر اپنی رائفل سینے کے لیول تک لاتا ہے اور اسے میری طرف پھینکتا ہے۔ رائفل نصف قوس بناتی ہے اور میرے آزمودہ ہاتھ اسے وصول کرتے ہیں۔ ایک۔ دو۔ تین۔ میرا دایاں ہاتھ اسے اپنے سر سے گھماتا ہوا اوپر پھینکتا ہے اور وہ میرے بائیں ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اگلے ساٹھ سیکنڈوں تک وہ میرے سر کے اوپر اور میرے کاندھوں کے ارد گرد اچھلتی اور رقص کرتی رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کے لیے جی تھری رائفل دھات اور لکڑی کی ایک دھندلی سی لہر بن چکی ہے جو میرے ساتھ یک جان ہو چکی ہے اور پھر ایک ٹرپل لوپ بناتی ہوئی قطار کے لیڈر کے ہاتھ میں جا پہنچتی ہے۔

آخری مرحلے کے لیے اسکواڈ پھر سے دو قطاروں میں کھڑا ہو جاتا ہے اور میں اُن کے وسط کی جانب اپنا ست گام مارچ شروع کرتا ہوں، جب کہ میں نے تلوار اپنے سینے کے سامنے اُٹھائی ہوئی ہے۔ میرا ہر قدم دونوں قطاروں کے لیے ایک کمانڈ ہے کہ وہ اپنی رائفل اپنے سامنے کھڑے لڑکے کی طرف اچھال دیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اڑتی ہوئی تلواروں کے نپے تلے حملے کے درمیان سے گزرنا۔ پھینکو۔ پکڑو۔ اگر آپ نے ایک بھی بیٹ مس کر دی تو آپ کی سنگین آپ کے ساتھی کی آنکھ میں کھب سکتی ہے۔ میں ہوا میں دائرے بناتی رائفلوں کے بیس میٹر طویل دائرے نما راستے پر چل رہا ہوں۔ یہ سب لگتا تو عظیم الشان ہے لیکن تین مہینے کی مشق سے اسے حاصل کرنا آسان ہے۔

جب میں آخری جوڑے کے پاس پہنچتا ہوں، تو میں اپنی آنکھ کے کونے سے اپنے دائیں جانب کے لڑکے کو دیکھتا ہوں، بس اپنی آنکھ کے قرینے کی ذرا سی ٹیڑھ سے۔ اس کے ہاتھ میری ناک کے پاس سے ابھی ابھی شوں کر کے گزرتی ہوئی رائفل کو پکڑتے ہوئے کپکپا جاتے ہیں۔ اس کا دایاں ہاتھ تھرو کرتے ہوئے ایک نینو سیکنڈ لیٹ ہو جاتا ہے، رائفل ہوا میں ایک نیم دائرہ بناتی ہے اور اس کا بٹ میری کھوپڑی پر جا لگتا ہے۔

پرفیکٹ۔

بلیک آؤٹ۔

اگر اُس حرامی نے ایک اور لمحے کی تاخیر کر دی ہوتی، تو مجھے بٹ کے بجائے سنگین جا لگتی۔

میڈیکل اردلی میرے جوتے اتارتے ہیں، تلوار ہٹاتے ہیں اور میری بیلٹ ڈھیلی کر دیتے ہیں۔ ایمبولینس خاموش ہے۔ کوئی میرے چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا دیتا ہے۔ میں اسٹریچر کا آرام دیکھتے ہوئے اپنی مزاحمت ترک کر دیتا ہوں اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔ کاش میں بے ہوش ہو جانے کا عیش گوارا کر سکتا لیکن میری حالت جلد بہتر ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ڈیڑھ ہشیار قسم کے ڈھکّن میری کھوپڑی کھول دیں۔

جب میری کمر بیک بے کے خصوصی کیئر روم میں ایک سفید چادر سے لگتی ہے، ایک اردلی میرے بازو میں ایک سوئی کھبا دیتا ہے۔ ایک پردہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ فون پردے کے دوسری جانب ہے۔ میں پُر سکون محسوس کرتا ہوں، اتنا پر سکون کہ میں ٹیلے فون کی وہاں موجودگی کا یقین کرنے کے لیے اسے ایک بار پھر دیکھتا ہوں۔

میں اُٹھتا ہوں تو خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرتا ہوں اور مجھے فی الفور معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے میری ڈرِپ میں خواب آور دوا ملا دی تھی۔

بینن میرے بستر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھا ہے۔

'صرف عُبید کی بات نہیں ہے۔' وہ کہتا ہے۔ 'ایک جہاز غائب ہے۔ ایک پورا گاڈ ڈیم جہاز، غائب۔'

میں امید کرتا ہوں کہ یہ خواب آور دوا کے سبب دکھائی دینے والا کوئی واہمہ ہے، لیکن بینن کا ہاتھ میرے کاندھے پر ہے اور وہ اکیڈمی میں وہ واحد شخص ہے جو ائرکرافٹ کو جہاز کہتا ہے۔

'ایک ایم ایف سترہ جہاز غائب ہے اور ان کا خیال ہے کہ اسے عُبید لے گیا ہے۔'

'آپ کا کیا خیال ہے؟' میں اس سے پوچھتا ہوں، اور خود کو بہ یک وقت بے وقوف

اور نیند میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

بے بی او ایک پورے ائرکرافٹ کو ساتھ لے اُڑا؟

مشاق، ایم ایف سترہ، دو نشستیں، دُہرا کنٹرول، پروپیلر والا ائرکرافٹ، دو سو ہارس پاور کے ساب انجن سے چلنے والا۔ ایمرجینسی پروسیجر:

انجن میں آگ لگنے کی صورت میں:

تھروٹل کو کاٹ ڈالو۔

ائرکرافٹ کو تیس ڈگری کے زاویے پر نیچے لے جاؤ۔

ائری لونز کو ٹرم کرو۔

لینڈ کرنے کے لیے کوئی میدان دیکھو۔

اگر آگ نہیں بجھتی تو:

سیفٹی بیلٹ پر لگے کیچ کو کھول دو۔

کنوپی کو اجیکٹ کر دو۔

اپنا سر نیچے دبائے رکھو۔

دائیں پر پر چڑھ جاؤ۔

چھلانگ لگا دو۔

'دائیں پر پر کیوں؟' میں نے ایمرجینسی پروسیجرز کی کلاس میں اپنا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔

تاکہ تمھیں موت جلدی آ سکے، جواب ملا۔

ایم ایف سترہ پر کوئی پیراشوٹ نہیں ہوتا۔

'جہاز اب بھی غائب ہے۔' بینن کہتا ہے۔

'جہاز کی پروا کس ڈھکّن کو ہے؟ وہ ٹیک آف کرنے کے اڑتالیس گھنٹے بعد بھی ہوا

میں تو رہ نہیں سکتا۔ تم نے ہی یہ آئیڈیا پہلے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ اب یہاں آرام سے بیٹھے نہ رہو، کچھ کرو۔' میں اُس پر چلاتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ میری آواز رُندھی ہوئی ہے۔ یہ خواب آور دوا کا اثر ہوگا، میں خود کو بتاتا ہوں۔

'وہ رادار پر سے غائب ہو گیا، ٹیک آف کرنے کے دس منٹ بعد۔' بینن ایک دھیمی سرگوشی میں کہتا ہے۔

'کیا انھوں نے اس کے لیے جنگی طیارے بھیجے تھے؟'

'نہیں، انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی روٹین کی تربیتی پرواز ہے۔' اس نے کہا۔ 'مجید نے تمھارا کال سائن استعمال کیا تھا۔'

۴

جنرل ضیاء الحق ایک ٹی وی کیمرے کے سامنے قوم سے اپنے خصوصی خطاب کی ریہرسل کر رہا تھا جب اس کی سیکیورٹی کا سربراہ بریگیڈیئر ٹی ایم کمرے میں داخل ہوا۔ دن کا کوئی بھی وقت ہوتا یا موقع کی اہمیت جو بھی ہوتی، بریگیڈیئر ٹی ایم کا سلیوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا پیر جیسے ہی گداز قالین پر پڑا، اس کے احترام کی قدر و قیمت آرمی ہاؤس کے لونگ روم کے مخملیں پردوں تک میں گونجنے لگی اور جنرل ضیا اپنی لکھی ہوئی تقریر کو پڑھنا روک کر فی البدیہہ بولنے کے لیے دیے جانے والے اشارے کو پھر سے فراموش کر گیا۔ یہی تو وہ موقع تھا جب اسے اپنے سامنے پڑے کاغذات کے پلندے کو بائیں ہاتھ سے ایک طرف کرتے ہوئے، اور دائیں ہاتھ سے اپنا مطالعے کا چشمہ اتارتے ہوئے کیمرے میں بالکل سیدھا دیکھ کر کہنا تھا: 'میرے عزیز ہم وطنو، اب میں کچھ اپنے دل کی گہرائیوں سے کہنا چاہتا ہوں۔۔۔' لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کا دایاں اور بایاں ہاتھ ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے۔ تمام صبح وہ یا تو کاغذ پر لکھا ہوا پڑھنے کے دوران ہی چشمہ اتار ڈالتا یا لکھی ہوئی تقریر ایک طرف کر کے خاموشی سے کیمرے کی طرف دیکھتا تو چشمہ ہنوز اس کی آنکھوں پر موجود ہوتا۔ جنرل ضیا نے اپنے وزیرِ اطلاعات کی جانب دیکھا، جو اپنے عضو پر ہاتھ باندھے اس کی تقریر ایک ٹی وی مانیٹر پر دیکھ رہا تھا اور جو ہر جملے اور ہر وقفے پر زور و شور سے سر ہلاتا تھا۔ وزیرِ اطلاعات نے ٹی وی کے

عملے سے کہا کہ وہ کمرے سے چلے جائیں۔

بریگیڈیئر ٹی ایم دروازے کے ساتھ ساکت کھڑا تھا، اس کی آنکھیں اس کیمرے اور مانیٹر کی چھان بین کر رہی تھیں جو ٹی وی کا عملہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ کمرے میں کوئی چیز بدلی بدلی نظر آ رہی تھی: ہوا بھاری تھی، رنگ وہ نہیں تھے جو اس نے کل ہی وہاں دیکھے تھے۔ 'یہ بہت زور دار تقریر ہے، سر۔' وزیرِ اطلاعات نے جنرل ضیا کی مخاصمانہ انداز نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ کوڈ ریڈ کے نفاذ کے بعد جنرل ضیا کی جانب سے خود کو آرمی ہاؤس تک محدود کر لینے کے فیصلے کے بعد سے وزیرِ اطلاعات کے پاس ٹیلے وژن کی شام کی خبروں کی ہیڈ لائن جاری کرنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ ری سائیکل کی جانے والی فوٹیج دو دن تک چلاتے رہنے کے بعد اس نے جنرل ضیا کو تجویز دی کہ وہ قوم سے ایک خصوصی خطاب کر ڈالے۔

'یہ تقریر بے جان ہے۔ کوئی جذبات ہی نہیں۔' جنرل ضیا نے کہا۔ 'لوگ نہ صرف یہ سوچیں گے کہ میں اپنے ہی آرمی ہاؤس میں قیدی ہوں بلکہ یہ بھی کہ میں مخبوط الحواس ہوگیا ہوں۔'

وزیرِ اطلاعات نے اس پر اس جوش و خروش سے سر ہلایا جیسے اس کا منصوبہ شروع سے رہا ہی یہی ہو۔

'اور یہ حصّہ جو ہماری عظیم قوم کو درپیش عظیم خطرات کے بارے میں ہے، بہت شاعرانہ ہے۔ ان خطرات کا نام بتائیں نا؛ انھیں اور زیادہ اور زیادہ خطرناک بنائیں نا۔ اور یہ جس پیراگراف میں لکھا ہے کہ 'میں ایوانِ صدر میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ اس کی بنیادوں میں خون بھرا ہوا ہے' بالکل بے معنی ہے۔ کس کا خون؟ کچھ خون چوسنے والے سیاست دانوں کے بارے میں بھی لکھیں نا۔ کچھ غریب عوام کے بارے میں لکھیں۔ آپ کو پتا ہے کہ اس ملک میں غریب عوام بھی رہتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ انھی غریب عوام میں سے ایک بننا نہیں چاہیں گے۔'

وزیرِ اطلاعات نے تقریر اُٹھائی اور کمرے سے نکل گیا، اسے مصافحے کے لیے ہاتھ بھی پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی شام کی خبروں کے بلیٹن میں قوم کو بتانے کے لیے کوئی بات مل سکی۔

'بیٹھ جاؤ بیٹا۔' جنرل ضیا بریگیڈیئر ٹی ایم کی جانب مڑا اور اس نے آہ بھری۔ 'تم اس ملک میں واحد آدمی ہو جس پر مجھے اب بھی اعتماد ہے۔'

بریگیڈیئر ٹی ایم جیسے ہی صوفے کے کونے پر بیٹھا، اسے فوری طور پر محسوس ہو گیا کہ اس کے نیچے موجود نشست نامانوس، گہری اور زیادہ نرم ہے۔

جنرل ضیا کی مجموعی سیکیورٹی جنرل اختر اور اس کی انٹر سروسز انٹیلی جینس کی ذمّے داری تھی، لیکن اس کی ذاتی حفاظت یقینی بنانے کے لیے جو آدمی منتخب کیا گیا تھا وہ بریگیڈیئر ٹی ایم تھا۔ آدمی کیا تھا ایک بیرل تھا، بلکہ ایک ایسی بیرل جو ہر آدمی کے خلاف شکوک و شبہات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پچھلے چھ برسوں سے سائے کی طرح ضیا کے ساتھ لگا رہا تھا۔ اس کی مسلّح کمانڈوز کی ٹیم نے جنرل ضیا کے دفتر اور لونگ روم ایریا کے گرد ایک حصار قائم کر رکھا تھا۔ پھر اس نے دو میل کے نصف قُطر کے اندر اسی بنیادی حصار کے گرد کئی کئی دائرے بنا رکھے تھے۔ اس نصف قُطر کے بعد مزید تین میل تک کے علاقے میں سیکیورٹی برقرار رکھنے کی ذمّے داری فوج کے عام سپاہیوں کی تھی۔ اس حصار کے باہر سویلین پولیس کھڑی رہتی تھی لیکن کسی کو اُس سے اِس سے زیادہ توقّع نہیں تھی کہ وہ ٹریفک روکنے اور جنرل ضیا کے کارواں کی ایک جھلک دیکھنے کے شوقین افراد پر ہلکا سا لاٹھی چارج کرنے کے علاوہ کچھ کر سکے گی۔ یہ پانچ میل کا دائرہ شارٹ نوٹس پر حرکت کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، جس میں جنرل ضیا بہ دستور مرکز میں موجود رہتا۔ لیکن جب سے اس نے وہ تمام سرکاری مصروفیات ترک کی تھیں جن کے نتیجے میں اسے آرمی ہاؤس سے باہر جانا پڑسکتا، بریگیڈیئر ٹی ایم کے شکوک و شبہات کا مرکز خود آرمی ہاؤس ہی بن کر رہ گیا تھا۔

* * *

جب جنرل ضیا نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ ایک میجر اور آسمان پر ایک چھوٹا سا نقطہ تھا اور قومی دن کی پریڈ پر ہرکولیس سی ون تھرٹی طیارے سے چھلانگ لگانے والے چھاتا برداروں کی فارمیشن کا قائد تھا۔ پھر یہ چھوٹا سا نقطہ پھل پھول کر ایک سبز و سفید پیراشوٹ میں تبدیل ہو گیا اور ٹی ایم، اپنے پیراشوٹ کے کورڈ کنٹرول کو سنبھالتے ہوئے جنرل ضیا کے اُس ڈائس کے سامنے سفید چاک سے بنائے جانے والے اس ایک میٹر کے دائرے میں اتر گیا جہاں سے وہ پریڈ کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ جنرل ضیا کو، جو ایک ایسے دور میں فوج میں بھرتی ہوا تھا جب پیراشوٹ کو انجانی دنیا کی کوئی چیز سمجھا جاتا تھا، ٹی ایم کی انتہائی درست لینڈنگ بھا گئی۔ وہ ڈائس سے نیچے اُترا، ٹی ایم کو گلے سے لگایا اور اسے کہا کہ وہ پریڈ کے بعد کی پارٹی کے لیے وہیں موجود رہے۔ جب جنرل ضیا سفارت کاروں اور دوسری غیر ملکی معززین کی استقبالیہ قطار کے پاس سے گزر رہا تھا تو ٹی ایم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر جنرل ضیا نے وی آئی پی ایریا سے باہر قدم نکالا اور وزیرِ اطلاعات کی تجویز پر 'عوام میں گھل مل' جانے کے لیے نکل گیا۔ وزیر نے سرکاری ٹیلے وژن کو پہلے ہی سے ہیڈلائن لکھوا دی تھی اور اب وہ اس کے وقوع پذیر ہو جانے کا ذمے دار تھا۔ وہ ہجوم جس میں ضیا گھل مل گیا، تمام کا تمام مردوں پر مشتمل تھا جن میں پرائمری اسکول کے اساتذہ، عدالتوں کے کلرک، دفتروں کے چپڑاسی اور سرکاری افسروں کے نوکر چاکر شامل تھے، جنھیں وہاں حاضر ہونے کا حکم ان کے باس نے دیا تھا۔ ہجوم میں بہت سے لوگ سول کپڑوں میں ملبوس فوجی تھے جنھیں پاس کی ایک چھاؤنی سے بلایا گیا تھا۔ جنرل ضیا نے محسوس کیا کہ ٹی ایم کے اس کے ساتھ ہونے سے ہجوم اچانک نظم و ضبط کا زیادہ پابند ہو گیا تھا۔ جنرل ضیا میں جو اِدھر اُدھر دیکھتے رہنے اور ہجوم میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے کی پرانی عادت تھی جو اس پر کوئی پتھر پھینک سکتا یا گالی اچھال سکتا، تو ٹی ایم کی طویل قامت اور تنگڑی موجودگی نے ضیا کو یہ عادت بھی بھلا دی۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے ہجوم کو کسی خاص جدو جہد کے بغیر قابو کیا اور اس کی کہنیاں کسی ماہر کشتی راں کے چپوؤں کی طرح کام کر رہی تھیں جیسے کہ وہ ہجوم کسی ساکت جھیل کے مردہ پانی کے سوا کچھ نہ ہو۔

'تمھاری چھلانگ پرفیکٹ تھی۔ تم یہ کام بڑی خوب صورتی سے کرتے ہو۔' جنرل ضیا نے اپنے ہاتھ سے ہوا میں ایک بے ہئیت پھول بناتے ہوئے کہا۔ پریڈ کے بعد کی تقریبات کے بعد وہ جنرل ہی کی گاڑی میں آرمی ہاؤس جا رہے تھے۔ 'اگر کبھی تم چھلانگ لگا دو اور وہ چیز کھلے ہی نہیں، پھر کیا ہوگا؟'

'زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے،' ٹی ایم نے گاڑی کی نشست کے سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا، 'لیکن میں اپنا پیراشوٹ خود باندھتا ہوں۔' جنرل ضیا نے تحسین میں اپنا سر ہلایا، جیسے اسے توقع ہو کہ اسے کچھ مزید سننے کے لیے ملے گا۔ ٹی ایم بہت کم گو تھا لیکن اس خاموشی نے اسے بے سکون کر دیا اور اس نے رضاکارانہ طور پر کچھ مزید اطلاعات پیش کیں۔ 'میں نے اپنے پیراشوٹ پیکنگ کیبن کے باہر ایک نعرہ لکھ کر لگایا ہوا ہے: ''لائف پیکنگ ہو رہی ہے بھائی''۔' یہ زندگی میں ٹی ایم کی پہلی اور آخری ادبی اُڑان تھی؛ اس کا جسم زیادہ بولتا چالتا تھا۔ ٹی ایم کا جسم درخت کا ایک تنا تھا، جو ہمیشہ جنگل کے کیموفلاج یونی فارم میں ملبوس رہتا۔ اس کا چھوٹا سا سر ہمیشہ ایک قرمزی بیریٹ ٹوپی سے ڈھکا رہتا، جو اس کے بائیں کان کی جانب خمیدہ ہوتی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں ہر وقت کسی نظر نہ آنے والے دشمن کو ڈھونڈتی رہتیں۔ سرکاری استقبالیوں میں بھی، جہاں فوج کے باقی لوگ تقریب کے حساب سے اپنی سنہری پٹیوں والی وردیاں پہنتے تھے، جنرل ضیا کے پیچھے واحد آدمی اپنی جنگی وردی میں ہوتا اور اس کی آنکھیں کسی وی آئی پی کے چہرے سے کسی ویٹر پر، اور پھر اپنا پرس ہاتھ میں پکڑے کسی خاتون تک مسلسل گردش کرتی رہتیں۔ جنرل ضیا کے چیف آف سیکیورٹی کی حیثیت سے اپنے چھ برسوں کے دوران اس نے نہ صرف جنرل ضیا کو نظر آنے اور نظر نہ آنے والے دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا بلکہ اس نے اسے اتنے زیادہ ہجوموں کے درمیان سے راستہ بھی بنا کر دیا تھا کہ جنرل ضیا نے اب خود کو عوامی آدمی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

اب جب کہ جنرل ضیا نے بریگیڈیئر سے پوچھے بغیر اپنا سیکیورٹی خطرے کا لیول ریڈ کر دیا تھا، وہ صورتِ حال کی مناسب جانچ پڑتال کرنا چاہتا تھا۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے صوفے کے کنارے پر پہلو بدلا۔ وہ جنرل ضیا کے ساتھ کسی جگہ بیٹھ کر بات چیت کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ ساکت بیٹھا رہے اور زیرِ نظر معاملے پر توجہ مرکوز رکھے، لیکن اس کی آنکھیں لال برگنڈی رنگ کے ریشمی پردوں کے صدارتی لہریوں اور اسی کے ہم رنگ ایرانی قالین میں غور سے جھانکتی رہیں۔ اچانک اس کے پھیپھڑوں سے تمام ہوا خارج ہوئی اور اس کے کاندھے بے یقینی کے عالم میں اُتر کر رہ گئے۔ پردے اور قالین نئے تھے۔ یہ سب کچھ یہاں اس کے علم میں لائے بغیر آیا کیسے؟

'مجھے کون مارنا چاہتا ہے؟' جنرل ضیا نے اس سے ایک غیر جانب دار سی آواز میں پوچھا، جیسے وہ لان میں گھاس کی کٹائی کے انتظامات سے متعلق سوال کر رہا ہو۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے صوفے کے بروکیڈ کور کو چھوا اور حیران ہونے لگا کہ اس کی سیکیورٹی کلیئرنس کے بغیر کسی نے اسے تبدیل کیسے کر لیا۔

جنرل ضیا کے فوجی اسٹاف میں بریگیڈیئر وہ واحد شخص تھا جسے اس کے دفتری کے ساتھ ساتھ نجی احاطے میں بھی چوبیس گھنٹے میں سے کسی بھی وقت رسائی حاصل تھی۔ اس کے اندرونی حلقے میں وہی واحد آدمی تھا جو پانچ وقت کی نمازوں میں جنرل ضیا کے ساتھ شامل نہیں ہوتا تھا اور اسے حاصل یہ رعایت اتنی غیر معمولی تھی کہ دوسرے لوگ اس پر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ جو شخص بھی نماز کے وقت جنرل ضیا کے قریب ہوتا اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ نماز میں اس کا شریک ہوگا، چاہے وہ جہاں کہیں ہوں، اس کے سرکاری طیارے میں ہوں یا نیشنل کمانڈ کے کسی بنکر میں۔ جنرل ضیا اپنی گھڑی کو دیکھتا اور ہر شخص، بہ شمول ان چپڑاسیوں اور سیاست دانوں کے، جنھیں یہ بھی نہیں پتا ہوتا تھا کہ نماز میں کب کھڑا ہونا اور کب جھک جانا ہے، اس کے ساتھ صف باندھ لیتے جیسے ان کی پرہیز گاری

اپنے آپ کو محسوس کرانے کے لیے اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان نمازوں کے دوران بریگیڈیئر ٹی ایم اپنی پشت نمازیوں کی جانب کیے رہتا، اور رسائی کے تمام ممکنہ راستوں پر کڑی نظر رکھے رہتا۔ شروع شروع میں یہ بات جنرل ضیا کے ضمیر پر بوجھ بنتی، اور اس نے ٹی ایم سے کہا بھی کہ اسے نماز میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو سکنا کیسا لگتا ہے۔

'ڈیوٹی عبادت ہے، سر۔' اس نے کہا۔ 'اگر میں محاذ پر ہوتا تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھی جاتی کہ میں اپنی بندوق رکھ کر نماز پڑھوں گا۔' اس کے بعد جنرل ضیا کو ہمیشہ اپنی دعا میں ٹی ایم کے لیے کچھ الفاظ شامل رکھنا یاد رہتا، اور وہ اللہ کو یاد دلاتا کہ بریگیڈیئر اس لیے نماز نہیں پڑھ پا رہا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے۔

بریگیڈیئر ٹی ایم کی نگاہیں کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے اور اشیا کے نئے لُس اور مختلف ہو چکے رنگوں سے بیزاری محسوس کرنے لگیں۔ ٹی ایم جانتا تھا کہ سیکیورٹی یہی نہیں کہ آپ کسی قاتل کی گولی کے آگے اپنا سینہ رکھ دیں یا کسی امکانی سازشی کی انگلیوں کے ناخن اُکھاڑ لیں؛ سیکیورٹی کا تو مطلب ہے روزمرہ زندگی کے پیٹرن میں ہلکی پھلکی سی بھی تبدیلی کا پہلے سے اندازہ کر لینا۔ 'تمام فائلیں جنرل اختر کے پاس ہیں، سر۔ تمام مشکوک لوگوں کے بارے میں الگ الگ فائلیں۔ اور تمام امکانی منظر ناموں کے بارے میں بھی۔' اس نے اُس سے نظریں ہٹائے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں اس دیوار کو جانچ رہی تھیں جہاں اب ملک کے بانی کا ایک پورٹریٹ لگ چکا تھا، وہ پورٹریٹ جو اس نے پہلے وہاں نہیں دیکھا تھا۔

'وہ فائلیں جھوٹ بولتی ہیں۔ میں تم م م سے پوچھ رہا ہوں۔ جنرل اختر سے نہیں۔ میرا سایہ تم ہو، معلوم بھی تمھیں ہونا چاہیے۔ جو بھی مجھ سے ملاقات کرنے آتا ہے اسے تم دیکھتے ہو؛ اس گھر کے ہر کونے کھدرے کا علم تمھیں کو ہے۔ یہ تمھارا کام ہے کہ میرا تحفظ کرو۔ تمھارے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے میں یہ جاننے کا مطالبہ کرتا ہوں: تم مجھے بچا رہے ہو تو کن لوگوں سے؟ مجھے مارنا کون چاہتا ہے؟' جنرل ضیا کی آواز بلند ہوئی، اس کی

بھینگی آنکھیں ایک دوسری میں الجھ کر رہ گئیں، تھوک کے دو مرغولے اس کے ہونٹوں سے نکلے، ایک جنرل کی مونچھوں میں اٹک گیا اور دوسرا اس کے قدموں میں بچھے ایرانی قالین پر بنے شراب کے جام اور پھولوں میں جذب ہو گیا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم اس انداز میں مخاطب کیے جانے کا عادی نہیں تھا۔ اسے ہمیشہ سے معلوم تھا کہ جب بھی وہ دونوں اکیلے ہوتے تھے جنرل ضیا اس کی جسمانی موجودگی سے کچھ خوف سا محسوس کرتا تھا اور جب اور لوگ آ جاتے تھے تبھی آرام محسوس کرتا تھا۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کو ان معاملات کی تربیت حاصل تھی اور اسے فوراً ہی پتا چل گیا کہ اس کی بلند آواز، اس کا جواب طلب لہجہ، درحقیقت خوف کی آواز ہے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کو خوف کی بو سونگھنے کا بہت تجربہ تھا۔ جب آپ زیرِ تفتیش افراد سے آخری سوال پوچھ لیتے تھے، جب انھیں معلوم ہو جاتا تھا کہ اب وضاحتوں کا وقت ختم ہو چکا ہے، جب انھیں احساس ہو جاتا تھا کہ تفتیش ختم ہو چکی ہے اور اب عدالت میں مزید کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ صرف اسی وقت وہ اپنی آواز بلند کیا کرتے تھے، چلّاتے تھے، یہ ظاہر کرتے تھے کہ انھیں کوئی خوف نہیں۔ لیکن آپ اس کی بو سونگھ سکتے تھے جیسے آپ اس کی بو ایک ایسے بکرے میں سونگھ لیتے ہیں جسے ذبح کیا جانے والا ہو؛ جس کے ہونٹوں پر ممیاہٹ ہوتی ہے اور ٹانگوں سے پیشاب بہہ رہا ہوتا ہے، یا جیسے ایسا آدمی چلّاتا ہے جس کے کمرے میں آپ داخل ہو جائیں اور اپنے پیچھے اس کا دروازہ بند کر لیں۔

'ہر ایک سے۔' اس نے کہا۔

جنرل ضیا مشوش ہو کر اپنے صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ 'مطلب کیا ہے تمھارا، بریگیڈیئر طاہر مہدی؟ کون؟' وہ چلّایا اور اس مرتبہ اس کا تھوک ٹی ایم کے چہرے پر پھوار کی طرح برسا۔ جب جنرل ضیا آپ سے میرے بھائی، میرے بیٹے، محترم بہن کہہ کر مخاطب نہیں ہوتا تھا اور آپ کو آپ کا نام لے کر پکارتا تھا، تو وہ واقعی برے موڈ میں ہوتا تھا۔ جب وہ آپ کو آپ کے نام کے ساتھ ساتھ آپ کے رینک سے پکارتا تھا، تو غالباً

آپ اپنا رینک اُس سے پہلے ہی کھو چکے ہوتے تھے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کو برخواستگی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ بڑی خوشی سے واپس جا کر اپنے لڑکوں کو تربیت دینے اور بھرپور دُرستی کے ساتھ پیراشوٹ چھلانگیں لگانے کے لیے تیار تھا۔ جنرل ضیا بھی یہ بات جانتا تھا کیوں کہ ایک کم یاب لمحے میں ٹی ایم نے جنرل ضیا کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس کے جسم میں بس چند ہی ہڈیاں بچی ہیں جنھیں اس نے اپنے مقصد کی راہ میں نہیں تڑوایا۔ وہ بہت متفکر محسوس ہوتا تھا۔

'مجھے ہر ایک پر شبہ ہے۔ خود اپنے لڑکوں پر بھی۔'

'تمھارے کمانڈوز؟ وہ تو یہاں دن کے چوبیس گھنٹے موجود رہتے ہیں۔'

'میں انھیں ہر چھ ہفتے بعد ان کے یونٹوں کو بھیج دیتا ہوں اور نئے لڑکے منگوا لیتا ہوں۔ آپ نے نوٹ تو کیا ہوگا۔ ہر ایک پر اعتبار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، سر۔ اندرا گاندھی کو دیکھیں، کیا ہوا اُس کے ساتھ؟'

جنرل ضیا کے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ اندرا کو خود اسی کے دو فوجی محافظوں نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا جب وہ اپنے ہی باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ جنرل ضیا کو اس کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے بھارت جانا پڑا تھا جہاں اس نے وہ نحوست ملاحظہ کی تھی کہ جو ہندو مذہب تھا۔ انھوں نے لکڑی کی ایک چتا تیار کی تھی، اس پر کچھ گھی ڈالا تھا اور پھر اندرا گاندھی کے اپنے ہی بیٹے نے شعلہ جلایا تھا۔ جنرل ضیا وہیں کھڑا دیکھتا رہا تھا جب کہ اندرا کے سفید رنگ کی سوتی ساڑھی میں لپٹے جسم نے آگ پکڑی تھی۔ ایک موقع پر تو ایسا لگا تھا جیسے وہ اُٹھ کر دوڑ پڑے گی لیکن پھر اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ جنرل نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے انھیں پاکستان عطا کیا تھا اور اب ان کے بچوں کو ہر روز زمین پر اس جہنم کا تماشا نہیں دیکھنا پڑتا تھا۔

'تم ان لڑکوں کا انتخاب کیسے کرتے ہو؟ صرف چھ ہفتے کیوں رکھتے ہو انھیں؟ کیا انھیں چھ ہفتے سے پہلے کوئی آئیڈیا نہیں آ سکتا؟'

'ان کے خاندانوں کی وجہ سے؛ ہم چھ ہفتوں تک ان کا خیال رکھتے ہیں۔ میں ان کے پس منظر کا بھی جائزہ لیتا ہوں۔ کوئی اغلام باز، کوئی کمیونسٹ، کوئی خبروں کا شوقین نہیں ہوتا ان میں۔ ایسے لوگ تو آپ کے اردگرد ہوں گے ہی نہیں۔'

'تمھارا مطلب ہے کہ انھیں اخبارات پڑھ کر کوئی آئیڈیا آ جائے گا؟ کیا تم نے اپنے اخبارات دیکھے بھی ہیں؟ میرا خیال ہے تمھیں ان رہ نما خطوط پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔'

'ایک اخبار پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے کسی آدمی میں آپ کے اور آپ کے قاتل کی گولی کے درمیان آ جانے کا ارادہ پیدا نہیں ہوسکتا۔' بریگیڈیئر ٹی ایم نے کہا۔ وہ ابھی تک صوفے، پردے، قالین اور پورٹریٹ کا معمّا سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم کے لڑکے دور دراز کے دیہاتوں سے بھرتی کیے جاتے اور انھیں اتنی سخت تربیت دی جاتی کہ جب ان کی تربیت ختم ہو جاتی تو، اگر وہ اسے واقعی ختم کرنے میں کام یاب ہو جاتے، چوں کہ ان میں سے دو تہائی واپس اپنے گاؤں جانے کی التجائیں کرنے لگتے تھے اس لیے ان کے چہروں پر ایک خالی پن کا احساس ہونے لگتا تھا۔ انھیں پورا پورا دن زمیں میں گڑھے کھدوا اور اگلے ہی روز دوسرے گڑھے بھروا کر ان کے اندر ایسی تابع داری ٹھونس دی جاتی جو سوال بھی نہ کر سکے۔ انھیں سویلین افراد سے اتنے عرصے کے لیے دور رکھا جاتا کہ وہ سول کپڑوں میں ملبوس کسی بھی شخص کو ایک جائز ٹارگٹ سمجھتے۔ جنرل ضیا نے مایوسی میں اپنے ہاتھ پھیلائے اور انتظار کیا کہ ٹی ایم کچھ اور کہے۔

'یہ میرا طریقۂ کار ہے۔' بریگیڈیئر ٹی ایم نے اُٹھتے ہوئے کہا، 'اور اب تک یہی طریقۂ کار بہتر ثابت ہوا ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو ہم کے نائن پلاٹون کو واپس بلوا سکتے ہیں۔'

جنرل ضیا نے اطمینان کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ اس نے 'گارڈ ڈاگ' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

'ہمیں ان غلیظ کُتوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا وہ تمھارے کمانڈوز سے بہتر ہیں؟'

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے باندھ لیے، جنرل ضیا کے سر کے اوپر دیکھا اور اپنے کیریئر کی سب سے طویل تقریر فرمائی۔ 'ہمیں فضائی کور حاصل ہے۔ ہم نے آرمی ہاؤس تک رسائی کے تمام پوائنٹ کور کر لیے ہیں۔ ہم پانچ میل کے قطر میں ہر حرکت کو مانیٹر کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس پانچ میل کے قطر کے باہر کوئی شخص اس وقت سرنگ کھود رہا ہو، طویل اور گہری، جو آپ کے بیڈروم میں آ کر کھلے، تو پھر کیا ہوسکتا ہے؟ ہمیں کوئی زیرِ زمین کور حاصل نہیں۔'

'میں نے اپنی تمام عوامی مصروفیات منسوخ کر دی ہیں،' جنرل ضیا نے کہا۔ 'اب میں سرکاری تقریبات کے لیے بھی ایوانِ صدر نہیں جاؤں گا۔'

اور اچانک بریگیڈیئر ٹی ایم نے خود کو ایک سویلین کی طرح محسوس کیا۔ ظاہر و باہر شے کو سمجھنے میں، جو چیز اسے آنکھوں میں گھور رہی ہے اسے دیکھنے میں، سُستی کرنے والا۔ قالین، پردے اور صوفے نو تعمیر شدہ ایوانِ صدر سے آئے تھے۔ مگر اسے اب تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ پورٹریٹ اس نے کہاں دیکھا تھا۔

'جب تک تم یہ نہیں جان لیتے کہ میری جان کو خطرہ کس سے ہے، میں آرمی ہاؤس نہیں چھوڑوں گا۔ جنرل اختر کی فائلوں کا جائزہ لو۔ میجر کیانی کے پاس ایک مشتبہ شخص موجود ہے۔ اس سے بات کرو۔'

'مجھے ایک روز کی چھٹی چاہیے، سر۔' بریگیڈیئر ٹی ایم نے اس کی توجہ حاصل کرتے ہوئے کہا۔

جنرل ضیا کو پُرسکون رہنے کے لیے اپنا تمام تر ضبط مجتمع کرنا پڑا۔ یہاں وہ اپنی زندگی کو لاحق تمام تر خطرات سے پریشان ہو رہا تھا اور اس کا سیکیورٹی چیف کچھ آرام اور موج مستی کے لیے چھٹی چاہ رہا تھا۔

'میں قومی دن کی پریڈ پر پیراشوٹ چھلانگ کی قیادت کر رہا ہوں، سر۔' بریگیڈیئر

ٹی ایم نے وضاحت کی۔

'میں یہ پریڈ منسوخ کرنے کا سوچ رہا تھا،' جنرل ضیا نے کہا۔ 'لیکن جنرل اختر متواتر اصرار کرتے رہتے ہیں کہ قومی دن کی پریڈ کے بغیر قومی دن منایا ہی نہیں جا سکتا، اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اس دن کی تقریبات کو مختصر کر دوں۔ اس بار ہم پریڈ کے بعد عوام میں گھلنے ملنے والا کام نہیں کریں گے۔ لیکن تم اگر چاہو تو اپنی چھلانگ لگا سکتے ہو۔ میں اس بار اکیڈمی بھی نہیں جاؤں گا۔ وہ لوگ وہاں کوئی سائلنٹ ڈرل کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تمھیں کچھ پتا ہے یہ ہوتی کیا ہے؟'

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے کاندھے اُچکائے اور اس کی آنکھوں نے ایک آخری مرتبہ کمرے کی چھان پھٹک کی۔

کمرا چھوڑنے سے پہلے بریگیڈیئر ٹی ایم سیکیورٹی کی خلاف ورزی کی نشان دہی کرنا نہ بھولا۔ 'سر، اگر آپ ایوانِ صدر سے کوئی چیز یہاں منگوانا چاہیں، مجھے بتا دیا کریں اور میں اس کے لیے سیکیورٹی کلیئرنس کا بندوبست کر دوں گا۔'

جنرل ضیا نے، جو اب بھی اپنے بیڈ روم کے نیچے کھودی جانے والی سرنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا، اپنے ہاتھ ہوا میں اُٹھا دیے اور کہا، 'خاتونِ اوّل ہیں نا۔ مجھے نہیں معلوم یہ عورت چاہتی کیا ہے۔ تم اس سے بات کرنے کی کوشش کر دیکھو۔'

۵

میں بستر پر ساکت لیٹا ہوں اور آنکھیں بند کر کے کچھ سن رہا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ میں سلو مارچ کرتے ہوئے اکیڈمی کے بینڈ کی دھیمی پڑتی ہوئی آواز سن سکتا ہوں۔ ہر آواز فلٹر ہو کر، دھیمی ہو کر آتی ہے؛ روشنی بھی لگتا ہے کہ دھیمی پڑتی جا رہی ہے۔ مجھے شگری پہاڑ پر اپنے گھر کی سہ پہروں کی یاد آ رہی ہے، جہاں پہاڑی کی چوٹی پر روشنی کا ایک چمک دار تالاب آپ کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اب بھی دن کی روشنی بڑی حد تک باقی ہے۔ ایک لمحے سورج کسی رس بھرے کینو کی طرح افق پر نیچے لٹکتا دکھائی دیتا ہے اور اس کی چمک دار روشنی میں بلند ترین پہاڑیاں نہائی نظر آتی ہیں۔ اگلے ہی لمحے کسی دور دراز پہاڑی پر جلنے والی آگ کا ایک شعلہ، دکھائی دینے والی واحد روشنی رہ جاتا ہے۔ پہاڑوں کی رات آسمانوں سے پھینکی ہوئی کسی سیاہ چادر کی طرح ہوتی ہے۔ دن اپنا سامان باندھ کر رخصت ہونے سے پہلے کسی کو نوٹس نہیں دیتا، نہ کسی کو باقاعدہ طور پر خدا حافظ کہتا ہے۔

بالکل بے بی او کی طرح۔

میں پہاڑوں کے دھندلکے کو اپنے ذہن سے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنی موجودہ مصیبت پر توجہ دیتا ہوں۔ گم ہو جانے والے دن کے بارے میں اداسی اب بھی موجود ہے لیکن پردے کے دوسری جانب فون موجود ہے اور عُبید ان لوگوں میں سے

نہیں جو اپنے پسندیدہ رومال پر نمبر لکھیں اور ان کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔

میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں اور پردے کے دوسری جانب مرد ڈیوٹی نرس کو اخبار پر جھکا ہوا پاتا ہوں۔ میں یہ دیکھنے کے لیے ہلکا سا کراہتا ہوں کہ وہ الرٹ ہے یا نہیں۔ وہ اخبار پر سے اپنا سر اُٹھاتا ہے، بس یوں ہی میری جانب دیکھتا ہے اور پھر سے اپنے اخبار کے ساتھ مصروف ہو جاتا ہے۔

اپنے یوگی دور میں عُبید نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر آپ باقاعدگی سے گیان دھیان کرتے رہیں تو آپ لوگوں کو اپنی مرضی کے کام کرانے پر مجبور کر سکتے ہیں، یہی چھوٹے موٹے کام۔ اگر آپ ایک اجنبی کی گردن پر بہت دیر تک دیکھتے رہیں تو وہ مُڑ کر آپ کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ عُبید نے کئی مرتبہ اس کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ اس میں کام یابی ہو بھی جائے تو کبھی کبھی ہی ہوتی ہے اور کسی کو پوائنٹ الف سے پوائنٹ بے تک حرکت کرنے پر مجبور کرنا ایک اور بھی بڑا چیلنج ہے۔ میرا تجربہ زیادہ نہیں، لیکن میں گھورتا ہوں، گھورے چلا جاتا ہوں اور تقریباً نصف صدی کے بعد نرس اُٹھتا ہے اور وہاں سے چل دیتا ہے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ نماز پڑھنے گیا ہے یا قبل از وقت ڈنر کرنے۔ شاید اس کی شفٹ ختم ہو گئی ہو۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ مجھے ملنے والا واحد موقع ہے۔

میری اعضا حرکت میں آتے ہیں تو ہر کام بہت تیزی سے مکمل ہو جاتا ہے؛ شرٹ، بوٹ، بیلٹ، تلوار، ٹوپی میرے جسم پر اپنی جگہ ایسے ڈھونڈ لیتے ہیں جیسے کسی تجربہ کار سپاہی کے ہاتھ میں رائفل کے مختلف حصّے آپس میں جڑ جائیں۔ ٹیلے فون کی ڈائل ٹون اونچی اور واضح ہے اور میں جلدی سے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیتا ہوں، جیسے دوسری جانب عُبید ہی فون اُٹھانے والا ہو۔

جب میں آخری دو اعداد ڈائل کر رہا ہوتا ہوں تو میری ناک میں ڈن ہل سگریٹ کی ہلکی سی بو آتی ہے۔ میرا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ کوئی سالا ڈھکن بک بے میں سگریٹ

پی رہا ہے۔ میرا مورال اس خیال سے بلند ہو جاتا ہے کہ میں اپنی فون کال ختم کرنے کے بعد غالباً اس سے ایک سگریٹ بھی حاصل کر سکوں گا۔

فون دوسری رنگ پر اُٹھا لیا جاتا ہے۔ آپریٹر، جو بہت زیادہ کالز سننے کا عادی رہا ہے، ایک نیوٹرل قسم کے لہجے میں جواب دیتا ہے؛ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے، اس بارے میں فیصلہ وہ تبھی کرے گا جب وہ میرا رینک شناخت کر لے اور معمولاتِ زندگی میں میری حیثیت متعین کر لے۔

'السلام علیکم، آرمی ہاؤس۔' آپریٹر کہتا ہے اور اس جگہ سے کنیکٹ ہو جانے کا شاک اس بات پر سکون سے گھل مل جاتا ہے کہ آپریٹر کوئی سویلین لگتا ہے۔ ان لوگوں کو متاثر کرنا عموماً آسان ہوتا ہے۔

'خان صاحب۔' میں شروع کرتا ہوں۔ 'میں جنرل ضیا کا ایک رشتے دار ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میری اُن سے بات نہیں کرا سکتے، لیکن کیا آپ ایک ارجنٹ پیغام لے سکتے ہیں؟'

'آپ کا نام، سر؟'

'انڈر آفیسر علی شگری۔ ولد کرنل قلی شگری۔ مرحوم کرنل شگری۔' میں ہمیشہ یہ حصّہ بیان کرنا مشکل پاتا تھا، لیکن یہ نام کام دکھاتا ہے اور اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے سنا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسے واقعی میں یقین آ گیا ہو کہ میں جنرل کا رشتے دار ہوں، لیکن اس نے ظاہر ہے کہ کرنل شگری کے بارے میں سن رکھا ہے۔ آرمی ہاؤس میں کون ہے جو کرنل شگری کے بارے میں نہیں جانتا؟

'کیا آپ کے پاس پین اور کاغذ ہے؟'

'یس، سر۔'

'لکھیے: کرنل قلی شگری کے بیٹے نے کال کی تھی۔ وہ اپنا آداب کہتا ہے۔ وہ اپنا سلام کہتا ہے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ سلام۔'

'یس، سر۔'

'وہ کہتا ہے کہ وہ غائب ہو جانے والے جہاز کے بارے میں کوئی بہت اہم، بہت ارجنٹ انفارمیشن دینا چاہتا ہے۔ یہ معاملہ۔۔۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟'

وہ اثبات میں جواب دیتا ہے اور میں اپنے پیغام کے لیے کوئی توجہ کو جکڑ لینے والا اختتام سوچنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتا ہوں:

۔ دنیا میں میرا واحد دوست خطرے میں ہے۔ اگر وہ آپ لوگوں کے پاس ہے، تو اس سے ذرا اچھا سلوک کریں۔

۔ میرے پاس سی آئی اے کی کوئی ٹاپ انفارمیشن ہے جو میں کسی اور کو دینے کے لیے اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

۔ مہربانی کر کے مجھے بچا لیں۔

'یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔' میں کہتا ہوں۔ 'انھیں یہ پیغام بہ راہِ راست آپ سے ملنا چاہیے۔'

آواز سننے سے پہلے مجھے کمرے میں ڈن ہل کے دھوئیں کی خوش بو آتی ہے۔ میں اس خوش بو کو اپنے تابوت میں بھی شناخت کر لوں گا۔

'انڈر آفیسر علی؟'

یہ حقیقت کہ آواز نے مجھے میرے پہلے نام سے پکارا، مجھے فون اچانک نیچے رکھ دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

انٹر سروسز انٹیلی جینس کا میجر کیانی دروازے کے راستے میں کھڑا ہے، ایک ہاتھ دروازے پر اور دوسرا اپنے سینے کے ساتھ ایک سگریٹ تھامے ہوئے۔ وہ سویلین کپڑوں میں ملبوس ہے۔ وہ ہمیشہ سویلین کپڑے پہنتا ہے۔ بوسکی کی شلوار قمیض، اچھی طرح استری کی ہوئی، بلب کی روشنی میں اس کے جیل لگائے ہوئے بال چمکتے ہوئے، اور بالوں کا ایک کُنڈل اس کے ماتھے کے درمیان اس جگہ بڑی احتیاط سے ٹھہرایا ہوا جہاں اس کے گھنے

ابرو ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

میں نے اسے کبھی وردی میں نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اس کے پاس وردی ہے بھی یا نہیں، یا اسے وردی پہننا آتی بھی ہے یا نہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے ڈیڈ کے جنازے پر دیکھا تھا؛ اس کے گال ذرا سے پچکے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں مخلص دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن پھر وہاں بہت سے لوگ تھے اور میں یہ سمجھا کہ وہ ڈیڈ کے شاگردوں میں سے ایک ہوگا جو گھر میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے، معاملات دیکھ رہا ہے اور ڈیڈ کے کاغذات سنبھال رہا ہے۔

'مجھے اندازہ ہے کہ یہ تمھارے لیے بہت تکلیف دہ ہے، لیکن کرنل صاحب یہ سب کچھ جلد از جلد نمٹانے کی خواہش کرتے۔' اس نے ایک سفید رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا، جب ہم نے ڈیڈ کا قومی پرچم میں لپٹا تابوت شگری پہاڑ پر ان کے پسندیدہ سیب کے درخت کے نیچے دفنا دیا تھا۔

دس منٹ کے اندر اندر اس نے میری طرف سے ایک بیان ڈرافٹ کر کے مجھ سے اس پر دست خط بھی کرا لیے۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ خاندان کے واحد مرد رکن کی حیثیت سے میں ان کا پوسٹ مارٹم نہیں کرانا چاہتا، مجھے کسی پر گڑ بڑ کا شبہ نہیں اور مجھے کوئی خودکشی کا نوٹ نہیں ملا۔

'تمھیں جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو، مجھے کال کرنا۔' اس نے کہا تھا اور مجھے کوئی فون نمبر دیے بغیر چلا گیا تھا۔ مجھے کبھی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس سے تو کبھی نہیں۔

'آئی سی، تم تو بڑے تیار شیار ہو اور کہیں جانے کی تیاری ہے۔' وہ کہتا ہے۔

میجر کیانی جیسے لوگوں کو شناخت کے لیے کسی کارڈ، کسی گرفتاری کے وارنٹ کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ انھیں سارا کام قانونی انداز سے سرانجام دینے یا آپ کی اپنی بھلائی کے لیے کرنے کا بہانا گھڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایک سفاک سکوت ہوتا ہے۔ ایک ایسے آدمی کا سکوت جو اسپتال کے کمرے میں سگریٹ جلاتا ہے اور

راکھ دان کی حیثیت سے کسی چیز کو استعمال کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھتا۔

'ہم کہاں جا رہے ہیں؟' میں پوچھتا ہوں۔

'کسی ایسی جگہ جہاں ہم بات کر سکیں۔' اس کا سگریٹ ہوا میں ایک بے سمت سی لہر بناتا ہے۔ 'یہ جگہ بیمار لوگوں سے بھری پڑی ہے۔'

'کیا میں زیرِ حراست ہوں؟'

'اتنا ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

باہر بغیر نمبر پلیٹ والی ایک ٹویوٹا کرولا کھڑی ہے، اُنیس سو اٹھاسی کے اوائل کا ایک سفید رنگ کا ماڈل۔ یہ اب بھی مارکیٹ میں دست یاب نہیں ہے۔ کار چمک رہی ہے اور اس کی سفیدی بے داغ ہے، اور اس میں اسی رنگ کے کلف لگے سوتی سیٹ کور ہیں۔ جب وہ کار اسٹارٹ کرتا ہے تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم باہر جا رہے ہیں، یہاں سے باہر، کسی ایسی جگہ جو بہت قریب نہیں، کسی ایسی جگہ جو بہت خوش گوار نہیں۔

میں ابھی سے اپنے ڈورم، اپنے سائلنٹ ڈرل اسکواڈ، بلکہ اپنے سیکنڈ اِن کمانڈ او آئی سی کے اداس، طنزیہ فقروں کو مِس کرنے لگتا ہوں۔

کار بہت خالی ہے۔ میجر کیانی اپنے ساتھ کوئی بریف کیس، یا فائل یا ہتھیار نہیں رکھتا۔ میں اس کے سامنے ڈیش بورڈ پر پڑے سگریٹوں کے پیکٹ اور گولڈ لائٹر کو بھوکی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے پیچھے کو ٹیک لگا لیتا ہے اور اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر نرمی سے ٹکے ہوئے ہیں۔ میں اس کی گلابی، مینی کیور شدہ انگلیاں دیکھتا ہوں، ایک ایسے آدمی کی انگلیاں جسے کبھی کوئی حقیقی کام کرنا نہیں پڑا۔ اس کی جلد پر ایک نظر ڈالنے سے ہی آپ بتا دیں گے کہ وہ بوٹ لیگ سکاچ وِسکی اور چکن قورمے کی متواتر خوراک اور اپنی ایجنسی کے سیف ہاؤسز کی داشتاؤں کی ایک نا ختم رسد پر پلتا رہا ہے۔ ذرا اس کی کوبالٹ جیسے نیلی رنگ کی ڈوبی ہوئی آنکھیں دیکھیں اور آپ بتا دیں گے کہ یہ اس قسم کا آدمی ہے جو فون اُٹھاتا ہے، ایک طویل فاصلے کی کال کرتا ہے اور ایک

پُر ہجوم بازار میں ایک بم پھٹ جاتا ہے۔ وہ غالباً آدھی آدھی راتوں کو اپنی کرولا کی ہیڈلائٹس آف کر کے کسی مکان کے باہر انتظار کرتا ہے جب کہ اس کے لوگ دیوار پھلانگ کر کسی بے یار و مددگار سویلین کی زندگی از سرِ نو مرتّب کرتے ہیں۔ یا پھر، جیسے کہ میں اپنے ذاتی تجربے سے جانتا ہوں، وہ کسی حادثاتی موت یا وضاحت طلب خودکشی کے بعد جنازے پر خاموشی سے ظاہر ہوتا ہے اور معاملات کو ایک چھوٹے سے صاف شفاف بیان کے ذریعے نمٹا دیتا ہے، کوئی کھونٹ ڈھیلی رہ گئی ہو تو اس کا خیال رکھتا ہے، آپ کو پوسٹ مارٹم اور غیر ملکی پریس کے عذاب سے بچاتا ہے جو اعزاز یافتہ کرنلوں کے چھت والے پنکھوں سے جھولنے پر قیاس آرائیاں کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنے ڈن ہل کے پیکٹ، ایک گولڈ لائٹر اور ایک غیر رجسٹر شدہ کار کی مدد سے دنیا کو چلا رہا ہے۔

وہ اپنی کار کے گلَو کمپارٹمنٹ تک ہاتھ بڑھاتا ہے اور کسی ٹیپ کی تلاش میں ہاتھ مارتا ہے۔

'آشا یا لتا؟' وہ پوچھتا ہے۔

میں ہتھیلی کے جتنا ایک ہولسٹر اور ایک سُرمئی دھات کے پستول کا ہاتھی دانت سے بنا ہینڈل ملاحظہ کرتا ہوں اور اچانک خود کو پرسکون محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اس کی کار کے گلَو کمپارٹمنٹ میں ایک پستول کی موجودگی اس سفر کو حق بہ جانب ثابت کرتی ہے۔ وہ جہاں بھی مجھے لے جانا چاہتا ہے، لے جا سکتا ہے۔

آپ کو سچ سچ بتاؤں کہ میں لتا اور آشا کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ دونوں بڈھی، موٹی اور بھدّی انڈین بہنیں ہیں اور گاتی ایسے ہیں جیسے وہ ٹین ایج کی جنسی بلّیاں ہوں۔ ایک کی آواز غالباً دوسری سے زیادہ سیکسی ہے، پتا نہیں کس کی۔ لیکن پورے ملک میں آشا کو پسند کرنے والوں اور لتا کو پسند کرنے والوں کے درمیان جنگ کی لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ چائے یا کافی؟ کوک یا پیپسی؟ ماؤ نواز یا لینن نواز؟ شیعہ یا سنی؟

عُبید کہا کرتا تھا کہ یہ بہت آسان ہے۔ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہوتا

چاہیے کہ آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں اور کیسا محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی لایعنی بات میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

'ثنا،' میں کہتا ہوں۔

وہ کہتا ہے کہ میرا ذوق میرے ڈیڈ کی طرح اچھا ہے اور کیسٹ پلیئر میں ایک ٹیپ ڈال دیتا ہے۔ ٹیپ میں کوئی مرد فوک گلوکار غزل گا رہا ہے، صحرا میں کوئی دیوار اُٹھا دینے کے بارے میں تاکہ کوئی بھی محبت کرنے والے آواروں کو تنگ نہ کر سکے۔

'پریشان مت ہو،' وہ کہتا ہے۔ 'ہم جانتے ہیں کہ تم ایک اچھی فیملی سے ہو۔'

۶

جنرل ضیا کے عوامی زندگی سے غائب ہونے کے بعد اسلام آباد میں ایک ایسا شخص تھا جسے اپنی زندگی کا معیار بہتر ہونے کی امید تھی۔ یہ تھا ایک نو بیاہتا، گنجا ہوتا ہوا، پینتالیس سالہ سفارت کار۔ ایک ایسا شخص جو اپنی چھیالیسویں سال گرہ منانے کے لیے زندہ نہیں رہنے والا۔

آرنلڈ رافیل اپنے کچن میں اروگولا سلاد کے پتے دھو رہا تھا۔ اس کا کچن اس کے گھر کا ایک ایسا حصہ تھا جس سے وہ زیادہ مانوس نہیں تھا۔ امریکا کے کسی بھی دوسرے سفیر کے کچن کی طرح یہ کچن بھی امریکی وزارتِ خارجہ کے اس روشن ترین ستارے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا جو دو افراد کے لیے رات کا کھانا تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا، بلکہ یہ کچن باورچیوں، بیروں اور ان کے معاونین کی پوری ٹیم کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آرنلڈ رافیل اپنی بیوی نینسی کو، جسے وہ قربت کے لمحات میں کپ کیک کہہ کر پکارتا، عین اسلام آباد کے قلب میں فوگی بوٹم[1] شام فراہم کر کے حیران کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کام کرنے والے عملے سے کہہ دیا تھا کہ شام کو چھٹی کر لے، اپنے کیمونی کیشن روم سے کہہ دیا تھا کہ وہ تمام اہم کالیں فرسٹ سیکرٹری کی قیام گاہ کو منتقل کر لے اور اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم،

[1] فوگی بوٹم: امریکی محکمۂ خارجہ کے دفاتر پہلے پہل واشنگٹن کے ایک جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے دلدلی علاقے فوگی بوٹم میں قائم کیے گئے تھے۔ اب امریکی محکمۂ خارجہ کو بھی کبھی کبھار فوگی بوٹم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مترجم

ڈائننگ ہالوں اور مہمانوں کے سویٹ کے دروازے بند کر دیے تھے۔ ٹینس کے اپنے ہفتہ وار کھیل سے واپس آ کر جب نینسی واپس آئے گی تو وہ دیکھے گی کہ وہاں فقط وہ دو ہی ہیں، اپنے لونگ ایریا میں، اور ارد گرد کوئی نوکر چاکر رات کے کھانے سے متعلق کسی قسم کی ہدایات کا منتظر نہیں۔ ایک شام کے لیے وہ دونوں ایک نو بیاہتا جوڑے کی سی زندگی گزاریں گے؛ رات کا کھانا جلدی کھائیں گے جیسے وہ واشنگٹن میں اپنے دو بیڈ روم کے فلیٹ میں کرتے تھے اور پھر نیشنل فٹ بال لیگ کے ایک اہم مقابلے میں گرین بے پر ریڈ سکنز کی فتح دیکھنے کے بعد نہایت فطری انداز میں وصال کا کھیل کھیلیں گے۔

مردہ خانے کے سائز جتنے فریج میں بیئر ٹھنڈی ہو رہی تھی، سفید سرامک کی پلیٹوں میں ہوائین (Hawaiian) اسٹیک میرینیٹ کیا جا رہا تھا۔ آرنلڈ نے اپنا ڈش انٹنا کی پروگرامنگ پہلے ہی درست کرا لی تھی تاکہ وہ میچ دیکھ سکیں اور اب وہ زیتون کے تیل اور کالی مرچ پیسنے والے گرائنڈر کی تلاش میں کچن کی درازیں چھان رہا تھا۔ وہ اپنے اٹھارہ بیڈ روم پر مشتمل سفارتی محل کی خار دار تاریں لگی دیواروں کے پیچھے ایسٹ کوسٹ کا سا کوئی منظر تخلیق کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی قیام گاہ کے باہر سکیورٹی کے جو تین مختلف قسم کے حصار ہیں، چھت پر جو اتنے بہت سے انٹینے اور سیٹلائٹ ڈشیں لگی ہوئی ہیں اور سارے لونگ ایریا میں جو مختلف رنگوں کے ٹیلے فون رکھے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں نہ سوچے۔

آرنلڈ اسے ایک یادگار شام بنانا چاہتا تھا۔ وہ گھریلو قسم کا سفارت کار نہیں تھا، لیکن اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ نینسی نے محکمۂ خارجہ میں خود اپنے کیریئر کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ اس منحوس شہر میں رہ سکے۔ اب ایک شام کے لیے سب کچھ انھی پرانے دنوں جیسا ہوگا جب وہ اپنے واشنگٹن کے دفتر میں طویل گھنٹے صرف کرنے کے بعد گھر آ کر باری باری کھانا بناتے تھے، نینسی لازانیا کی کوئی اور قسم بناتی تھی اور آرنلڈ اپنی باری آنے پر کوئی چائنیز کھانا گھر پر منگوانے کی اچانک تڑپ

محسوس کرتا تھا۔ اسلام آباد سازشوں اور ڈنر پارٹیوں کا ایک مرغولہ تھا؛ یہاں ایک دن میں اتنے کھانے نہیں کھائے جاتے تھے جتنے ہر گھر میں سی آئی اے کے سب کانٹریکٹر اور باورچی پائے جاتے تھے۔ نینسی نے خود کو نینسی بیگم کہنا شروع کر دیا تھا، ایک گھریلو خاتون جسے گھر پر کوئی کام نہیں تھا۔

آرنلڈ نے زیتون کے تیل کے لیے اپنی تلاش ترک کر دی تھی اور ریڈ سکنز کا ترانہ گنگناتے ہوئے فریج سے بڈویزر بیئر نکال رہا تھا جب اس کے سرخ ٹیلے فون کی گھنٹی بجی۔ صرف تین لوگ تھے جو اُسے اس فون پر کال کر سکتے تھے اور اُن میں سے کسی کی کال کو بھی وہ فرسٹ سیکرٹری کی طرف منتقل نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً یہ واشنگٹن سے اُس کا باس جورج شلز ہوگا۔ فوگی بوٹم میں یہ لنچ کا وقت ہوگا اور وزیرِ خارجہ اپنی کال مختصر رکھتا تھا اس لیے آرنلڈ نے سوچے بغیر فون اُٹھا لیا اور کسی مختصر سی سفارتی اپ ڈیٹ کے لیے تیار ہو گیا۔

لائن پر جنرل ضیاء الحق تھا، اس کے میزبان ملک کا صدر، ہمیشہ کی طرح شائستہ اور بے مقصد: نینسی کی صحت کیسی ہے، وہ مقامی موسم کے ساتھ کس طرح ایڈجسٹ کر رہی ہے، کیا نوکروں چاکروں کے ساتھ اس کے معاملات ٹھیک چل رہے ہیں، کیا وہ جلد بچے پیدا کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں؟ آرنلڈ جواب دیتا گیا: نینسی کو اسلام آباد سے عشق ہے، اس نے اردو کا سبق لینا شروع کر دیا ہے، وہ اتنے زیادہ نوکروں چاکروں کی موجودگی کی عادی ہو رہی ہے، وہ کسی روز خاتونِ اوّل سے ملاقات کر کے انتہائی خوش ہوگی۔

’آرنی، آپ انھیں یہاں کیوں نہیں لے آتے؟‘ جنرل ضیا جب اسے آرنی کہتا، وہ خواہش مند ہوتا کہ آرنلڈ رافیل اپنے سفارتی فرائض سے بڑھ چڑھ کر کوئی کام کرے۔

’یقیناً، جنابِ صدر۔ کسی اصلی سفارت کار کو گھر پر کھانا کھانا ہی نہیں چاہیے۔ میں تو بس آپ کی جانب سے دعوت کا منتظر ہوں۔‘

’میں جانتا ہوں کہ ایسی چیزیں ایڈوانس میں طے کر لی جانی چاہئیں، لیکن ڈنر پر

ہمارے ساتھ ایک اور امریکی دوست بھی ہوگا اور وہ بھی آپ سے ملنا بہت پسند کرے گا۔'

آرنی نے اپنے ہوائین اسٹیک کو دیکھا اور اسے عجلت نے آ لیا۔ کہیں شمالی امریکا کے پاکستانی ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن کے مہمان وفد کے ساتھ کوئی اور بات چیت کا سیشن ہی نہ ہو، آرنی نے سوچا۔ یا پھر نیو جرسی کے کسی اللہ مارے نواح میں کسی مجوزہ مسجد کے ماڈل پر بات چیت میں شام غارت نہ کرنی پڑ جائے۔ کسی ایسی بحث میں حصّہ لینا نہ پڑ جائے کہ مینار کو کس طرح سے بنایا جائے کہ وہ اسلامی فنِ تعمیر کی حسیّت کا بھی غماز ہو اور امریکا کی جمالیاتی اقدار سے بھی مخاصم نہ ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جنرل پر یہ بات کیسے واضح کی جائے کہ اسے سفارت کار کی حیثیت سے جو کام دیا گیا ہے اس میں شمالی امریکا میں اسلام کے فروغ کے لیے بھاڑے کا ٹٹو بننے کا ذکر کہیں بھی نہیں۔ وہ کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھا جو کافی حد تک سفارتی نوعیت کا ہو، کچھ نینسی کے پیٹ میں خرابی سے مُتعلّق یا مقامی اخبارات کے مدیران کو گھر بلانے سے مُتعلّق؛ دونوں فضول بہانے ہیں، وہ جانتا تھا۔ اس کے گھر کے اسٹاف نے غالباً پہلے ہی جنرل کو رپورٹ دے دی تھی کہ سفیر صاحب نے آج گھر پر ہنی مون منانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے اور جنرل کو یہ بات تو یقیناً معلوم ہی ہوگی کہ کس وقت کن مقامی مدیران کو کہاں پر بلایا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ آرنی کوئی بات کر سکتا، جنرل نے ایک ننھی گھریلو شام کے اس کے تمام خواب توڑ دیے۔ 'ڈنر پر بل بھی آ رہا ہے۔' اس نے کہا۔

'بل کیسی؟' آرنی نے پوچھا اور اس دوران اسے احساس ہوا کہ یہ سوال ریاست ہائے متحدہ کے سفیر کے شایانِ شان نہیں۔ اس نے سوچا کہ لینگلے میں اس کے دوست سائیگون کے بعد اسے سب سے بڑی ذمّے داری سونپنے کے بعد اب اس کا دھڑن تختہ تو نہیں کرنے والے۔ 'فرق یہ ہے کہ یہاں تمھیں شکست کو نہیں، فتح کو سنبھالنا ہے۔' بل نے اسے کہا تھا۔ سفارت خانے میں بل کے لوگ ویسے بھی بہت تھے، ثقافتی، اقتصادی اور ملٹری اتاشیوں کی ٹکون سے لے کر پولیٹیکل افسران اور کمیونی کیشن اینالسٹ تک۔ کبھی کبھی تو

آرنلڈ سوچتا کہ اس کا باورچی بھی کہیں اپنے پکوانوں کے نسخے لینگلے سے تو نہیں منگواتا۔ اسے اس سب کی ضرورت کا بھی احساس تھا، کیوں کہ بل اسے یاد دلاتا رہتا تھا کہ سی آئی اے پتا نہیں کہاں کہاں پر سوویت یونین کے خلاف اپنے سب سے بڑے خفیہ آپریشن کے بعد اب سوویت یونین کے خلاف سب سے بڑا خفیہ آپریشن پاکستان سے چلا رہی ہے۔ بل ہر ایک کو یاد دلاتا رہتا تھا کہ انھوں نے افغانستان میں روسیوں کو ان کے خصیوں سے پکڑ لیا ہے۔ بل اپنے پرانے یار رونلڈ ریگن کو بتاتا پھرتا تھا کہ وہاں ہر طرف وائلڈ ویسٹ جیسی کوئی فلم چل رہی ہے اور پگڑیاں پہنے ہوئے افغان، کاؤ بوائے ہیں اور سوویت یونین کی گاف پر ایسے لات مار رہے ہیں جیسے اس سے پہلے کبھی نہیں ماری گئی۔

لیکن یہاں تو آرنلڈ سفیر تھا اور اسے بل کے دورے کے بارے میں جنرل ضیا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ سی آئی اے کا ڈائریکٹر جب چاہتا جس کے پاس چاہتا جا سکتا تھا، لیکن سی آئی اے کے ڈائریکٹر کو بھی سفیر کو ضرور بتانا چاہیے تھا جو، تکنیکی طور پر، اس کا میزبان تھا۔ لیکن آپ بل سے مُتعلّق کر ہی کیا سکتے تھے، اس بل کے بارے میں جس کا نینسی نے نام رکھا ہوا تھا، بل ''روئی کو لائن پر لو'' کیسی؟

جنرل ضیا ہنسا۔ 'فکر مت کرو، یہ صرف ایک غیر رسمی دورہ ہے۔ جب بل شہزادہ نائف سے ملتا ہے تو دونوں پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں، تمھیں پتا ہے۔ ایک گھنٹا پہلے انھوں نے جدّہ سے کال کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کریلے اور بکرے کے گوشت کا سالن کھانا چاہ رہے ہیں جو خاتونِ اوّل نے تب بنایا تھا جب وہ پچھلی مرتبہ یہاں آئے تھے۔ اور میں نے کہا، ''میری بیوی آپ کی بہن ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ بہنیں اپنے بھائیوں کو کھلا کر خوش ہوتی ہیں۔'''

'میں ان کا استقبال کروں گا اور آپ کے ہاں لے آؤں گا۔' آرنی نے کہا۔ اسے اب تک بالکل پتا نہیں تھا کہ بل کب اور کہاں پہنچ رہا تھا۔

'فکر مت کرو۔' جنرل ضیا نے کہا۔ 'وہ دونوں سعودی عرب سے اپنے طیاروں کی

ریس لگاتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں۔ شہزادہ جیت گیا ہے اور پہلے ہی یہاں پہنچ چکا ہے۔ جنرل اختر بل کو لے آئیں گے۔ ان کا جہاز اب اُترنے ہی والا ہوگا۔ آپ یہاں آ جائیں اور اگر نینسی کو کریلے پسند ہیں تو انہیں بھی ساتھ لے آئیں۔

انٹر سروسز انٹیلی جینس کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمان کی اپنی ڈیوٹی سے لگن کسی ترقی کے خواہش مند عام سپاہی کی اپنے کام سے لگن جیسی نہیں تھی۔ جنرل اختر کا اپنے کام کی جانب رویہ کسی شاعر کے جیسا تھا جو اپنی زیرِ تکمیل رزمیہ پر غور وفکر کر رہا ہو؛ جو اپنے تخیل میں جنگوں کو ترتیب دے رہا ہو، کچھ زیریں پلاٹ ایجاد اور کچھ کو مسترد کر رہا ہو، اور شاعری کے تخیل اور منطق کی توجیہ میں توازن پیدا کر رہا ہو۔ اس کا کام اُسے ایک ہی روز میں کسی تفتیشی مرکز سے کسی ریاستی ظہرانے میں اور وہاں سے کسی ہوائی اڈے کے تاریک رن وے پر لے جاتا جہاں اُسے کسی ایسے مہمان کو خوش آمدید کہنا ہوتا جس کی آمد کا وقت اُسے معلوم ہی نہ ہوتا ہو۔ پاکستان کا دوسرا طاقت ور ترین آدمی اندھیرے میں انتظار کھینچنے کی پروا نہیں کرتا تھا، اگر مہمان امریکا کا دوسرا طاقت ور ترین آدمی ہو۔

اگلی مرتبہ جنرل اختر جب کسی ائرفیلڈ پر کھڑا ہوگا تو وہ وردی میں ہوگا، وہ جہاز پر چڑھنا نہیں چاہے گا لیکن محض اپنے چیف کے احترام میں اُسے اس کے لیے مجبور کر دیا جائے گا۔ اور وہ آخری حکم ہوگا جو وہ کبھی بھی بجا لائے گا۔

جنرل اختر نے نارنجی کناروں والے اسلام آباد کے آسمان کو دیکھا اور سوچا کہ اُس کے مہمان کو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔

بل کیسی کا سی ون فور ون سٹار لفٹر، جو اُسے سعودی عرب سے پاکستان لا رہا تھا، اسلام آباد کے باہر ملٹری ائربیس پر چکر لگاتا رہا۔ اسے زمین پر اُترنے کے لیے کلیرنس مل چکی تھی، لیکن بل اب بھی دو گھنٹے کے قیلولے کے بعد تازہ دم ہونے کے مرحلے میں تھا۔ اُس جہاز کا اندرون کچھ کچھ ہوٹل کے کمرے جیسا، کچھ کچھ کمیونی کیشن بنکر جیسا تھا؛ ایک

اُڑتا ہوا کمانڈ سینٹر جس میں جلتی بجھتی بتیوں والی سیاہ دھاتیں اتنی تعداد میں موجود تھیں کہ تین سارجنٹوں پر مشتمل ایک ٹیم اُن پر آنے اور جانے والے پیغامات کی فل ٹائم مانیٹرنگ اور ڈی کوڈنگ کرتے تھے۔ یہاں ماڈیولر فریکوئنسی جیمر بھی تھے جو دس میل کے ایریا میں موجود کسی بھی دوسرے ٹرانسمیٹر پر قابو پا سکتے تھے، ڈجیٹل ڈفلیکٹر تھے جو جیٹ کی جانب آنے والے کسی بھی میزائل کو دوسرے راستے پر لگا سکتے تھے، ڈبل جیمر تھے جو علاقے میں آپریٹ کرنے والے کسی بھی دوسرے جیمر کو جام کر سکتے تھے۔ یہ جہاز پانچ مختلف شناختوں کے تحت اُڑایا جا سکتا تھا، جس کے دوران وہ مختلف براعظموں سے گزرتے ہوئے اپنا کال سائن ایک سے دوسرے میں تبدیل کر سکتا تھا۔ جب یہ سعودی عرب سے چلا تھا تو اس کا کال سائن ڈیوک ون تھا۔ بحیرہ عرب پر کہیں اس کا کال سائن ٹیکسن ون ہو گیا۔

جہاز پر بل کے سویٹ کا معاملہ کم بجٹ کے ہوٹل جیسا تھا؛ ایک ڈبل بیڈ، ایک شاور اور ایک چھوٹا سا ٹیلی وژن۔ اس نے اپنا وقت گزارنے کے لیے شیو کی اور اپنا بیگ پھر سے پیک کیا تاکہ شہزادہ نائف ریس جیت سکے۔ اپنے سعودی ہم منصب کے ساتھ پانچ سال معاملہ کرنے کے بعد بل نے ایک سبق سیکھا تھا: آپ کسی بدو کو صحرا سے باہر لے جا سکتے ہیں، آپ اُسے اُس کے اونٹ سے اُتار کر دنیا کی مہنگی ترین اُڑنے والی مشین فراہم کر سکتے ہیں، لیکن اس کے اندر بیٹھے ہوئے شتربان کو باہر نکالنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ اگر شہزادہ کھانے پر جاتے ہوئے اپنے جہاز کی ریس لگانا چاہتا ہے تو سی آئی اے کا سربراہ اسے یہ موقع ضرور دے گا۔

جب بل کے سی ون فور ون نے رن وے کی جانب رُخ کیا اور پائلٹ نے ائرٹریفک کنٹرول سے رابطہ شروع کیا تو کاؤنٹر جیمر بھی کام کرنے لگے۔ ریڈیو سیلون پر پرانے سنہرے گیت سننے والے ہزاروں سامعین نے اپنے پسندیدہ گانوں کے درمیان بڑے بڑے باجوں کی آواز کی مداخلت محسوس کی جو جہاز کے کور پلس جنریٹر سے آ رہی تھی۔ یہ آمد اتنی خفیہ تھی کہ ائر ٹریفک کنٹرولر بھی، جو وقت بے وقت امریکی ملٹری طیاروں

کی آمد کا عادی تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک وی آئی پی پرواز سے ہم کلام ہے۔ پائلٹ کو بڑے احترام سے ہدایات دیتے ہوئے اس نے سوچا لو ایک اور جہاز آ گیا، امریکی سفارت خانے کے امریکی جاسوسوں کے لیے شراب اور سؤر کے گوشت سے بھرا ہوا۔

جہاز ٹیکسی کرتا ہوا رن وے کے بعید ترین کنارے پر پہنچ گیا اور رن وے کی بتیاں تبھی جلائی گئیں جب جہاز مکمل طور پر ہالٹ ہو گیا۔ رن وے کے ساتھ چھ ایک جیسی سیاہ مرسیڈیز لیموزین پارک کی گئی تھیں۔ چار موٹر سائیکل آؤٹ رائیڈر، یا جنھیں وی آئی پی سیکیورٹی یونٹ میں پائلٹ کہا جاتا ہے، کارواں کے آگے آگے اپنی کاواساکی ون تھاؤزینڈ موٹر سائیکلوں کے ساتھ منتظر کھڑے تھے اور ان کے ہیلمٹ میں لگے ایئرفون ہدایات کے لیے اسٹینڈ بائے تھے۔ جنرل اختر عبدالرحمان نے بل کیسی کو سلیوٹ کیا، ایسا سلیوٹ جو اس کی ایڑھی کی دھپ اور اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے اس کے دائیں ابرو کے متوازی آ جانے کے باعث ایک کامل سلیوٹ تھا۔

'خوش آمدید، فیلڈ مارشل۔' اس نے کہا۔ یہ ڈراما ایک مذاق سے شروع ہوا تھا جب اختر کے ساتھ پہلی ملاقات کے دوران بل اُسے مسلسل جنرل پکارتا رہا تھا۔ 'اچھا، اگر میں جنرل ہوں تو آپ کو تو فیلڈ مارشل ہونا چاہیے، سر۔' اختر نے کہا تھا اور اب جب بھی بل دورے پر آتا، اختر اُسے اسی نام سے پکارا کرتا۔

'چھوڑو، اختر۔' بل کیسی نے ایک مُرجھایا ہوا ہاتھ اپنے ابرو تک اُٹھایا۔ 'میں بہت تھک چکا ہوں۔'

آؤٹ رائیڈر اپنے سائرن ایک ایک کر کے آن کرنے لگے تو جنرل اختر اور بل کیسی چوتھی لیموزین میں سوار ہو گئے۔ سی آئی اے کے اسپیشل آپریشنز گروپ کا ایک دستہ، جو سوٹ میں ملبوس تھا اور جس کے پاس بہ ظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا اور چھوٹی دبلی پتلی اُوزی بندوقوں کے ساتھ پاکستانی کمانڈو دوسری لیموزینز میں سوار ہو گئے اور آرمی ہاؤس کی جانب سفر شروع ہو گیا۔ سویلین لوگوں کے لیے یہ سفر چالیس منٹ کا ہوتا۔ اس وی آئی پی

کانوائے کے راستے میں ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے لیے بنے ہوئے تمام چوراہے بند کر دیے گئے تھے اس لیے اِسے یہ سفر طے کرنے میں بارہ منٹ لگنا تھے، لیکن لگتا تھا کہ جنرل اختر کو کوئی جلدی نہیں ہے۔

'کیا آپ ڈنر سے پہلے ڈرنک لینا چاہیں گے؟ شہزادہ نائف پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں، سر۔'

'اور میرا دوست بھی۔' بل نے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی سے جنرل ضیا کی مونچھ کی نقل اُتاری، 'کیا اسے واقعی اس طرح کے خواب آ رہے ہیں؟'

جنرل اختر کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مُسکراہٹ اُبھری، اس نے اپنا سینہ پھُلایا اور بڑے تشویشانہ لہجے میں بولا۔ 'گیارہ سال بہت بڑا وقت ہوتا ہے۔ وہ کچھ تھک سے گئے ہیں۔'

'مجھے بتا رہے ہو۔' بل اپنی نشست میں دھنستے ہوئے بولا۔ چلو، مجھے ڈرنک بنا دو۔'

جنرل ضیا اپنی ڈنر پارٹیوں میں شراب پیش نہیں کرتا تھا، سرکاری ڈنر میں بھی نہیں، ان لوگوں کے لیے بھی نہیں جو جانے پہچانے شرابی ہوا کرتے تھے۔ جنرل اختر عبدالرحمان اس بات کو اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اپنے مہمانوں کا موڈ اچھا رکھے، چاہے وہ اس کے دفتر میں آئے ہوں یا وہ انھیں گاڑی میں آرمی ہاؤس لے جا رہا ہو۔ اس نے ڈرائیور کی نشست پر تھپکی دی اور پیچھے دیکھے بغیر ایک شخص نے چمڑے کا سیاہ بیگ اُس کی جانب بڑھا دیا۔ اختر نے دو گلاس، ایک چاندی کے رنگ کی برف کی بالٹی اور رائل سلیوٹ وسکی کی ایک بوتل نکالی اور بل کے لیے نصف گلاس شراب اور اپنے لیے پانی کا ایک گلاس تیار کیا؛ اس نے ڈرائیور کو رفتار سُست کرنے کو کہا اور بولا، 'چیئرز۔'

'چیئرز۔' بل نے کہا۔ 'چیئرز تمھارے لیے، جنرل۔ تمھیں یہاں خوب ٹھک ملا ہوا ہے۔' اس نے لیموزین کی کھڑکی پر لگا ہوا پردہ کھول دیا اور سڑک کے کنارے جمع ہجوم کو دیکھنے لگا جو سیکیورٹی پولیس کے ساتھ جُڑے کھڑے تھے اور کانوائے کے جلدی کرنے اور

گزر جانے کے منتظر تھے تاکہ اپنی زندگیوں کا معمول پھر سے شروع کر سکیں۔

'لیکن غم یہ ہے کہ یہاں آپ کہیں بیٹھ کر گاڈ ڈیم شراب بھی نہیں پی سکتے۔ چیئرز!'

سڑک کے ساتھ ساتھ پولیس نے اس وی آئی پی جلوس کے لیے جو حفاظتی حصار بنایا ہوا تھا، اُس کے پیچھے لوگ کھڑے ہوئے تھے اور انتظار کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے: ایک لڑکا عمر کی دوسری دہائی میں تھا جو ہنڈا اسپورٹی پر اپنی پہلی سواری جاری رکھنے کے لیے بے قرار تھا، ایک شرابی شوہر تھا جو گھر پہنچنے سے پہلے اپنے منہ کی بد بو سے چھٹکارا پانے کے لیے دبا دب چھالیہ چبا رہا تھا، ایک گھوڑا تھا جو گھوڑا گاڑی میں حد سے زیادہ بھرے ہوئے مسافروں کے وزن تلے پسا جا رہا تھا اور مسافر یہ راستہ اختیار کرنے پر گھوڑا بان کو صلواتیں سنا رہے تھے اور گھوڑا بان کی ٹانگوں میں سوئیاں سی چبھ کر افیون کی اُس خوراک کا مطالبہ کر رہی تھیں جو اُس نے بڑی دیر سے نہیں لی تھی، سیاہ برقعے سے ڈھکی ایک عورت تھی، جس کے جسم کا واحد کھلا ہوا حصّہ اُس کا وہ بایاں پستان تھا جس سے وہ اپنے شیر خوار کو دودھ پلا رہی تھی، کار میں سوار ایک لڑکا تھا جو اپنی پہلی ڈیٹ پر ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، سات سال کا ایک بچّہ تھا جو اُبلے ہوئے چھولے بیچ رہا تھا جو گرد سے اٹے ہوئے تھے، ایک بوڑھا ماشکی تھا جو بکری کی کھال میں پانی بیچنے کے لیے صدا لگا رہا تھا، ہیروئن کا ایک نشئی تھا جو اپنے اُس ڈیلر کو دیکھ رہا تھا جو سڑک کے اُس پار کھڑا رہ گیا تھا، ایک مولوی تھا جو اپنی مغرب کی نماز سے لیٹ ہو رہا تھا، ایک بنجارن تھی جو گہرے گلابی چوزے فروخت کر رہی تھی، پاک فضائیہ کا ایک ٹرینی افسر تھا جو ایک ٹویوٹا کرولا میں سوار تھا جس کو ڈن ہل سگریٹ پینے والا ایک سویلین چلا رہا تھا، ایک اخباری ہاکر تھا جو آج کی سرخیاں پکار رہا تھا، ایک دین میں موجود سنگاپور ائر لائن کا عملہ تھا جو تین زبانوں میں لطیفہ بازی کر رہا تھا، گھر تک اسلحہ پہنچانے والے دو ڈیلر تھے جو اپنے سوٹ کیسوں کو بڑی پریشانی کے عالم میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں سے پکڑتے تھے، میڈیکل کا ایک سال سوم کا طالب علم تھا جو شالیمار ایکسپریس کے آنے کی توقع میں ریل کی پٹڑی پر

خود کو گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا، ایک میاں بیوی تھے جو اپنی موٹر سائیکل پر افزائشِ نسل کے کلینک سے واپس آ رہے تھے، ایک غیر قانونی بنگالی تارکِ وطن تھا جو اپنا گردہ فروخت کرنے کا منتظر تھا تاکہ وہ پیسہ اپنے وطن بھجوا سکے، ایک اندھی عورت تھی جو صبح جیل سے بھاگ نکلی تھی اور جس نے لوگوں کو یہ یقین دلانے میں سارا دن گزار دیا تھا کہ وہ بھکارن نہیں ہے، عمر کی دوسری دہائی میں گیارہ نوجوان تھے جنھوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور نائٹ کرکٹ میچ کے لیے میدان میں پہنچنے کے لیے بے چین تھے، پولیس اہل کار تھے جن کی چھٹی ہو گئی تھی اور اب وہ اپنے گھر تک مفت کی سواری کے منتظر تھے، رکشے میں بیٹھی ہوئی ایک دُلہن تھی جو بیوٹی سیلون جا رہی تھی، ایک بوڑھا شخص تھا جسے اُس کے بیٹے نے گھر سے نکال دیا تھا اور جس نے وہاں سے پچاس میل دور اپنی بیٹی کے گھر تک چل کر جانے کا عزم کر رکھا تھا، ریلوے اسٹیشن سے آیا ہوا ایک قُلی تھا جس نے ابھی تک اپنی سرخ وردی پہنی ہوئی تھی اور جس نے ایک شاپنگ بیگ میں ایک چمک دار ساڑھی رکھی ہوئی تھی جو اُسے رات کو پہننا تھی، ایک متروک بلی تھی جو اپنے مالک کے گھر کا راستہ سونگھتی پھرتی تھی، سیاہ پگڑی والا ایک ٹرک ڈرائیور تھا جو بھرپور آواز میں اپنے محبوب کے لیے محبت بھرا گیت گا رہا تھا، لیڈی ہیلتھ وزیٹرز سے بھری ایک بس تھی جو انھیں ایک سرکاری اسپتال میں رات کی شفٹ کے لیے لے جا رہی تھی؛ جب ڈھیلے ڈھالے انجنوں سے نکلنے والا دھواں اس دُھند کے ساتھ شامل ہوا جو دھند لکے کے وقت اسلام آباد پر اُتر آتی ہے تو لوگوں کے منتظر دل اضطراب کے مارے پھٹنے کے قریب ہو گئے اور لگتا تھا کہ ان سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال ہے: 'ہمارے بہت سے حکم رانوں میں کون سا والا ہے یہاں؟ اگر اِس کی سیکیورٹی اتنی ہی اہم ہے تو یہ لوگ اُسے آرمی ہاؤس میں بند ہی کیوں نہیں کر دیتے؟'

۷

میں ونڈ اسکرین کے باہر اتنی شدت سے گھورتا رہتا ہوں جیسے گاڑی مَیں ہی ڈرائیو کر رہا ہوں۔ ایسے میں مَیں اسی بات کی داد دے سکتا ہوں کہ میجر کیانی کیسے اس تنگ اور گڑھوں سے بھری سڑک پر کسی اور کو راستہ بھی نہیں دیتا۔ ایک ٹرک سامنے آ جانے کے باوجود وہ اپنی رفتار برقرار رکھتا ہے، گاڑی کی ہیڈ لائٹیں فل کر دیتا ہے، اس کی انگلیاں موسیقی کی دھن پر اسٹیئرنگ وہیل پر بجتی رہتی ہیں اور آخری مرحلے پر ٹرک ہی موڑ کاٹ کر سڑک سے نیچے اتر جاتا ہے۔ میجر کیانی کی کرولا کار اس کے اختیارات ہی کی توسیع لگتی ہے، جس کی نہ آنکھ جھپکتی ہے، جس کے لیے کوئی حدود متعیّن نہیں اور جسے کسی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک بچہ گندم کی ایک تیار فصل والے سنہری کھیت سے اچانک باہر آتا ہے تو میجر کیانی گاڑی کا ہارن بجاتا ہے اور اگلے ایک میل تک اسے بجاتا چلا جاتا ہے۔

شام کے اس وقت ٹریفک کم ہے، زیادہ تر ٹرک اور رات کو چلنے والی بسیں ہیں، یا کبھی کبھار نظر آ جانے والا کوئی ٹریکٹر جس کے پیچھے گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی ایک ٹرالی پر کچھ ٹن گنے لدے ہوتے ہیں اور کچھ گندے مندے بچے ایک یا دو گنے کھینچ لینے کی کوشش میں اس کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم سڑک کے کنارے گھسٹتی ہوئی ایک بیل گاڑی کے قریب سے گزرتے ہیں؛ گاڑی کو کھینچنے والے بیلوں کی آنکھیں ہماری گاڑی

کی ہیڈ لائٹوں کے باعث چندھیا جاتی ہیں؛ بیل گاڑی کے ساتھ چلنے والا کتا بس ایک بار بھونکتا ہے اور پھر تیز رفتار بلا سے بچنے کے لیے ایک طرف ہو جاتا ہے۔

آہستگی سے، بہت آہستگی سے، میرے ذہن میں جواب نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں، ان سوالوں کے جواب جو میجر کیانی لازمی طور پر میری طرف اچھالے گا۔ وہ جاننا چاہے گا کہ میں کیا جانتا ہوں۔ مجھے یہ بات یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ میں اسے جو بھی جواب دوں وہ اس کی جانی ہوئی باتوں اور اس کی مزید جاننے کی خواہش کے درمیان خلیج کو وسیع کر دے۔ میری اس خوش فہمی کی بنیاد ایک فلسفیانہ خیال ہے: میجر کیانی مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاتا اگر وہ کچھ باتیں جانتا ہوتا۔ میں اس کی کرولا گاڑی کے کلف لگے سفید کور والی آرام دہ نشست پر بیٹھا غزلیں نہ سن رہا ہوتا اگر وہ جانتا ہوتا۔ میں اب تک کسی جیپ کے پیچھے، ہاتھوں میں ہتھکڑی اور آنکھوں پر پٹی کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور اب تک مجھے چارج شیٹ کر کے سزا بھی سنائی جا چکی ہوتی۔ یا شاید میں اپنے ہی ڈورم میں اپنے بستر کی چادر کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا۔

میجر کیانی کہاں سے ہے؟

انٹر سروسز انٹیلی جینس سے۔

یہ ایجنسی کرتی کیا ہے؟

تفتیش۔

کیا تفتیش کرتی ہے یہ؟

جس کا اُسے پتا نہیں ہوتا۔

کسی چٹان کے کنارے سے گرنے سے پہلے، مجھے یقین ہے کہ، ہر شخص اپنے آپ کو کوئی ایسی کہانی سناتا ہے جس کا اختتام خوش گوار ہو۔ یہ میری کہانی ہے۔

میری خوش فہمی سیدھی میرے مثانے تک پہنچتی ہے اور میں میجر کیانی سے چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں ہماری منزل تک پہنچا ہی دے، چاہے وہ جو بھی ہو۔ سڑک کنارے لگے

نشانات مجھے بتاتے ہیں کہ ہم لاہور جا رہے ہیں لیکن سڑک پر آدھا درجن موڑ بھی آتے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں کو جاتے ہیں اور میجر کیانی تو غالباً اس جگہ کی مخالف سمت میں سفر کرتا ہے جہاں وہ آپ کو لے جانا چاہ رہا ہوتا ہے۔ ہم ایک ٹریفک جام میں کافی دیر پھنسے رہتے ہیں جو پولیس نے سیاہ لیموزین گاڑیوں کو ہمارے پاس سے گزرنے دینے کے لیے باقی سڑک کو بلاک کر کے پیدا کیا تھا۔

'میں اس پروفیشن سے متعلق جو کچھ بھی جانتا ہوں وہ تمھارے والد کا سکھایا ہوا ہے،' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ 'لیکن لگتا ہے کہ تم نے اُن سے کبھی کچھ نہیں سیکھا۔ یہ امریکی بھی مصیبت ہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس جنونی قسم کے ایڈونچر کے پیچھے تمھارا دوست بینن ہے۔'

'تو پھر میرے بجائے وہ کیوں نہیں سفر کر رہا آپ کے ساتھ؟' میں پوچھتا ہوں۔

'تم جانتے ہو کہ کیوں،' وہ کہتا ہے۔ 'وہ ایک امریکی ہے، ہمارا مہمان۔ اسے تم جیسوں کے ساتھ گھلنا ملنا نہیں چاہیے۔ ڈرل پریڈ اسکوائر کے لیے ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ اسکوائر کے باہر کرتا ہے، مجھے اس سے سروکار ہے۔'

'کیا آپ کو جہاز مل گیا؟' میں کہتا ہوں، اس احتیاط کے ساتھ کہ عُبید کا ذکر نہ کروں۔

وہ اپنا چہرہ میری جانب کرتا ہے؛ ایک ٹرک ہماری جانب بڑھتا ہے؛ میں اپنی نشست پر اُچھلتا ہوں اور ڈیش بورڈ کو تھام لیتا ہوں، وہ کار کو تیزی سے ایک سروس روڈ پر موڑتا ہے اور سڑک کنارے بنے ہوئے ایک ریسٹورنٹ کے قریب گاڑی کھڑی کر دیتا ہے۔ وہ گاڑی کا گلو کمپارٹمنٹ کھولتا ہے، پستول باہر نکالتا ہے اور اسے اپنی شرٹ کے نیچے اڑس لیتا ہے۔

وہ کار کا دروازہ کھولتا ہے اور پھر میری جانب مُڑ کر دیکھتا ہے۔ 'تم اور تمھارا دوست شاید یہ سمجھتے ہیں کہ گانڈو گردی تمھی نے ایجاد کی ہے، لیکن یہ تمھارے وردی پہننے سے بہت

پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔'

وہ کھانے کا آرڈر کرتا ہے۔ میں دال منگواتا ہوں، وہ چکن کڑاہی منگواتا ہے۔ 'اسپیشل قسم کی بناؤ۔' وہ ویٹر کو بتاتا ہے۔ 'ہمارے جوان کو خوراک کی ضرورت ہے۔' ہم خاموشی سے کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں مرچیں میرے پہاڑی ذوق سے کافی زیادہ ہیں۔ مجھے پیشاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مجھے ٹھیک سے نہیں پتا کہ مجھے بس کھڑے ہو کر چل پڑنا چاہیے یا اس کے لیے بھی اُس کی اجازت مانگنی چاہیے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور لیٹرین کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ وہ اپنی آنکھوں کے اشارے سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہتا ہے۔ 'میرا خیال ہے تمھیں انتظار کرنا چاہیے۔ ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'

میں اس پگڑی والے آدمی کو دیکھتا ہوں جو ریسٹورنٹ کی لیٹرین پر گارڈ بن کر کھڑا ہے اور سوچتا ہوں کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سڑک کنارے بنے ہوٹلوں کی لیٹرینیں عام طور پر گندی ہوتی ہیں اور مجھے پیشاب اور مرچوں سے بھری غلاظت کی بو سے بھرے کمرے کے بجائے کسی کھلے کھیت میں ستاروں سے بھرے آسمان کے نیچے فارغ ہونا زیادہ پسند ہے۔

جب ہم اپنا ڈنر ختم کر لیتے ہیں تو ویٹر مزید کسی آرڈر کی توقع میں ہمارے اردگرد منڈلانے لگتا ہے۔ میجر ہوا میں اپنے نام کے دست خط کرتا ہے، ویٹر بل لاتا ہے، میجر اس پر کچھ لکھتا ہے اور بغیر رقم ادا کیے چلنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

وہ یہاں آتا جاتا رہتا ہوگا، میں سوچتا ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ اس کا اُدھار چلتا ہوگا۔

باقی ماندہ سفر میری مثانے کو کنٹرول کرنے والے عضلات اور میجر کیانی کو یکا یک پڑنے والے حبّ الوطنی کے دورے کے درمیان ایک جنگ میں کٹتا ہے۔ جب وہ مجھے بتاتا کہ آخری مرتبہ جب کسی نے ایک جہاز کے ساتھ غائب ہونے کی کوشش کی تھی تو ملک

دو حصوں میں بٹ گیا تھا، اور میں جوش و جذبے کے ساتھ سر ہلاتا ہوں۔ جب وہ میرے والد کے شان دار کیریئر سے مُتعلق بات کرتا ہے تو میں اپنی رانوں کو دبا لیتا ہوں اور عملی طور پر اپنی نشست سے اچھل پڑتا ہوں۔ 'تمھیں پتا ہے وہ لوگ تمھارے والد سے مُتعلق کیا کہتے تھے؟ کہ وہ ان دس آدمیوں میں سے ایک ہے جو روسیوں اور آزاد دنیا کے درمیان کھڑے ہیں۔' جب وہ اپنے جیسے اور میرے والد جیسے نظر نہ آنے والے فوجیوں کی قربانیوں کا ذکر کرتا ہے جو انھیں قومی سلامتی کی خاطر دینا پڑتی ہیں تو میں اپنا سر جوش و خروش سے اثبات میں ہلاتا ہوں۔

میں اپنی رانیں دباتا ہوں۔ میں کہنا چاہتا ہوں، 'ہم دنیا کو مل کر بعد میں بچاتے رہیں گے، میں پہلے پیشاب کر لوں کیا؟' ہماری گاڑی ایک تنگ سڑک پر اپنا آخری موڑ مُڑتی ہے، اور یہ سڑک قلعہ لاہور کے شاہانہ اور پر وقار دروازے کی طرف جاتی ہے۔

لاہور کے تاریخی شہر میں قلعہ ایک بہت تاریخی مقام ہے۔ یہ اسی نے بنایا تھا جس نے تاج محل بنایا، مغل بادشاہ شاہ جہاں نے۔ اسے اس کے اپنے بیٹے نے زندان میں پھینک دیا تھا، مطلب ایک جبری قبل از وقت ریٹائرمنٹ۔ میں قلعے کو کبھی نہیں گیا لیکن میں نے اسے ایک شیمپو کے اشتہار میں دیکھا تھا۔

کیا میں کوئی ایسا شخص ہوں جسے آدھی رات کو تاریخ کا سبق دیے جانے کی ضرورت ہے؟ قلعہ سیاحوں کے لیے واضح طور پر بند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میجر کہیں بھی ڈیوٹی اوقات کے بعد بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے، لیکن کیا اسے نہیں چاہیے تھا کہ مجھے کسی تفتیشی مرکز یا سیف ہاؤس لے جاتا یا پھر کہیں بھی ایسی جگہ جہاں وہ ان لوگوں کو لے جاتا ہے جن سے وہ تھوڑی بات وات کرنا چاہتا ہے؟

گاڑی دروازے پر پہنچتی ہے تو سایوں سے دو سپاہی نمودار ہوتے ہیں۔ میجر گاڑی کی کھڑکی نیچے کر دیتا ہے اور اپنی گردن باہر نکالتا ہے، مگر بولتا نہیں ہے۔ دروازہ، جو شاید ہاتھیوں کا جلوس گزرنے کے لیے بنایا گیا تھا، آہستگی سے کھلتا ہے اور اندر ایک ایسا اُجڑا

ہوا شہر نظر آتا ہے جس کا خواب ایک اجل گرفتہ بادشاہ نے دیکھا تھا۔

قلعے کے کچھ حصوں میں دھیمی دھیمی سی روشنی ہے، جس سے اس کی پتھر سے بنی دیواروں کے ٹکڑے نظر آتے ہیں اور یہ دیواریں اتنی چوڑی ہیں کہ ان پر گھوڑے قلانچیں بھر سکتے ہیں۔ اس روشنی میں باغیچے بھی نظر آتے ہیں جو اتنے وسیع اور سرسبز ہیں کہ ان کے پاس سے ڈرائیو کرتے ہوئے گزریں تو غائب ہونے کے بعد پھر آن موجود ہوتے ہیں۔ دیوانِ عام اور صحنِ نساء اپنے ٹوٹتی پھوٹتی اور مدھم ہوتی ہوئی شان و شوکت کے ساتھ کھڑے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ مشہور شیش محل کہاں ہے۔ اُن لوگوں نے شیمپو کا اشتہار وہیں بنایا تھا۔

اس بے کار شان و شوکت کی ویران وسعت میں زندگی کے واحد آثار دو فوجی ٹرک ہیں جن کی ہیڈ لائٹیں آن ہیں اور انجن ستا رہے ہیں۔ میجر کیانی اپنی گاڑی ان ٹرکوں کے ساتھ کھڑی کر دیتا ہے۔ ہم گاڑی سے باہر نکلتے ہیں اور دیوانِ عام کی جانب چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں روشنی دھیمی ہے اور مجھے ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتا کہ روشنی کا منبع کہاں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی مغل سپاہی ہاتھوں میں نیزے لیے کسی ستون کے پیچھے سے نمودار ہوں گے اور ہمیں بادشاہ کے حضور لے جائیں گے جو، اپنے موڈ کے مطابق، یا تو ہمیں اپنی شبینہ خرمستیوں میں شامل ہو جانے کے لیے کہے گا یا ہمارے سر کٹوا کر انھیں قلعے کی دیوار سے نیچے پھینکوا دے گا۔

میجر کیانی اچانک ایک موڑ مُڑتا ہے اور ہم کنکریٹ سے بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اُترنا شروع کر دیتے ہیں جو یقیناً مغلوں نے نہیں بنائیں۔ ہم ایک وسیع اور خالی ہال میں داخل ہوتے ہیں جو بہت پراسرار طریقے سے کسی ایوی ایشن ہینگر کی طرح لگتا ہے۔ ہال کے بالکل وسط میں ایک بلب کے نیچے، جو یقیناً ایک ہزار واٹ کا ہوگا، ایک صوبیدار میجر بیٹھا ہے جو اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جیسے ہی ہم اس کی دھاتی میز کے قریب پہنچتے ہیں، میجر کیانی کو سیلوٹ کرتا ہے۔ اس کی میز پر پیلے رنگ کی موٹی موٹی فائلوں کا ڈھیر لگا ہے۔ میجر کیانی اپنا سر اثبات میں ہلاتا ہے لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں بولتا۔ وہ ایک کرسی کھینچتا ہے، ایک فائل نکالتا ہے اور اس کے صفحات ایسے پلٹنے لگتا ہے جیسے وہ میری موجودگی سے باخبر نہ ہو۔

پھر اُسے یاد آتا ہے۔

'انڈر آفیسر شگری کو ٹوائلٹ کا راستہ دکھاؤ۔' وہ فائل سے نظریں اُٹھائے بغیر کہتا ہے۔ میں صوبیدار میجر کے پیچھے چلتا ہوا ایک روشن راہ داری سے گزرتا ہوں جس کے دونوں جانب لوہے سے بنے ہوئے دروازوں کی قطاریں لگی ہیں، اور ان پر اسٹینسل کیے ہوئے سفید نمبر لکھے ہیں۔ راہ داری میں بالکل خاموشی ہے لیکن دروازوں کے پیچھے میں ایک سوتے ہوئے شخص کے دھیمے دھیمے خراٹوں کی آواز سنتا ہوں۔ راہ داری کے اختتام پر لوہے کا ایک خستہ حال دروازہ ہے جس پر کوئی نمبر درج نہیں۔ صوبیدار میجر ایک چابی نکالتا ہے، تالا کھولتا ہے اور ایک طرف ہو جاتا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں اور ایک قدم اندر رکھتا ہوں۔ دروازہ میری پشت کو لگتا ہے اور میرے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے بند ٹوائلٹ کی اندوہ ناک بو میرا استقبال کرتی ہے جس نے کئی زمانوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیکھا۔ میرا سر دیوار سے ٹکراتا ہے، ہزار واٹ کا ایک بلب آن ہو جاتا ہے۔ روشنی اتنی زیادہ ہے اور بو اتنی شدید ہے کہ مجھے کچھ ابتدائی لمحوں کے لیے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک لیٹرین ہے۔ زمین پر ایک گڑھا کھدا ہوا ہے جس میں ناقابلِ امتیاز قسم کی غلاظت سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اس کی سطح پر بلبلے بننے لگے ہیں۔ فرش کسی غلیظ مائع کی موٹی اور لیس دار تہ سے بھرا ہوا ہے۔ زمین سے ایک فٹ اوپر پانی کی ایک ٹونٹی ہے لیکن وہ اتنے عرصے سے خشک ہے کہ اب اس کا رنگ بھی اکھڑ رہا ہے۔ وہاں ایک سرمئی رنگ کا ڈبلیو سی ہے جس کی زنجیر ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں اسے کھولتا ہوں اور اس کے اندر نظر دوڑاتا ہوں۔ اس کے درمیان میں دو انچ پانی ہے، جو اس کی اندرونی خستہ حال نارنجی سطح کو منعکس کر رہا ہے۔

پیشاب کرنے کی میری خواہش ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے۔ بو اتنی شدید

ہے کہ اس کے علاوہ کچھ بھی سوچنا مشکل لگتا ہے۔

میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

کہیں نہ کہیں اُن کے پاس میری ایک فائل موجود ہے جو کہتی ہے کہ انڈر آفیسر شگری گندے غسل خانوں میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میں نے جنگل سروائیول کورس کر لیا، میں نے صحرا میں سانپوں کو شکار کرنا اور اپنی پیاس پر قابو پانا سیکھ لیا۔ مگر کسی نے کوئی ایسا کورس تیار کرنے کا نہ سوچا جو بد بودار غسل خانوں میں زندہ رہنا سکھا سکتا۔

میں دروازے پر بلّہ بول دیتا ہوں اور اپنی دونوں مٹھیاں اس پر مارنا شروع کر دیتا ہوں۔ 'کھولو اس بلڈی دروازے کو۔ باہر نکالو مجھے اس ٹٹی خانے سے۔ بو آ رہی ہے یہاں سے۔'

میں دروازے پر کچھ مرتبہ اپنا سر مارتا ہوں اور پھر اپنے اعمال کی حماقت مجھ پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ میری تمام چیخ پکار بو کے آس پاس سے گزر جاتی ہے۔ وہاں پیشاب اور پاخانے کی بد بو اب بھی موجود ہے لیکن کسی نہ کسی طرح اب وہ کم ہو چکی ہے۔ یا شاید میں ابھی سے اس کا عادی ہو چلا ہوں؟

اُن کا اس پہر مجھ سے تفتیش کرنے کا کوئی موڈ نہیں۔ آج رات کے لیے میرا ٹھکانا یہی ہوگا۔

میری پشت دیوار سے ٹکراتی ہے، میں جوتوں میں اپنے پیروں کی انگلیاں دباتا ہوں اور عزم کرتا ہوں کہ رات میں کھڑے ہو کر گزاروں گا۔ میں کسی صورت میں ان قصائیوں کو یہ لطف فراہم نہیں کروں گا کہ وہ مجھے پیشاب کے اس تالاب میں لیٹا ہوا دیکھیں۔ دیوار پر کچھ لکھا بھی ہوا ہے لیکن مجھے اسے پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں جنرل ضیا اور اس کی ماں اور بہن کے الفاظ پڑھ سکتا ہوں، میرا تخیل نقطوں کو جوڑ سکتا ہے۔ یہ خیال کہ یہ جگہ ان لوگوں کی میزبان رہ چکی ہے جنھیں جنرل پر اس قدر غصّہ تھا کہ وہ اس کی ماں اور بہن کے بارے میں چیزیں لکھ سکے، حیرت انگیز ہے۔ میری قسمت

بھلے ہی ان دنوں خراب سہی لیکن آخری مرتبہ جب میں نے چیک کیا تھا تو میں وردی میں ملبوس ایک ٹرینی افسر تو تھا ہی اور یہ حقیقت کہ انھوں نے مجھے سویلینز کے لیے بنائے جانے والے اس ٹٹی خانے میں بند کر دیا ہے جو میری حد درجہ تذلیل ہے۔

کرنل شگری نے مجھ سے بات کر کے مجھے فوج میں جانے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ 'آفیسر کور وہ نہیں رہی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔'، انھوں نے افغانستان کے نہ جانے کون سے ویں دورے سے واپسی کے بعد اپنے لیے شام کی پہلی وھسکی اُنڈیلتے ہوئے کہا تھا۔ 'میرے ساتھ جن لوگوں نے کام کیا وہ سب اچھے گھرانوں سے تھے۔ نہیں، میرا مطلب یہ نہیں کہ امیر کبیر گھرانوں سے۔ میرا مطلب ہے عزّت دار لوگ تھے وہ، اچھے لوگ تھے۔ جب آپ ان سے پوچھتے کہ وہ کہاں سے ہیں، تو آپ ان کے والدین اور دادا پر دادا کے بارے میں جان لیتے تھے کہ وہ معروف لوگ تھے۔ اور اب یہاں کوئی کسی دکان والے کا بیٹا ہے، کوئی گوالے کا لڑکا ہے، یعنی ایسے لوگ ہیں جو کسی اور کام کے لیے ٹھیک ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ مخلوط نسل والے لوگ میرے بیٹے کی زندگی تباہ کرتے پھریں۔'

ڈیڈی، کاش آپ مجھے اس حالت میں دیکھ سکتے۔

وہ اپنے دل میں جانتے تھے کہ میں قائل نہیں ہوا تھا۔ جب وہ اپنی آخری وھسکی، غالباً ساتویں، انڈیل رہے تھے تو انھوں نے مجھے پھر سے بُلایا۔ وہ شام کو وھسکی کے تین گلاس پینے والے آدمی تھے، لیکن جب بھی افغان دورے سے واپس آتے تو غیر معمولی پیاس محسوس کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز میں ایک تلخی تھی جس سے میں تب تک متعارف نہیں ہوا تھا لیکن جو بعد میں مستقل نوعیت اختیار کرنے والی تھی۔

'مجھے تین جنگوں کے میڈل اور زخم مل چکے ہیں اسے ثابت کرنے کے لیے۔' انھوں نے کہا۔ 'تم ملک کے کسی بھی آفیسرز میس چلے جاؤ تمھیں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جن کی زندگی میں نے بچائی۔ اور اب؟ ذرا مجھے دیکھو۔ انھوں نے مجھے دلاّ بنا دیا ہے۔

میں ایک ایسا آدمی تھا جسے لوگوں کی زندگیاں بچانے کی تربیت دی گئی تھی، اب میں زندگیوں کا لین دین کرتا ہوں۔'

وہ اپنا وھسکی کا گلاس اپنی انگلیوں پر گھماتے رہے اور 'ولا' کا لفظ بار بار دُہراتے رہے۔

مجھے اونگھ آ جاتی ہے اور میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں شگری پہاڑ پر اپنے گھر کے سامنے بہنے والے شفاف ٹھنڈے چشمے میں پیشاب کر رہا ہوں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں اپنے گھٹنوں کو کپکپاتا اور فرش پر پڑا گند اپنے تلووں کو چھوتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میری پتلون کی بائیں سائیڈ گیلی ہو رہی ہے۔ میں بہت بہتر محسوس کرتا ہوں۔

اپنے بلڈی پیروں پر کھڑے رہو۔ کھڑے رہو اپنے بلڈی پیروں پر۔

یہ وہ پہلی بات تھی جو صورتِ حال کا جائزہ لینے سے پہلے میں خود سے کہتا ہوں۔ وہ لوگ مغل فوج کے باغی سپاہیوں کے ساتھ کیا کیا کرتے تھے؟ فی الفور سر کاٹ دینا یا کسی ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچل ڈالنا شاید اس انجام سے بہتر ہوتا۔

بد بو اب شدید تر ہو چکی ہے اور ہوا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور تخیل میں اپنے آپ کو شگری پہاڑ پر واپس دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لوہے کے دروازوں اور زیرِ زمین قید خانے اور قلعے کی دیواروں کے باوجود پہاڑ کی ہوا کا جھونکا اندر چلا آتا ہے۔ وہ میرے گرد گھومتا ہے اور بکری گھروں سے کھری ہوئی زمین کی خوش بو، سبز باداموں کی مہک اور پاس سے گزرنے والے شفاف، ٹھنڈے چشمے کی آواز واپس لے آتا ہے۔ پہاڑیوں کی خاموشی میں ایک ایک آواز شگاف ڈال رہی ہے جو ایک فاصلے سے آ رہی ہے لیکن زیادہ دور سے نہیں۔ کوئی بہت ہی تکلیف دہ آواز میں گا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آواز کو شناخت کروں میرے سر پر پانی سے بھری بالٹی اُلٹ دی جاتی ہے اور میرا چہرہ ہزار واٹ کے بلب سے اتنا قریب کر دیا جاتا ہے کہ میرے ہونٹ جلنے لگتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ سوال کون پوچھ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میجر کیانی

ہو۔ ہو سکتا ہے وردی کے بغیر اس کا کوئی اور بھائی ہو۔ میں جب کبھی کوئی جواب دینے کے قابل ہوتا ہوں، ان کا سامنا مزید سوالوں سے ہوتا ہے۔ یہ کوئی تفتیش نہیں۔ انھیں میرے جوابوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف سیکس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

کیا لیفٹیننٹ بینن اور عُبید کے درمیان جنسی تعلقات تھے؟

وہ بہت قریب تھے۔ لیکن مجھے نہیں پتا۔ میرا نہیں خیال کہ ایسا تھا۔

کیا تمھارے اور عُبید کے درمیان جنسی تعلقات تھے؟

تجھے یہوں۔ نہیں۔ ہم دوست تھے۔

کیا تم نے کبھی اُس کی لی؟

میں نے سن لیا ہے۔ میرا جواب ہے نہیں، نہیں، نہیں۔

جب وہ غائب ہوا اس سے پہلے رات کو وہ اپنے بستر میں نہیں تھا۔ تمھیں پتا ہے کہ وہ کہاں تھا؟

واحد شخص جس کے ساتھ وہ ہو سکتا تھا، بینن تھا۔ وہ کبھی کبھی چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔

کیا اسی لیے تم نے اسے فیوری اسکواڈرن کے رول کال میں حاضر شمار کیا تھا؟

میرا خیال تھا کہ وہ سیدھا پریڈ اسکوائر آ جائے گا۔ وہ کبھی کبھار ایسا ہی کرتا تھا۔

کیا عُبید میں خودکشی کے رجحانات تھے؟ کیا اس نے کبھی اپنی جان لینے کے بارے میں بات کی تھی؟

میں دونشستوں والے ایک جہاز کو اپنے تینوں پہیوں پر نیچے گرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور بلب کی سفید چندھیا دینے والی روشنی دھیمی پڑنے لگتی ہے۔

وہ شاعری پڑھتا تھا۔ وہ مرنے کے بارے میں گانے گایا کرتا تھا لیکن کبھی اس نے واقعی میں مرنے کے بارے میں بات نہیں کی۔ میرے ساتھ تو نہیں کی۔ ایسے انداز میں کبھی نہیں کی کہ وہ خودکشی کر کے مرے گا۔

۸

آرمی ہاؤس کا بڑا استقبالی کمرا امریکا اور سعودی عرب سے آنے والے معززین کے لیے، وی وی آئی پیز کے لیے مخصوص تھا۔ سعودی عرب سے اسلام آباد تک ہوائی دوڑ جیتنے کے بعد شہزادہ نائف ایک مخملیں صوفے پر بیٹھا مارل برو ریڈ سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس بات پر فخر کر رہا تھا کہ ڈنر کے لیے آتے ہوئے اس کے ایف سولہ طیارے نے ساؤنڈ بیریئر توڑ دیا تھا۔ 'ہمارا بھائی بل شاید اب بھی بحیرۂ عرب پر پرواز کر رہا ہے۔' قہقہہ لگاتے ہوئے شہزادے نے اپنے دونوں بازو اُٹھائے اور ایک تھکے ہوئے پرندے کی پرواز کی نقل اُتاری۔

'اللہ اکبر۔' جنرل ضیا نے کہا۔ 'یہ سب اس کا کرم ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے والے جہاز پر گیا تھا اور میری بوڑھی ہڈیاں کئی دنوں تک درد کرتی رہی تھیں۔ آپ، ماشاء اللہ، اب بھی جوان آدمی ہیں۔'

جنرل ضیا اپنی آنکھ کے کونے سے ڈاکٹر سروری کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا جو اُس کی درخواست پر شہزادہ نائف کے ہم راہ آیا تھا، لیکن جسے بہ ظاہر شہزادہ نائف کے جشنِ فتح میں شرکت کی دعوت دینا بھلا دیا گیا تھا۔ جنرل ضیا اپنی بیماری سے مُتعلق شاہی ڈاکٹر سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔

جنرل ضیا اپنی اس بیماری کو اگرچہ بس ذرا سی کھجلی کہا کرتا تھا، لیکن یہ اب اس کے

نماز کے معمول میں بھی خلل ڈالنے لگی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اس حقیقت پر فخر رہا تھا کہ وہ ایک ایسا مسلمان ہے جو جس وضو سے نمازِ فجر ادا کرتا ہے وہ عشا کی نماز کے لیے بھی برقرار رہتا ہے۔ جتنی بھی چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ اس کے روزمرہ معمول سے نکالی جاچکی تھیں؛ لہسن، دالیں، عورتیں جو اپنا سر اچھی طرح نہیں ڈھانپتیں۔ لیکن جب سے اُس نے خود کو آرمی ہاؤس تک محدود کیا تھا یہ کھجلی شروع ہو گئی تھی۔

اس نے پہلے اپنے اسٹاف سرجن کو بلایا تھا اور اسے خون کے اُن دھبوں سے آگاہ کیا تھا جو اسے اپنی پتلون کے پچھلی جانب نظر آئے تھے، لیکن وہ اُس سے اپنی کھجلی سے مُتعلّق بات نہیں کر سکا تھا۔

'کیا آپ کو پاخانے کے راستے میں کوئی جلن، کوئی کھجلی محسوس ہوتی ہے؟' اسٹاف سرجن نے سوال کیا تھا۔

'نہیں۔' اس نے فی الفور جواب دیا تھا۔

'سر آنتوں سے خون کا رساؤ خطرناک ہو سکتا ہے، لیکن آپ کے سلسلے میں معاملہ کیڑوں کا، یعنی کدو دانوں کا لگتا ہے۔ اگر آپ مجھے بتا سکیں کہ آپ کمبائنڈ ملٹری اسپتال کب آ سکیں گے تو میں آپ کے مکمل چیک اپ کا بندوبست کر دوں گا۔'

جنرل ضیا نے کوڈ زی سے مُتعلّق کوئی بات کہی تھی اور ڈاکٹر کو جانے کو کہا تھا۔ اگرچہ اسٹاف سرجن کی سیکیورٹی کلیئرنس ہو چکی تھی، مگر جنرل ضیا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے ٹیسٹ دوسری لیبارٹریوں کو بھیجے یا اپنے ڈاکٹر ساتھیوں سے مشورہ بھی کرے۔ اُس کی اپنی بیٹی نے ایک میڈیکل اسکول سے حال ہی میں گریجویشن کی تھی مگر وہ ایسے کسی معاملے سے مُتعلّق اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔

پھر شہزادہ نائف کی کال آئی اور جنرل ضیا کو یاد آیا کہ شہزادہ نائف ہمیشہ اپنے ذاتی معالج کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کے ہم سفروں میں وہ واحد شخص ہوا کرتا تھا جو سوٹ پہنتا اور چمڑے کا ایک سیاہ بیگ اُٹھائے ہوتا تھا، واحد شخص جو ہمیشہ خاموش رہتا،

جو خود مذاق کرتا نہ شہزادہ نائف کے نان اسٹاپ کامیڈی ایکٹ پر کبھی ہنستا۔

'میں اپنے ڈاکٹر کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا۔' جب جنرل ضیا نے بالآخر اس سے اجازت چاہی کہ وہ اُس کے معالج سے ایک نجی مشورہ کرلے تو شہزادہ نائف نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے کہا۔ 'اُس نے مجھے اتنا دیکھ رکھا ہے جتنا میری کسی بیوی نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن آپ کے لیے تو کچھ بھی حاضر ہے، میرے بھائی، کچھ بھی۔ حتیٰ کہ میرا خفیہ ہتھیار بھی۔' اس نے ڈاکٹر کی جانب اشارہ کیا، جو یہ ظاہر کیے بیٹھا تھا کہ وہ دونوں کسی اور کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔

'بس یہ ایک ذرا سا نجی معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ملٹری ڈاکٹر میرے نجی معاملات کے بارے میں باتیں کرتا پھرے۔ آپ تو جانتے ہیں ہمارے پاکستانیوں کو، انھیں چغلی کا بہت شوق ہوتا ہے۔'

'وہ میرے تمام نجی معاملات کا خیال رکھتا ہے۔' شہزادہ نائف نے ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ 'اور وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔' پھر وہ ڈاکٹر کی جانب مُڑا اور کہا، 'میرے بھائی کی نجی چیزوں کا ویسے ہی خیال رکھو جیسے تم میری نجی چیزوں کا رکھتے ہو۔' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے دُہرا ہو گیا۔ جنرل ضیا نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی ایک مُسکراہٹ سجائی، اُٹھا اور اپنے دفتر کی جانب چل دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اس مذاق کی داد نہ دی اور تابع داری سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

شہزادہ نائف کی جنسی خواہشات کا خیال رکھنے پر آٹھ سال صرف کرنے کے بعد ان حکم رانوں سے مُتعلّق کوئی بھی چیز ڈاکٹر سروری کو حیران نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے اعضائے تناسل کو درست رکھنے پر بہت سا وقت اور توانائی صرف کرتے تھے۔ ڈاکٹر سروری اپنے اداسی کے لمحوں میں سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ اس ذوق وشوق کا کچھ حصّہ بھی اپنے حکومتی امور کے لیے وقف کرتے تو دنیا ایک بہت بہتر جگہ ہوتی۔ اس نے شہزادے کی جنسی قوت میں اضافے کے لیے ہبارا بسٹرڈ بازوں کا جگر اتنی مرتبہ منگوایا تھا، اور

بنگال ٹائیگر کے خصیوں سے بنائے ہوئے تیل سے اتنی مرتبہ شہزادے کے عضو کی مالش کی تھی کہ خود اُس کے لیے ہر قسم کی جنسی بھوک ختم ہو گئی تھی۔ سعودی میڈیکل شعبے میں بھی ہر شخص اسے شاہی عضو کے کل وقتی نگران کی حیثیت سے جانتا تھا۔ آخر شاہی تن خواہ پر شہزادے کا اپنا ہارٹ اسپیشلسٹ، اسکن اسپیشلسٹ اور حتیٰ کہ ایک پلاسٹک سرجن بھی تو تھا۔ لیکن شہزادے کے دل سے سب سے زیادہ قریب تھی اس کی جنسی صحت اور ڈاکٹر سروری اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اُس کے پیٹھ پیچھے لوگ اُسے شاہی عضو کا ڈاکٹر کہتے تھے۔

اس کے کام کی نوعیت کے سبب اسے قصور وار قرار نہیں دینا چاہیے۔ اگر جنرل ضیا کے نجی دفتر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھ لیا: 'تو آپ چاہتے ہیں کہ موٹا ہو جائے، یا پھر لمبا ہو جائے؟'

جنرل ضیا، جس نے ڈاکٹر کو بولتے ہوئے پہلے نہیں سنا تھا، اس کے عربی اور امریکی لہجوں کی باہم آمیزش اور اس کے حیران کن سوال پر دنگ رہ گیا۔ اُس نے اُس کے ہاتھ کے اشارے نظر انداز کر دیے۔

جب جنرل ضیا نے اپنی پریشانی کی وضاحت کی تو ڈاکٹر سروری کو ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔ وہ پہلی مرتبہ مُسکرایا۔

جب ڈاکٹر نے فی الفور معائنے کی تجویز پیش کی تو جنرل ضیا اس پر تیار تھا۔ اس نے اس بارے میں پہلے سے ہی اس قدر سوچ رکھا تھا کہ اس نے فوراً ڈاکٹر کی جانب اپنی پیٹھ کی، اپنی بیلٹ کھولی اور پتلون نیچے کِھسکا دی۔ اسے اپنے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور پھر ربڑ کے دستانے پہنے ہوئے ایک ہاتھ اپنی چوتڑوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔

'برادر، ذرا جھک جائیے پلیز۔' جنرل ضیا اب بھی ڈاکٹر کے امریکی لہجے پر اپنی حیرانی پر قابو نہ پا سکا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اسے شہزادے کے ساتھ عربی بولتے سنا تھا۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ 'اور۔' ڈاکٹر نے حکم دیا۔ اس نے اپنا دایاں رخسار میز پر

رکھ دیا اور اپنی توجہ بٹانے کے لیے کچھ اور سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کا سر دو پرچموں کے درمیان تھا۔ پاکستان کا سبز اور سفید پرچم جس پر دائیں رخ کرتا ہوا ایک باریک سا ہلال بنا ہوا تھا، اس کے ایک جانب تھا اور دوسری جانب پاکستان کی بڑی فوج کا پرچم۔ ایک اسلامی اسکالر نے اسے بتایا تھا کہ یہ چڑھتا ہوا ہلال نہیں بلکہ اُترتا ہوا ہلال ہے، جس کے بعد اس نے اس ہلال کو الٹا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن پھر اس کے مشیروں نے اسے یاد دلایا کہ پرچم اب لگ بھگ چالیس برسوں سے استعمال میں ہے اور چوں کہ کسی کو بھی ہلال کی سمت سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ پرچم کو ویسا ہی چھوڑ دیا جائے۔

اسے یہ محسوس کر کے سکون ملا کہ ڈاکٹر کی تفتیشی انگشت گیلی تھی۔

اس نے بڑی فوج کے جھنڈے کو دیکھا۔ ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی دو تلواروں کے نیچے وہ مشہور نعرہ تھا جو بابائے قوم نے اس ملک کو اس کی سال گرہ کے تحفے اور ایک نصب العین کے طور پر دیا تھا: ایمان، اتحاد، تنظیم۔ اچانک یہ نعرہ اسے نہ صرف معمولی اور بے معنی بلکہ بہت سیکولر، بے عزم اور تقریباً کافرانہ سا لگنے لگا۔ ایمان؟ کون سا ایمان؟ اتحاد تنظیم؟ کیا سپاہیوں کو اس نعرے کی ضرورت ہے؟ کیا اپنی ڈیوٹی کی نوعیت کے حوالے ہی سے وہ متحد اور منظم رہنے کے پابند نہیں؟ اس نے اپنے چوتڑوں پر ڈاکٹر کی سانس محسوس کی۔ اس کی ربڑ پہنی ہوئی انگلی کی جگہ ایک ٹھنڈی دھاتی ٹیوب نے لے لی تھی جو تکلیف تو نہیں پہنچاتی تھی لیکن ذرا بے آرام ضرور کرتی تھی۔

اس پر یہ بھی منکشف ہوا کہ جب بانیِ پاکستان کو یہ نعرہ سوجھا تو اس کے ذہن میں سویلین تھے، مسلح افواج نہیں۔ اس نے خود کو بتایا کہ اس نعرے کو اب رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس کے ذہن نے ایڑھ لگائی اور ایسے الفاظ ڈھونڈنے لگا جو اس کے سپاہیوں کے مشن کی حقیقی نوعیت کے غماز ہوں۔ اللہ کو تو ہونا ہی چاہیے۔ جہاد، ہاں یہ بھی اہم ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا دوست بل کیسی بھی اِس سے خوش ہوگا۔ وہ کسی تیسرے لفظ سے مُتعلق

فیصلہ نہ کر سکا، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ لفظ بھی اُس کے ذہن میں آ ہی جائے گا۔

ڈاکٹر نے اُس کے چوتڑ پر تھپکی دی اور کہا، 'اب آپ اُٹھ سکتے ہیں پلیز۔' جنرل نے مُڑنے سے پہلے اپنا زیر جامہ اوپر چڑھایا، اور یہ بات یقینی بنائی کہ ڈاکٹر اس کے سامنے کے حصے پر کوئی نظر نہ ڈال سکے۔ اُسے اب بھی ڈاکٹر کا پہلا سوال یاد تھا۔

ڈاکٹر کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ 'آپ میٹھا کھاتے ہیں؟' جنرل نے پریشانی میں اپنا سر ہلایا۔

'ہاں۔ ہاں۔ میں میٹھے کا شوقین ہوں۔'

'برادر، اسی لیے آپ اتنے سویٹ ہیں۔' ڈاکٹر نے اپنے دستانہ پہنے ہوئے ہاتھ سے اُس کے گال پر تھپکی دی اور جنرل ضیا اس خیال پر شرما گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہ ہاتھ کہاں تھا۔

'آپ کو کیڑے ہیں، سر۔' ڈاکٹر نے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھولی اور اسے کچھ چھوٹے چھوٹے مُردہ کیڑے دکھائے۔

'مگر پھر مجھے اتنی زیادہ کھجلی کیوں ہوتی ہے؟'

ڈاکٹر کے نکلے ہوئے دانت کچھ اور واضح ہو گئے۔ 'وہ آپ کو پسند تو کرتے ہیں۔ وہ کیڑے۔ وہ میٹھا کھاتے ہیں، ان میں جان آتی ہے، وہ باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ وہ فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ کھجلی ایسے ہوتی ہے۔۔۔' اس نے کوئی فقرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی، پھر اپنے ہاتھوں سے بیلچے سے زمین کھودنے جیسی حرکت کی۔ 'کھجلی تب ہوتی ہے جب کیڑے سرنگ بنا رہے ہوں۔ سرنگ بنا رہے ہوں جب۔'

جنرل ضیا نے آہستگی سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ تین روز میں یہ دوسرا موقع تھا جب اُسے سرنگوں سے متعلق متنبہ کیا گیا تھا۔ یہاں وہ جیل کے اندر جا پھٹنے کے حوالے سے پریشان تھا تو ادھر دشمن اس کی آنتیں کھائے جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کافرانہ خیال آیا؛ ایسا تو نہیں کہ اس کے معدے میں چھوٹے چھوٹے یونسوں کی ایک فوج

موجود ہو جو باہر نکلنے کی دعائیں مانگ رہی ہو؟

'میں میٹھا کم کر دوں گا۔'

'میٹھا کم مت کریں۔' ڈاکٹر نے کینیڈرل کی ایک بوتل نکالی۔ 'میٹھا ختم کرنا ہے نا؟ میٹھا ختم۔ یہ لیں۔'

ڈاکٹر نے اپنا بیگ بند کیا اور جنرل ضیا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر عرب رواج کے مطابق اس کے دونوں رخساروں پر بوسے دیے۔

تب اُسے احساس ہوا کہ اس کی پتلون اب بھی اس کے ٹخنوں کے قریب موجود ہے۔

بعد ازاں ڈنر پر، کریلوں کی کڑواہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، بل کیسی کسی ایسے بھوت کی طرح گویا ہوا جسے مستقبل سے آگاہی حاصل ہو۔ 'بھائی ضیا۔' اس نے اپنے منہ کے کنارے پر جمع ہو جانے والی رال کو اپنے نیپکن سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ 'آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے لوگ آپ کو مارنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ آپ ذرا کیپٹل ہل کے ان گدھوں کو دیکھیں۔ مجھے تو وہ پہلے ہی مار چکے ہیں۔'

۹

دن کی پہلی روشنی مجھے اپنے پیروں پر کھڑے اس عالم میں اونگھتے پاتی ہے کہ میری پشت دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی ہے، جوتوں کے اندر میرے پیروں کی انگلیاں بھنچی ہوئی ہیں، اور میری پسینے سے گیلی ہو چکی خاکی شرٹ میری ناف تک کھلی ہے۔ یہ روشنی ایک لمبی اور پتلی دبلی شافٹ کی طرح ہے جو دھاتی دروازے کے غسل خانے کی دیوار سے جڑنے والی جگہ پر ایک چھوٹے سے شگاف سے اندر آ رہی ہے۔ روشنی کی یہ شافٹ لاہور قلعے کے قید خانے میں موجود دھول کے قدیم ذرّات کو روشن کر دیتی ہے؛ روشنی میرے سامنے موجود غسل خانے کی دیوار کو واضح کر دیتی ہے جس پر لکھے ہوئے جملوں کے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ اب فرار کے ناممکن منصوبے سوچتے رہنے کے علاوہ میرے پاس ایک اور کام آ گیا ہے۔ جب میجر کیانی کے ساتھ میرا گاڑی کا سفر قلعے میں ختم ہوا تو مجھے تفتیش کاروں کی ایک ماہر ٹیم اور ایک ایسے قید خانے کی توقع تھی جو ایک ٹرینی آفیسر کے شایانِ شان ہوتا۔ اور مجھے کیا ملا؟ ایک ٹٹی خانہ اور میرا اپنا ساتھ۔

بدبو اب میرے مساموں پر حملہ آور ہو چکی ہے اور میرا حصّہ بن چکی ہے۔ نیند کی کمی کے سبب میرا سر خالی خالی ہو رہا ہے، میرے ہونٹ خشک ہیں اور میرے پیر ساری رات کھڑے رہنے کے سبب سوج گئے ہیں۔ ساری رات چلنے، تین قدم ایک طرف، دو قدم دوسری طرف، سے ظاہر ہے مجھے وہ ایکسر سائز نہیں ملی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ میں

اپنے جوتے اُتارنے کا سوچتا ہوں۔ میں ایسا کرنے کے لیے نیچے جھکتا ہوں، فرش پر پھیلی پیلے رنگ کی غلاظت کو نزدیک سے دیکھتا ہوں اور یہ خیال ترک کر دیتا ہوں۔ میں اپنی بانہیں پھیلا دیتا ہوں اور اس کے بجائے پڑھنے کو حاصل مواد پر توجہ مرکوز کر دیتا ہوں۔

دیوار پر تین زبانوں میں لکھا ہوا ہے اور لکھنے والوں نے لکھنے کے لیے کئی طرح کا مواد استعمال کیا ہے۔ میں ان میں سے دو زبانیں پڑھ سکتا ہوں، تیسری کا مجھے اندازہ ہی لگانا پڑے گا۔ مجھے ناخنوں سے لکھی گئی تحریر بھی نظر آتی ہے۔ ایک خشک ہوتی ہوئی تحریر غالباً خون سے لکھی گئی ہے اور میں مزید سوچنا نہیں چاہتا کہ انھوں نے لکھنے کے لیے اور کیا کیا استعمال کیا ہوگا۔

وہاں ہتھوڑے اور درانتیاں اور کھجور کے درخت اور پندرہ قسم کے مے بنے ہوئے ہیں۔ کسی اور نے، جو لگتا ہے کہ بال پوائنٹ پین اندر لانے میں کام یاب ہو گیا تھا، ایک راستہ بنایا ہوا ہے، جس کے دونوں طرف سیب کے درخت ہیں اور جو ایک چھوٹے سے گھر کو جاتا ہے۔ اس جگہ میرے پیش روؤں کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا، ذاتی بھی اور سیاسی بھی:

مجھے پورے سو کوڑے مارے گئے اور مجھے مزہ آیا۔

دعا کرو کہ خاتمہ آسان ہو۔

شہیدوں کے خون سے ایشیا سُرخ ہے۔

ایشیا سبز ہے اور اللہ اسے سبز ہی رکھے۔

گلاب سرخ ہوتا ہے۔ بنفشہ نیلا ہوتا ہے۔ یہ ملک خاکی ہے۔

خاتونِ اوّل کی لو، اس قوم کی نہیں۔

پہلے کوڑے پر چلّاؤ۔ اور بے ہوش مت ہو جاؤ کیوں کہ جب وہ پھر سے کوڑے ماریں گے تو ایک سے گنتی شروع کریں گے۔

پیارے بیٹے، میں نے یہ سب تمھارے مستقبل کے لیے کیا۔

میجر کیانی میری کتیا ہے۔

لینن زندہ ہے۔

مجھے نادیہ سے پیار ہے۔

لینن گانڈو تھا۔

ایک فارسی شعر بھی لکھا ہے جسے بس میں کچھ ہی پڑھ پاتا ہوں: عاشق، زلفِ دراز، مار۔ میرا خیال ہے کہ تصویر میری سمجھ میں آ گئی۔

میں ان تحریروں میں خود بھی اپنا حصّہ ڈالنے کا سوچتا ہوں۔ کچھ ایسا کہ۔۔۔'ایک بہت گرم شام میں انڈر آفیسر شگری کو ایک زبردست خیال آیا۔۔۔'

دیوار پر اتنی جگہ ہی باقی نہیں ہے۔

میجر کیانی جس سائلنٹ ڈرل سازش کی جڑیں کھودنے کی کوشش کر رہا ہے وہ ایک بڑا ہوا آئیڈیا تھا، جو، زیادہ تر بڑے ہوئے آئیڈیاز کی طرح، اکیڈمی میں ایک بہت گرم دن کے اختتام پر سوچا گیا تھا۔ ہم پریڈ اسکوائر پر ایک مصروف دن کے بعد بینن کے کمرے میں بروس لی کے پوسٹر پر نشانے بازی کر رہے تھے۔ وہ تمام حرارت جو ہمارے جسموں نے ڈرل ریہرسل کے دوران جمع کی تھی، باہر نکلنا شروع ہو گئی، ہماری وردیوں کا کڑک کپڑا خام گوند کی طرح ہمارے جسموں سے چپک گیا، پسینہ ہمارے گوشت پر چھپکلیوں کی طرح رینگنے لگا، ہمارے پیروں کا دم گھٹ گیا تھا اور وہ اپنے چمک دار چمڑے کے تابوتوں میں مُردہ پڑے تھے۔ بینن کا کمرا، جس میں ضرورت سے زیادہ مستعد اور پُر شور ائرکنڈیشنر موجود تھا، ایسے میں ہمارے سر چھپانے کا ٹھکانا بینن کا کمرا ہی ہو سکتا تھا۔ بینن نے اپنا یہ کمرا کسی بنکر کی طرح ڈیزائن کیا تھا؛ اس میں کوئی بستر نہیں تھا، بس ایک کنگ سائز گدا زمین پر پڑا تھا جس پر ایک کیموفلاج کنوپی لگی تھی جو اس نے بانس کی چار لکڑیوں پر بنائی تھی۔ فرش پر رسالے 'سٹارز اینڈ سٹرائپس' کی ایک جلد پر گوتم بدھ کا ایک چھوٹا اور

موٹا سا مجسمہ رکھا تھا۔ گوتم بدھ کے معدے میں ایک خفیہ چیمبر تھا جس کے اندر بینن اپنی حشیش کی سپلائی محفوظ رکھتا تھا۔ اس کی صاف ستھری وردیاں بغیر دروازے کی ایک الماری میں لٹکی رہتیں۔ اس نے اپنے ڈیزائنر بنکر کے ساتھ واحد آزادی ائرکنڈیشنر اور فلم 'گیم آف ڈیتھ' کے قدِ آدم پوسٹر کی صورت میں لی تھی۔ پوسٹر اس کے دروازے کے پورے اندرونی حصے پر آتا تھا۔ یہ پوسٹر فلم کے کلائمکس کا ایک منظر تھا، جب آخری بچا کھچا ولن کریم عبدالجبار بروس لی کی دائیں پسلی پر اپنا پنجہ ڈالنے میں کام یاب ہو جاتا ہے، اور وہ جہاں چار صاف ستھری اور ایک دوسرے کے متوازی خراشیں ڈال دیتا ہے۔ بروس لی کے ہاتھ ایک دفاع کی کلاسیکی پوزیشن میں، بالکل صاف ہیں؛ اس کے منھ سے خون ابھی نہیں نکلا ہوا۔

بینن کے کمرے میں ہماری متواتر آمد کے بارے میں سرکاری طور پر ہم نے یہ وجہ بتا رکھی تھی کہ ہم صدارتی انسپکشن کے لیے اپنی سائلنٹ ڈرل کے مظاہرے کی تفصیلات طے کر رہے ہیں۔ ہمیں اسکواڈ کی پیش رفت کا جائزہ لینا ہے، ہر ایک حرکت کی منصوبہ بندی کرنی ہے اور اپنی اندرونی آواز پر کام کرنا ہے۔

لیکن ہم ہر روز پریڈ کے بعد وہاں پہنچ جاتے تھے، کیوں کہ عُبید کو ائرکنڈیشنر کے ساتھ گال لگانے میں مزہ آتا تھا اور میں بینن کے گنگ ہو فیئربرن سائکس چاقو کے ساتھ کھیلنا اور ویت نام میں آپریشن بلنڈی رائس کے بارے میں اس کی کہانیاں سننا پسند کرتا تھا۔ اس نے ویت نام میں دو مرتبہ ڈیوٹی کی تھی اور اگر وہ اچھے موڈ میں ہوتا تو ہمیں وہاں اپنے رات کے گشت پر لے جاتا اور ہم بلنڈی رائس کے راستے میں آنے والے ایک ایک پتے کی حرکت محسوس کرنے لگتے۔ وہ اپنی کہانیوں میں چھا اوبو، چھاؤ اونگ، چھاؤ کو جیسے الفاظ کا فراخ دلانہ چھڑکاؤ کر کے انھیں دلچسپ بناتا اور شاید اسے ویت نامی زبان کے بس یہی الفاظ آتے تھے۔ اپنی چیلوں کو وہ اپنے 'ہو چی مُنھ' کہا کرتا۔ عُبید کو اس کی کہانیوں پر شبہ ہوتا۔

'ایک ڈرل انسٹرکٹر کا کیا کام کہ وہ جنگ میں دشمنوں کا شکار کرتا پھرے؟'

'تو تم اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟' میں کہتا، اور پھر اس موضوع پر خود اپنی

معلومات کی شو مارنے لگتا جو میں نے ویت نام جنگ کی تاریخ سے مُتعلق دو کلاسیں لینے سے اکٹھی کی تھیں۔ 'وہ جنگ تھی، بے بی او، امریکا کی طرف سے لڑی جانے والی سب سے بڑی جنگ۔ لڑنا سبھی کو تھا۔ حتیٰ کہ امریکی فوج کے پادری اور نائی بھی محاذ پر تھے۔'

لیکن آج بینن اپنے ایک برے، اور چاقو پھینک قسم کے موڈ میں تھا۔ اگر ہم اس کے گنگ ہو چاقو کے بارے میں بات نہ کرتے تو اس کے منھ سے اور کچھ بلوانا مشکل تھا۔ بینن کے منھ سے ایک نہ سلگایا ہوا حشیش کا سگریٹ لٹک رہا تھا جب کہ وہ اپنے گنگ ہو چاقو کو اس کی نوک سے پکڑے بروس لی کے پوسٹر کی جانب اس کے سفر پر غور کر رہا تھا۔

'مجھے ایک ٹارگٹ دو۔' اس کا مخاطب ہم میں سے کوئی ایک نہیں تھا۔

'اوپر سے تیسری پسلی۔' عُبید نے ائرکنڈیشنر کے پاس سے اپنا گال ہٹائے بغیر کہا۔ بینن نے چاقو کا دستہ ایک لمحے کے لیے اپنے ہونٹوں سے پکڑا۔ اس کے بعد اس کی کہنی نے حرکت کی اور چاقو ہوا میں گھومتا ہوا بروس لی کی تیسری اور چوتھی پسلی کے درمیان پیوست ہو گیا۔ 'ڈیم۔ ائرکنڈیشننگ کی' اس نے کہا۔ 'گنگ ہو آؤٹ ڈور میں بہترین کام کرتا ہے۔' اس نے ائرکنڈیشنر بند کرنے کے بعد ایک اور نشانہ لگانے کی تجویز دی۔ لیکن عُبید ان میں سے کوئی بھی تجویز قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ عُبید نے بروس لی کی دائیں چوچی کا نشانہ لینے کی ٹھانی لیکن اسے ٹھینگا ملا کہ اس کا نشانہ بروس لی کے دائیں کاندھے کے اوپر نیلے رنگ کے خلا میں لگا۔

میں نے پوسٹر سے چاقو نکالا اور پیچھے کی جانب چلا، اور اس دوران اپنی آنکھیں بروس لی کی دائیں آنکھ پر گاڑے رکھیں جن کا ہدف مجھے دیا گیا تھا۔ جب آپ کم فاصلے کے اہداف کو نشانہ بناتے ہیں تو ہتھیار کو سنبھالنے کا طریقہ نہیں بلکہ آپ کی اپنی آنکھ آپ کو ناکام بناتی ہے۔ ہدف کو آپ کی آنکھوں کے قرنیوں کے اندر الجھی ہوئی لکیروں کے درمیان موجود ہونا چاہیے۔ اگر ہدف آپ کی آنکھوں میں نہیں رہتا تو آپ اپنے ہاتھ چاہے کتنے ہی متوازن رکھ لیں اور اپنی سانس چاہے تب تک روکے رکھیں جب تک آپ

نیلے نہ پڑ جائیں لیکن پھر بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ آپ اپنے ہدف کا نشانہ لگالیں گے۔ جب چاقو میری انگلی کی پوروں سے نکلا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور انھیں تبھی کھولا جب میں نے بینن کی آواز سنی،'اوہ مین، اوہ مین۔' میں گدّے پر سے اترا، پوسٹر کی جانب چلتا ہوا گیا، بروس لی کی دائیں آنکھ کے قرینے سے اپنا چاقو نکالا اور اپنے کاندھے کے اوپر سے اچھال کر اسے بینن کی طرف پھینک دیا۔ مجھے یہ جاننے کے لیے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اُس نے اسے پکڑ لیا تھا۔ عُبید چلّایا: 'زیادہ شو نہیں مارو، علی۔ یہ تو سرکس کی ایک ٹِرک ہے۔'

بینن نے چاقو کو پھر سے اس کے چمڑے سے بنے غلاف میں رکھ دیا اور اپنا حشیش کا سگریٹ سُلگا لیا۔'دانانگ میں ہم نے ایک ویت نامی کو پکڑا جس نے میرے نو آدمیوں کو ایک چاقو سے قتل کیا تھا۔ وہ آدمی تھا کہ کوئی بندر۔ وہ درختوں میں چھپ جایا کرتا تھا؛ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ کسی چینی ٹارزن کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت تک لٹکتے اور جھولتے ہوئے پہنچ جاتا تھا۔ کسی نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ان سب کو ایک ہی طریقے سے قتل کیا، گشت کے دوران۔ ہمارے لڑکے اپنی ایم سولہ رائفلوں سے جھاڑیوں کا نشانہ بنائے وہاں سے گزرتے اور کسی بھی چھاپہ مار کے لیے تیار ہوتے، لیکن وہ کسی شاخ کے ہلنے کی آواز سنتے، اوپر کی طرف دیکھتے اور پھر سوِش ش ش ش۔' بینن اپنے حلقوم کو دو انگلیوں سے قطع کر کے دکھاتا۔ اس کی آنکھوں میں کسی سرخ رتی کی گرفت سخت پڑتی جا رہی تھی، اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ائرکنڈیشنر کمرے میں بھر جانے والے حشیش کے دبیز دھوئیں کو کھینچ کر کمرے سے باہر کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔

'میں نے اپنے بنکر کے آس پاس کچھ بارودی سُرنگیں لگوا دی تھیں اور وہاں ایک جملہ لکھوا دیا تھا: 'ہوچی مِنہ بھگوڑا کتا ہے۔' دشمن کو ورغلانے کے لیے، یو نو؛ ہم یہ کام بہت کرتے تھے۔ لیکن وہ لونڈا کبھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔'

حشیش کا ٹکڑا بجھ چکا تھا۔ بینن نے اُسے پھر سے سُلگایا اور یاد کرنے کی کوشش کی

کہ وہ کہاں تک پہنچا تھا۔

'تو بات یہ ہے کہ، جب ہم نے بالآخر اُسے پکڑ لیا، تو میرے لڑکے تو ہیم برگر کے لیے اس کا قیمہ بنانا چاہ رہے تھے۔ لیکن میں نے اُن سے کہا کہ ہمیں اس سے تفتیش کرنی چاہیے اور قوانین کے مطابق چلنا چاہیے۔ تو پتا یہ چلا کہ وہ سرکس میں کام کرتا تھا۔ یقین آیا تمھیں؟ اس نے تائیوان تک سفر کر رکھا تھا اور ہر جگہ وہ اپنی ماما پاجامہ گرل کے یہاں وہاں خنجر آزمائی کیا کرتا تھا۔ اور پھر اس کا اسّی سالہ باپ اپنے چاول کے کھیت میں کام کرتے ہوئے مارا گیا، اسے کسی نے ایک حملے کے دوران گولی مار دی تھی۔ اس لڑکے نے ویت کانگ میں شمولیت اختیار نہیں کی، اور وہ ایسا کرتا تو ماننے والی بات بھی تھی۔ اس نے بس یہ کیا کہ اپنے سرکس کے خنجر کے ساتھ جنگل کی راہ لی۔' اس نے ایک گہرا کش لیا اور مُنھ سے ایک مرغولہ سا باہر نکالا۔ 'تو اس لیے، بے بی او، میری اس دکھ بھری کہانی کا نکتہ یہ تھا۔ سرکس میں بھلے آپ چاقو پھینکنے کے ماہر ہوں اور آپ نے موٹے ممّوں والی عورتیں رکھی ہوئی ہوں، دنیا آپ کو ایک پاگل شو باز ہی کہے گی۔ لیکن آپ اُسی چاقو کو لیں، اس پر ذرا سے کسی مقصد کی پالش کریں اور آپ بن جاتے ہیں ایک صحیح انسان۔ تمھاری طرح کا کوئی ائرکنڈیشنر سپاہی نہیں، بلکہ ایک رئیل مین۔'

میں نے بینن کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنے حشیش کے سگریٹ کی مدد سے ایک سوال کی نقل کی۔ 'کیا تمھیں یقین ہے؟'

مجھے پکّا یقین تھا۔ عُبید نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ بینن نے حشیش کا سگریٹ میری جانب بڑھایا اور میں نے ایک ٹھیک ٹھاک قسم کا کش لیا اور اسے تب تک اپنے پھیپھڑوں میں رکھا جب تک میری آنکھوں میں پانی نہیں بھر آیا۔ تو بھئی اس تلخ و شیریں قسم کے دھوئیں کو اپنے سینے میں بھرنے اور کوئی آدھے گھنٹے بعد الٹی کرنے کے درمیان مجھے وہ پیا ہوا آئیڈیا آیا تھا جس نے مجھے اس مَئی خانے تک پہنچا دیا۔

۱۰

قوم سے اپنے خصوصی خطاب کی اگلی صبح اخبارات پر نظر ڈالنے کے بعد جنرل ضیا نے خود کو بہت خوش باش محسوس کیا۔ اس نے اخبارات کو کھانے کی میز پر ایک ایک کر کے بچھا دیا، یہاں تک کہ میز پر مہوگنی کی چمک دار سطح اس کی تصویروں اور اس کے لفظوں سے بھر گئی۔ اس نے اپنی سرخ پنسل ایک طرف رکھی، اپنی چائے کے گھونٹ بھرے اور کونے میں کھڑے ڈیوٹی ویٹر کی جانب ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ جنرل ضیا کو اپنے وزیرِ اطلاعات سے مُتعلّق یہ بات پسند تھی کہ اگرچہ وہ جعلی ایم بی اے ڈگری کا مالک ایک دھوکے باز حرام زادہ تھا اور جس نے ان بے کار کتابوں کی خریداری سے بہت رقم بنائی تھی جو فوجی کتب خانوں میں کبھی پہنچی ہی نہیں، لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اخبارات کے مدیران سے معاملہ کیسے کرنا ہے۔ جنرل ضیا نے ان مدیران کے ساتھ خود بھی دوستی گانٹھنے کی کوشش کی تھی اور اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایسے دانش ور ہیں جو اس کے ہم راہ خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے ہیں اور پھر سرکار کی طرف سے فراہم کردہ ہوٹل کے کمروں میں اس شراب سے مدہوش ہونے کے لیے بھاگتے ہیں، جو وزیرِ اطلاعات ان کے لیے لاتا ہے۔ اور اگلی صبح ان کے اداریے اُس سب کا ایک ملغوبہ ہوتے ہیں جو جنرل ضیا نے انھیں ان کی نمازوں اور شراب کی نشستوں کے درمیان بتایا ہوتا ہے۔

یہ صبح، تاہم مختلف تھی۔ قومی پریس میں بالآخر کچھ چنگاری نظر آئی تھی۔ مدیران نے

اس کی تقریر کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اپنا ذہن استعمال کیا تھا۔ ہر اخبار کی بینر ہیڈ لائن واضح اور صاف تھی۔ 'ہماری نظریاتی سرحدوں کے لیے جنگ شروع ہو چکی ہے۔' اُسے تین تصویروں کی پٹی والا وہ آئیڈیا خاص طور پر پسند آیا جو پاکستان ٹائمز کو سوجھا تھا۔ اس اخبار نے اس کی تقریر کے فی البدیہہ حصّے کو تصویروں سے واضح کیا تھا۔ 'سب سے پہلے میں ایک مسلمان ہوں' کا کیپشن اس کی ایسی تصویر کے نیچے لگایا گیا تھا جس میں وہ سفید سوتی کپڑے کا احرام پہنے کعبے میں خانۂ کعبہ کی دیوار میں حجرِ اسود پر جھکا ہوا تھا۔ 'اس کے بعد میں اسلام کا ایک سپاہی ہوں' کے الفاظ اس کی سرکاری پورٹریٹ کے نیچے ظاہر ہوئے۔ 'اور اِس کے بعد ایک مسلم ریاست کے منتخب سربراہ کی حیثیت سے میں اپنے عوام کا خادم ہوں' کا کیپشن تیسری تصویر کے نیچے لگا تھا، جس میں اسے صدارتی لباس میں دکھایا گیا تھا اور جس میں وہ ایک سیاہ شیروانی اور مطالعے کی عینک میں پر وقار لگ رہا تھا، رعب دار تو نہیں مگر تحکمانہ رویّے کا حامل، فوجی حکم راں نہیں بلکہ صدر۔

سربراہانِ مملکت، خصوصاً ترقی پذیر ملکوں کے سربراہانِ مملکت کو بہ مشکل ہی اس بات کا وقت ملتا ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اپنے کامیابیوں کا مزا لے سکیں۔ یہ ویسے ہی کچھ کمیاب لمحوں میں سے ایک تھا جب جنرل ضیا اپنی گود میں اخبار لیے اپنی کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا، ایک اور چائے کے کپ کا آرڈر دے سکتا تھا اور اپنی تیرہ کروڑ افراد پر مشتمل رعایا کی اجتماعی نیک خواہشات کو اپنے جسم اور ذہن پر پھیل جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ اپنی سرخ پنسل کے ساتھ اس نے کاغذ کے حاشیے پر ایک نوٹ لکھا تاکہ پاکستان ٹائمز کے مدیر کو قومی ادبی ایوارڈ کے لیے نام زد کرنے کے لیے وزیرِ اطلاعات کو بتا سکے۔ وہ اپنے وزیرِ اطلاعات کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اگر آپ اپنے دل سے بولیں تو لوگ ضرور سنتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اُس وقت کے بعد اس کی تمام تقریروں میں ایک حصّہ شامل ہوا کرے گا جو کچھ ایسے شروع ہوگا: 'میرے عزیز ہم وطنو، اب میں آپ کو کوئی بات اپنے دل سے کہنا چاہتا ہوں۔' اس نے تخیّل میں خود کو عوامی جلسوں کے دوران اپنی تحریری تقریر کو پھینکتے ہوئے دیکھا۔ 'میرے عزیز ہم وطنو، میں کسی تحریری اسکرپٹ کا لکھا نہیں پڑھنا چاہتا، میں کوئی کٹھ پتلی نہیں ہوں جو کسی مغرب سے پڑھ کر آئے ہوئے بیوروکریٹ کے لکھے ہوئے صفحے کے صفحے رٹتا چلا جاؤں۔ میں اپنے دل سے بولتا ہوں۔۔۔' وہ اپنا مُکا کھانے کی میز پر اس زور سے نیچے لایا کہ چائے کا کپ کھڑکھڑانے لگا، پاکستان ٹائمز اس کی گود سے نیچے گر گیا اور سرخ پنسل لڑھکتی ہوئی میز سے نیچے جا گری۔ کونے میں کھڑا ڈیوٹی ویٹر پہلے تو تن کر کھڑا ہو گیا لیکن پھر جنرل کے چہرے پر نشاط انگیز مُسکراہٹ دیکھ کر اس کے اعصاب پُر سکون ہوئے اور اس نے فرش پر سے کاغذ اور پنسل نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔

کسی بھی اور دن جنرل ضیا اداریے بھی ضرور پڑھتا، منفی تبصرے تلاش کرتا اور ان خاتون ماڈلوں کے اشتہارات پر نظر دوڑاتا جنھوں نے خود کو اچھی طرح ڈھکا ہوا نہ ہوتا، لیکن وہ اپنی تقریر کی کوریج سے اتنا مطمئن تھا اور اس کا دل اخبارات اور صحافیوں کے لیے اس قدر نرمی سے بھر گیا تھا کہ اس نے پاکستان ٹائمز کا پس سرورق دیکھا ہی نہیں۔ اس نے وہ تصویر نہیں دیکھی جس میں اسے فوجی لباس پہنے، سنہری پٹیاں لگی پی کیپ سر پر جمائے اور سینے سے درجن بھر میڈل جھلکاتے دکھایا گیا تھا۔ ایک ریشمی پٹی، جس پر تمام مسلح افواج کے نشان بنے ہوئے تھے، اس کے دھڑ کو آڑا کاٹتی تھی؛ اس کے ہاتھ اس کے عضو کے اوپر ایک دوسرے میں ایسے بندھے ہوئے تھے جیسے انھوں نے ایک دوسرے کو روک رکھا ہو؛ اس کے مُنھ کے ایک کونے میں رال سی جمع ہوتی ہوئی، اور اُس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی اور گھورتی ہوئی، جیسے وہ کسی ایسے بچّے کی ہوں جو چلتا ہوا کسی ٹافیوں کی دکان میں جا گھسا ہو اور اس نے وہاں دکان کے مالک کو سوتا ہوا پایا ہو۔

خاتونِ اوّل اخبارات سے دور ہی رہتی تھی۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ ہوتے جن کی اسے سمجھ نہ آتی اور اس کے شوہر کی بہت سی تصویریں ہوتیں۔ وہ خود کبھی کبھار ہی

اخبارات میں آتی اور جب بھی آتی وہ بچوں کے کسی میلے یا خواتین کی قرآن خوانی کے ایسے مقابلے میں شریک ہوتی جس میں جنرل ضیا اسے اس لیے بھیج دیتا تھا کہ وہ حکومت کی نمایندگی کر سکے اور انعامات تقسیم کر سکے۔ وزیرِ اطلاعات اسے ان تصویروں کے تراشے بھیجا کرتا تھا اور وہ عموماً انھیں جنرل ضیا سے چھپا لیتی کیوں کہ وہ اس کی شباہت میں ہمیشہ نقص تلاش کر لیتا تھا۔ اگر وہ میک اپ کیے ہوتی، تو وہ اس پر ہائی سوسائٹی کی مغرب زدہ عورتوں کی نقالی کا الزام لگاتا۔ اگر وہ میک اپ نہ کیے ہوتی تو وہ کہتا کہ وہ موت کی طرح لگ رہی ہے کسی خاتون اوّل کی طرح نہیں۔ وہ مستقل اسے لیکچر دیتا کہ ایک اسلامی ریاست کی خاتونِ اوّل ہونے کی حیثیت سے اسے دوسری عورتوں کے لیے رول ماڈل ہونا چاہیے۔ 'ذرا دیکھو تو مسز چاؤشسکو نے اپنے ملک کے لیے کیا کیا ہے۔'

خاتونِ اوّل کبھی مسز چاؤشسکو سے نہیں ملی تھی اور اس کے شوہر نے یہ وضاحت کرنے کی کبھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کون تھی اور کیا کرتی تھی۔ وہ دوسری خواتینِ اوّل کو شاپنگ کرانے لے جاتی تھی، لیکن اس میں اُسے مزہ نہیں آتا تھا کیوں کہ دکان دار یا تو پیسے لینے سے انکار کر دیتے یا قیمت اتنی کم بتاتے کہ وہ مول تول بھی نہیں کر پاتی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی بازار گاہکوں سے خالی کرا لیے جاتے اور وہ ایسا محسوس کرتی جیسے وہ ٹیلے وژن کے کسی سوپ اوپرا کے سیٹ پر ہو۔ جنرل ضیا اخبارات کا مطالعہ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تاکہ وہ ان سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو جان سکے جو وہ ملک میں لا رہا تھا، لیکن وہ اس کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ 'یہ اخبار بس اسی سے بھرے ہوتے ہیں کہ تم نے کیا کہا اور تم نے کیا کیا اور تم کس سے ملے۔ حالانکہ تم ہر وقت یہیں ہوتے ہو، گھر کے اردگرد۔ کیا میں تمھیں اتنا نہیں دیکھ لیتی کہ تمھیں ہر چیتھڑے کے ہر صفحے سے خود کو گھورتا ہوا دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے؟'

قومی پریس کی جانب ایسی بے رخی کے باوجود یہ کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا کہ خاتونِ اوّل نے پاکستان ٹائمز کی ایک کاپی اپنے سونے کے بستر کے ساتھ موجود میز پر

پائی، جسے اس انداز سے فولڈ کیا گیا تھا کہ اس کے پچھلے صفحے پر موجود تصویر نمایاں ہو سکے جو ہر مرد پر سے اس کا اعتبار ہمیشہ کے لیے اُٹھا دینے والی تھی اور پاکستان ٹائمز کے مدیر کی اچانک برطرفی کا سبب بننے والی تھی۔

تصویر میں پہلی شے جس نے خاتونِ اوّل کو ششدر کر دیا اس گورے رنگ کی عورت کے بلاؤز سے باہر کو نکلنے والے گوشت کی مقدار تھی۔ وہ فوری طور پر جان گئی کہ ویسا ہی ایک نیا برا زیب تن کیے ہوئے تھی جن میں ایک تارگی ہوتی ہے اور جو پستانوں کو اوپر اُٹھا کے رکھتے ہیں اور جس سے وہ بڑے بڑے لگتے ہیں۔ بہت سے دوسرے جرنیلوں کی بیویاں وہ برا پہنتی تھیں لیکن انھیں اتنی تو تمیز ہوتی تھی کہ ان کے اوپر ٹھیک سے قمیص پہنیں تاکہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آئے اور وہ صرف ان کے بڑھے ہوئے جسمانی حصوں کی جانب اشارہ سا کر سکے۔ اُس تصویر میں عورت جو بلاؤز پہنے ہوئے تھی اُس کا گلا اتنا نیچے تھا کہ اس کے نصف سے زیادہ پستان باہر تھے، انھیں اتنا اوپر اُٹھایا گیا اور اتنی سختی سے ایک دوسرے کے ساتھ دبایا گیا تھا کہ اس کے ہار کا ہیرا اُس کے کلیویج کے جوڑ کے اوپر رکھا آرام کر رہا تھا۔

اور پھر، وہاں اُس کا شوہر بھی تھا، مردِ حق، مردِ مومن، جو ٹی وی کے پرائم ٹائم پر عورتوں کو پرہیز گاری کا درس دیا کرتا تھا، وہ آدمی جس نے ججوں اور ٹیلے وژن کی نیوز کاسٹروں کو بھی اپنے سروں پر دوپٹا نہ لینے پر نکال باہر کیا تھا، وہ آدمی جس نے یقینی بنایا تھا کہ ٹیلے وژن ڈرامے کے دوران کسی خالی بستر پر دو تکیے ساتھ ساتھ نظر نہ آئیں، وہ آدمی جس نے سینما مالکان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ فلم پوسٹروں پر اداکاراؤں کی ننگی ٹانگوں اور بانہوں پر سیاہی پھیر دیں؛ وہی آدمی وہاں بیٹھا سفید جسم کے ان گلوبوں کو ایسی یک سوئی کے ساتھ دیکھ رہا تھا جیسے اُس کی اپنی بیوی ان کی جوڑی کے بغیر ہی پیدا ہوئی ہو۔

کیپشن میں بڑے بے ضرر انداز سے لکھا تھا: صدرِ مملکت مشہور غیر ملکی صحافی جواین ہیز نگ کو انٹرویو دے رہے ہیں۔

انٹرویو کی ایسی کی تیسی، اُس نے سوچا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنرل ضیا کا انٹرویو
مس بیز نگ نہیں لے رہی تھی بلکہ وہ جنرل ضیا تھا جو اس کے پستانوں کی تفتیش کر رہا تھا۔
اس نے اخبار ایک طرف رکھا، پانی کا ایک گلاس پیا، اپنی چونتیس سالہ رفاقت کا سوچا، خود
کو اپنے پانچ بچوں کی یاد دلائی جو اب بڑے ہو چکے تھے، اور اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی
جس کی ابھی شادی ہونا تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے شک ہوا کہ اس کی آنکھوں نے ابھی
ابھی کیا دیکھا ہے اور اُس نے اخبار دوبارہ اُٹھا لیا۔ غلط فہمی کی بات ہی کوئی نہیں تھی۔ یہ
ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس میں آپ مدیر کے نام کوئی خط لکھ دیتے ہیں اور اس سے مطالبہ
کرتے ہیں کہ وہ اُس کی دُرستی کر دے۔ جنرل ضیا کی آنکھیں جو عموماً بھینگی تھیں، جب
دائیں آنکھ ایک جانب دیکھ رہی ہوتی تو بائیں آنکھ کسی اور چیز کو دیکھنے نکل جاتی تھی، یہاں
پہلی مرتبہ ایک ہی سمت اور ایک ہی شے پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھیں۔ اس کے گھورنے کا
زاویہ اتنا واضح تھا کہ اگر وہ کسی پنسل سے دو لائنیں کھینچتی تو وہ اس کی آنکھ کے قرنیے کو اوپر
اُٹھائے اور باہم جوڑے ہوئے دو سفید گنبدوں سے سیدھا جوڑ دیتے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری مرتبہ جب اس نے اِس عورت کو دیکھا تھا
تو اِس نے کیا پہن رکھا تھا۔ مگر وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے شوہر نے جب اس
عورت کو آخری مرتبہ دیکھا تھا تو وہ کیسا لگ رہا تھا۔

جب اس کے شوہر نے اسے کہا کہ وہ امریکا کے دورے کے لیے اُس کا پرانا
سفاری سوٹ پیک کر دے تو خاتونِ اوّل نے شک کرنا شروع کیا کہ اس کا شوہر کچھ
کرنے کو ہے۔ جب اُسے یہ بتایا گیا کہ ان کا پہلا اسٹاپ واشنگٹن ڈی سی یا نیو یارک
نہیں بلکہ ٹیکساس کا شہر لفکن ہوگا، جہاں وہ ایک خیراتی رقص میں شرکت کریں گے، تو اس
کے شبہات مزید گہرے ہو گئے۔ جدہ، بیجنگ، دبئی، لندن، سب جگہ جانا وہ سمجھ سکتی تھی۔
جنرل ضیا یہاں متواتر جاتا رہتا تھا۔ لیکن لفکن؟ سفاری سوٹ؟ بوڑھا یقینی طور پر چکر

چلانے والا ہے، خاتونِ اوّل نے اس کے بچ کلر کے پولی ایسٹر سے بنے سفاری سوٹ
میں کوئی غائب شدہ بٹن تلاش کرتے ہوئے سوچا۔

جنرل ضیا نے فوجی وردی کے علاوہ اپنے وارڈ روب سے تمام مغربی ملبوسات نکال
دیے تھے۔ سرکاری تقاریب کے لیے وہ ہمیشہ ایک سیاہ شیروانی پہنتا اور اس کی دیکھا
دیکھی، بیوروکریٹوں نے بھی اسی لباس کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ پہننا شروع کر دیا تھا۔
لباس میں اختراعات کے دلدادہ افراد نے اس کی تراش خراش اور رنگ میں تبدیلیاں کی
تھیں، اور کبھی کبھار سر کے پہناوے میں بھی، لیکن بنیادی طور پر وہ سب اسی لباس سے
جڑے رہے جسے جنرل ضیا نے قومی لباس قرار دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن تمام اصول پسند
افراد کی طرح جنرل ضیا بھی کسی ارفع مقصد کی خاطر کسی تبدیلی پر تیار رہا کرتا تھا۔ اور اگر
مقصد افغان جہاد کے لیے فنڈ اکٹھے کرنا ہوتا تو کوئی اصول مقدس نہ رہتا۔

لفکن میں ہونے والے چیریٹی بال کی میزبان جواین بیز نگ تھی، جو لفکن کے
کیبوئی ٹیلی وژن مین پرائم ٹائم کی اینکر تھی اور امریکا میں پاکستان کی اعزازی سفیر بھی؛ یہ
عہدہ اسے جنرل ضیا کو چار گھنٹے طویل، روح کی گہرائیوں تک جھانکنے والا انٹرویو دینے کے
بعد ملا تھا۔ جواین دنیا کو بدی کے پاک کرنے کے مشن پر تھی لیکن اس کا اصرار تھا کہ اس
کام کے دوران موج مستی بھی کرنی چاہیے۔

اور قسم سے لفکن کو موج مستی کی شدید ضرورت تھی۔

عام خیال کے برعکس لفکن کے تیل کے کروڑ پتی تاجر بہت مردہ دل تھے۔ اُن کا
سیاسی اثر معمولی تھا اور ان میں سے بہت کم، ویسا رنگین لائف اسٹائل رکھتے تھے جسے لفکن
کے باہر موجود میڈیا پروجیکٹ کرنا پسند کرتا تھا۔ کانگریس کے اپنے مقامی رکن کے لیے ان
کا دس ہزار ڈالر کا عطیہ انہیں وائٹ ہاؤس کے کسی معاون کی طرف سے کسی خط پر
دست خط ہی دلا پاتا۔ وہ جن کی جیبیں زیادہ گہری ہوتیں، ان میں سے ایک لاکھ ڈالر تک
کی رقم نکالتے اور انہیں واشنگٹن ڈی سی میں صدر ریگن کے ساتھ سالانہ دعائیہ ناشتے میں

شرکت کی دعوت مل جاتی جہاں صدر پوڈیم پر دعا کے بعد پندرہ منٹ کے لیے ان سے ملاقات کرتا اور پھر ان کے ہلکے سے گرم دلیے اور کافی کے ساتھ انھیں اکیلا چھوڑ جاتا۔ اس لیے ایک صدر کی آمد، چاہے وہ پاکستان کا صدر ہی کیوں نہ ہو، جس ملک کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے، ان کے لیے اتنے معنی ضرور رکھتی تھی کہ وہ اپنے ٹکسیڈو سوٹ اور بال گاؤن ڈرائی کلینرز کو بھجوا دیں۔ پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ نہ صرف ایک صدر بلکہ ایک چار ستارہ جرنیل بھی تھا، اور دنیا میں سب سے بڑی مسلم فوج کا سربراہ تھا اور جیسا کہ انھیں ان کی پسندیدہ نیوز اینکر ہر روز یاد دلاتی تھی، وہ اُن سات آدمیوں میں سے ایک تھا جو سوویت سُرخ فوج اور آزاد دنیا کے درمیان کھڑے تھے۔

رقص سے پہلے ہونے والے شو کے پس منظر کے لیے جواین نے پاکستان کے جھنڈے کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مشرقی ٹیکساس کی کمیونٹی کے معزز ترین لوگ اور سوویت یونین کے خلاف جہاد کے متوقع حامیوں کو دعوت نامے ارسال کیے گئے جن میں ایک مرے ہوئے افغان بچے کی تصویر ہوتی (کیپشن: ریڈ ہونے سے ڈیڈ ہونا بہتر)۔ دوسرے دعوت ناموں میں پرانی سی شال میں ایک بے نام افغان مجاہد کاندھے پر راکٹ لانچر رکھے نظر آتا (کیپشن: آپ کے دس ڈالر اسے روسی ساختہ ہائنڈ ہیلی کاپٹر مار گرانے میں مدد دے سکتے ہیں) ہاں بھئی مزا آیا؟ کیا یہ صدی کا سب سے اچھا سودا نہیں؟' جواین نے اپنے دعوت ناموں کے بعد جوش و جذبے سے بھری فون کال بھی کیں اور ٹیکساس کے اُس چھوٹے سے قصبے کو افغان مجاہدین کے لیے بیس کیمپ میں تبدیل کر دیا جو وہاں سے چھ ہزار میل دور لڑ رہے تھے۔

لفکن میں واقع ہالیڈے ان نے اپنی چوتھی منزل کو صدارتی فلور کا نام دیا۔ جواین نے اُنھیں پاکستانی پرچم کے ساتھ ساتھ قرآن کی تلاوت پر مبنی ایک آڈیو ٹیپ بھی دی تھی جو فوری طور پر گوشت سپلائی کرنے والے کو بھجوا دی گئی تھی کیوں کہ جب ذبیحہ شروع ہوتا تھا تو یہ ٹیپ اُس دوران چلائی جانا تھی۔ صدر صاحب کو ان کا حلال گوشت مل جائے گا۔

ویٹروں کو بھی اپنا سلام اردو میں کرنا سکھا دیا گیا۔

ان تمام کوششوں کے باوجود جب جنرل ضیا کا کانوائے ہالیڈے ان کے پورچ میں داخل ہوا تو جنرل ضیا یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ وہاں معمولی سے دفتر جیسا ایک ڈھانچا کھڑا ہے جس پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہے۔ اس نے صدارتی سویٹ میں خاتونِ اول کو بٹھایا۔ اس نے سونے کے کمرے کے سائز اور غسل خانے میں موجود غسل و سنگھار کے اعزازی لوازمات کے بارے میں شکایت کی اور اس وقت اپنے مزاج کی شگفتگی واقعی میں بھول گئی جب اس نے ہوٹل کی ریسپشن پر موجود لڑکی کو آرمی ہاؤس ملانے کے لیے کہا اور اس کا رابطہ سالویشن آرمی کے مقامی اسٹور سے کرا دیا گیا۔

اس دوران جنرل ضیا نے، کچھ مشکل کے ساتھ، اپنا سفاری سوٹ پہن لیا۔ اس میں سے اس کی توند فٹ بال کی طرح باہر نکل آئی اور اس کی سفاری شرٹ اسے بہ مشکل سنبھال پا رہی تھی۔ وہ ٹیکساس کے کسی اہم سینیٹر سے ملاقات سے متعلق کچھ بڑبڑایا، اپنا بریف کیس اُٹھایا اور اسی منزل پر واقع ایک اور کمرے میں چلا گیا جس پر 'صدارتی دفتر' کے نام کا ایک نشان لگا ہوا تھا۔ وہ یہ خوب محسوس کر رہا تھا کہ یہ ہوٹل اس کی حیثیت سے کم تر تھا۔ وہ بہ ذاتِ خود ایک منکسر مزاج آدمی تھا اور اسے صرف ایک بستر اور ایک جائے نماز کی ضرورت تھی لیکن سربراہانِ مملکت کو منصب صدارت کے شایانِ شان ہوٹلوں میں قیام کی ضرورت ہوتی تھی تا کہ وہ اپنے مقاصد کی اہمیت نظر انداز نہ کر بیٹھیں۔ اسے اپنے ملک کی عزت برقرار رکھنے کی ضرورت تھی لیکن جواین نے جو کچھ اُس کے ملک اور افغان کاز کے لیے کر دیا تھا اس کے بعد وہ اس سے ہوٹل کے معاملے پر بات نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے اپنا بریف کیس ڈیسک پر رکھا، ہوٹل کا اسٹیشنری پیڈ اُٹھایا اور کاغذ پر کچھ سطریں گھسیٹ کر اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو پُر سکون کرنے کی کوشش کی۔ اس کی میزبان، جدوجہد میں اس کی شریک ساتھی، جواین جلد ہی وہاں آنے والی تھی اور وہ یہی کچھ سوچ سوچ کر نروس ہوا جاتا تھا کہ اس نے کیا پہن رکھا ہوگا، اور اس نے کون سی خوش

بُو لگا رکھی ہوگی۔ پسینے کی ایک لکیر اس کی ریڑھ پر چلتی ہوئی نیچے جانے لگی۔ اپنی توجہ بنانے کے لیے اُس نے چیریٹی بال میں کی جانے والی اپنی تقریر کے لیے نوٹس لکھنے شروع کر دیے:

۱۔ ایک لطیفہ جس میں اسلام آباد اور لنڈن کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ (کہ وہ اس سے رقبے میں نصف ہے اور مردہ دلی میں دُگنا)

۲۔ اسلام، مسیحیت۔۔۔ اچھائی کی قوتیں، اشتراکیت بدی کی قوت (لفظ استعمال کرنا ہے 'خدا کے منکر')

۳۔ امریکا سپر پاور ہے لیکن ٹیکساس اصلی سپر پاور ہے؟ اور لنڈن اس اصلی سپر پاور کی روح ہے؟ (جوآین سے کوئی کاؤ بوائے مقولہ پوچھنا ہے؟)

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ اپنی نشست سے اُچھل پڑا اور انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ کیا اسے اپنی ڈیسک سے دور ہٹ جانا چاہیے، اس کا استقبال دروازے پر کرنا چاہیے؟ ہاتھ ملانا چاہیے؟ گلے ملنا چاہیے؟ گالوں کو چُومنا چاہیے؟

جنرل ضیا جانتا تھا کہ مردوں کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے۔ جو بھی اُس سے ملتا اس کا دونوں ہاتھوں سے کیا جانے والا مصافحہ نہ بھول پاتا۔ سنکی ڈپلومیٹ بھی اس کے معانقوں کی حقیقی گرمی سے انکار نہ کر پاتے۔ سیاست دان جب اُس کا تسلی بخش ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھا پاتے اور اپنی پیٹھ پر اس کی تھپکی محسوس کرتے تو اس کے کاز کے قائل ہو جاتے۔ لیکن اسے یہ دیکھنے میں وقت لگا تھا کہ خواتین کے ساتھ معاملہ کیسے کیا جائے، خصوصاً غیر ملکی خواتین کے ساتھ۔ اس نے اپنا اسٹائل پہلے خود ایجاد کیا اور پھر اس کا ماہر ہو گیا؛ جب وہ استقبالیہ قطار میں کھڑی کسی خاتون کے پاس پہنچتا تو اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیتا، اور احترام کے طور پر اپنا سر جھکا دیتا۔ وہ خواتین جو گھر سے تیاری کر کے آئی ہوتیں وہ اپنا ہاتھ اپنے پاس ہی رکھتیں اور اس کے عمل کی ستائش میں سر ہلا دیتیں۔ جو خواتین اس کی

پرہیزگاری کی حدود کا امتحان لینے پر اُدھار کھائے بیٹھی ہوتیں اور اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا ہی دیتیں تو انھیں چار انگلیوں والا ایک مُرجھایا ہوا مصافحہ اور اپنی آنکھوں میں دیکھنے سے انکار جواب میں ملتا۔

لیکن جوآین کا معاملہ مختلف تھا۔ جب وہ اُس سے پہلی مرتبہ آرمی ہاؤس میں انٹرویو کرنے آئی تھی تو اس نے دل پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ اور اس کا جھکتا ہوا سر اور اس کی طرف سے مصافحے کی کوشش کو بھی نظر انداز کر دیا تھا اور سیدھا اس کے دونوں رخساروں پر بوسے لے کر بریگیڈیئر ٹی ایم کو دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے اس پہلی ملاقات میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک خاص شخصیت سے معاملہ کر رہا ہے، ایک ایسی شخصیت جس پر وہ خواتین سے مُتعلق اپنے سماجی ضوابط لاگو نہیں کر سکتا۔ کیا اسلام کی پہلی جنگ میں خاتون مجاہدائیں نہیں تھیں جنھوں نے مردوں کے شانہ بہ شانہ لڑائی لڑی تھی؟ کیا خدا کے منکر اشتراکیوں کے خلاف اس کے جہاد میں وہ اس کی اتحادی نہیں تھی؟ کیا اس نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے لیے اس سے بھی زیادہ کرے گی جتنا امریکی محکمۂ خارجہ کر سکتا ہے؟ کیا اسے اعزازی طور پر ایک مرد نہیں سمجھا جا سکتا تھا؟ بلکہ ایک مجاہد؟ اس مرحلے پر اس کی منطق اس کا ساتھ چھوڑ جاتی اور وہ اس کے سنہری، بلو ڈرائی کیے ہوئے بال، اس کا دل جیسی شکل کے ہیرے کا ہار جو اس کی چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا، اس کے شہوت بھرے سُرخ ہونٹ اور اس کی گرم سانسوں سے بھری سرگوشیاں یاد کرنے لگتا جو اس کے کان میں پڑتی تھیں تو انتہائی معمول کی باتیں بھی کسی خفیہ منصوبے کی طرح لگتی تھیں۔

اللہ صرف اپنے پیاروں کو ہی امتحان میں ڈالتا ہے، اس نے نجانے کون سی مرتبہ خود کو بتایا اور انتہائی عزم کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

'جی، اندر آ جایئے۔' اس نے کہا۔

دروازہ کھلا اور صندل کی لکڑی کے پرفیوم کی خوش بُو، اس کی آڑو کے رنگ کی سلک اینڈ ماولپ اسٹک ایک لہر کی صورت اس کی جانب بڑھے، وہ خود کوئل کی طرح چہکی،

'یور ایکسی لینسی۔ لفکن کے عمدہ شہر میں آپ کا سواگت کرتی ہوں۔' جنرل ضیا کھڑا ہوا، اس نے اب تک طے نہیں کیا تھا کہ اسے اپنی ڈیسک سے آگے آ جانا چاہیے یا نہیں، اسے بوسہ دینا چاہیے، یا گلے لگانا چاہیے یا ڈیسک کے پیچھے محفوظ جگہ سے ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھانا چاہیے۔ پھر جب جوائن اس کی جانب لپکی تو وہ ضبطِ نفس جس نے اسے تین جنگوں، ایک بغاوت اور دو انتخابات سے بچ نکلنے میں مدد دی تھی، رخصت ہو گیا۔ اس نے وہ میز چھوڑ دیا جسے لبھاؤ کے خلاف اس کا دفاع ہونا تھا اور کھلی ہوئی بانہوں کے ساتھ اس کی طرف چل پڑا۔ اس دوران وہ اس کے چہرے یا نقوش پر توجہ مرکوز نہ کر سکا۔ اسے گلے سے لگاتے ہوئے اس نے ایک اطمینان کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ وہ اونچی ہیل کے جوتے نہیں پہنے ہوئے تھی، جن کی بدولت وہ خود اُس سے لمبی ہو جاتی تھی۔ اس کے ہیل والے جوتوں کے بغیر ان دونوں کے قد برابر تھے۔ اس کا بایاں پستان اس کے سفاری سوٹ کی چُنٹ کے ساتھ دھیرج سے ٹکرایا اور جنرل ضیا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، جبکہ اس کی تھوڑی اس کے کاندھے پر ساٹن کے برا کے اسٹریپ پر آرام فرما ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے خاتونِ اوّل کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے چمکا۔ اس نے دوسری باتیں سوچنے کی کوشش کی: اپنے شان دار کیریئر کے لمحات؛ رونالڈ ریگن سے اس کا پہلا مصافحہ؛ اقوامِ متحدہ میں اس کی تقریر؛ خمینی کا اسے بتانا کہ کوئی بات نہیں دھیرج رکھو۔ یہ خواب اس وقت اچانک ختم ہو گیا جب وہ بل کھا کر اس کی بانہوں سے نکل گئی، اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کے دونوں رُخساروں پر چٹاخ چٹاخ ایک ایک بوسہ جڑ دیا۔

'یور ایکسی لینسی، آپ کو کچھ کُتر بیونت کی ضرورت ہے۔'

جنرل ضیا نے سانس کھینچ کر اپنا پیٹ اندر کر لیا۔ اس نے اپنی انگلیوں سے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی مونچھوں کو چھیڑا اور کہا، 'ٹیکساس والوں کے دل بڑے ہوتے ہیں' لیکن جب معاملہ چہرے پر بال رکھنے کا ہو تو وہ بہت چھوٹے دل والے نکلتے ہیں۔ اب

اگر آپ دروازے سے باہر کھڑے اس ہینڈسم جوان سے کہیں کہ وہ میرے آدمی کو اندر آنے دے تو ہم اس معاملے کو طے کرتے ہیں۔'

اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ جنرل ضیا نے بریگیڈیئر ٹی ایم کو چلا کر حکم دیا۔ 'آدمی کو اندر آنے دو ٹی ایم۔'

لفکن کا واحد بزنس مین جسے چیریٹی بال کی دعوت نہیں ملی تھی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک بوڑھا سیاہ فام آدمی تھا جس کے پاس نائیوں جیسا چمڑے کا بیگ تھا۔ 'سلام علیکم،' اس نے کہا۔ 'آپ لوگ اسے مونچھ کہتے ہیں، مجھے پتا ہے۔ میں اس مونچھ کو شارپ کر دوں گا، یور ہائی نیس۔' اس سے پہلے کہ جنرل ضیا کچھ کہتا، اُس نے ایک سفید تولیا اس کی گردن کے گرد اوڑھا دیا اور باتیں کرتے ہوئے ہی اس کی مونچھ کترنے لگا۔ 'آپ اولڈ رونی سے بھی ملیں گے؟ کیا میں آپ کو ایک اہم پیغام دے سکتا ہوں؟ اسے بتائیں کہ وہ کوئی جان وین نہیں ہے۔ اس کی نقل نہ مارے۔ لفکن ایک فائن اولڈ سٹی ہے لیکن اس کے کچھ لوگ نسل پرست ہیں۔ جب ان کے بچے کھانا نہیں کھاتے وہ انھیں کہتے ہیں دیکھو جنگل میں ایک کالا ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ کالے نے کوریا کے جنگل دیکھے ہیں، ویت نام کے جنگل دیکھے ہیں۔ اب یہ کالا جنگل میں نہیں رہتا، یہ کالا یہاں رہتا ہے اور اس کے پاس اُسترا ہے جو اب تمھاری گردن پر ہے اس لیے جو کچھ کہنا ہے احتیاط سے کہنا۔' اس نے نقرئی فریم کا ایک آئینہ اس کے سامنے کر دیا۔ جنرل ضیا کی بڑی بڑی مونچھیں کتر کر ایک پتلی سی لکیر میں تبدیل کر دی گئی تھیں۔ وہ شارپ تھیں اور ٹھیک ٹھاک۔ 'اس سے تمھاری عورت کے تو آ جائیں گے مزے۔'

اس سے خاتونِ اوّل کو کوئی خاص مزا نہیں آیا، اُلٹا اس نے اس پر جھنجھلتی سی طنزیہ نگاہ ضرور ڈالی۔ 'میں بس اپنے میزبانوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی ایک اچھے کاز کے لیے۔' جب خاتونِ اوّل ٹیلے وژن پر چینل تبدیل کر رہی تھی جنرل ضیا نے مُنھ ہی مُنھ میں بڑبڑا کر کہا۔

'تمھارا مطلب ہے خاتون میزبان۔' اس نے ٹی وی سیریز ڈیلاس دیکھنا شروع کر دی۔

* * *

خاتونِ اوّل غصّے کی عادی نہیں تھی اور اس کا پہلا احساس یہی تھا کہ وہ اُس اخبار کو پھاڑ ڈالے، کہیں پھینک دے اور اس سارے معاملے کو بھول جانے کی کوشش کرے۔ وہ یہ سب ضرور دیکھے گا اور اسے احساس ہوگا کہ وہ خود کو کیسے احمق بنا رہا ہے۔ تریسٹھ سال کی عمر میں اور اپنے نام کے ساتھ پانچ پانچ عہدے لگائے ہوئے، اور تیرہ کروڑ آبادی کو جواب دہ ہوتے ہوئے وہ نیکساس کی فاحشاؤں پر مرا جا رہا تھا اور بیٹھ کر ان کے مَمے تاڑتا رہتا تھا۔

پھر اچانک اس پر کھلا کہ ہزاروں اور لوگ بھی اس تصویر کو دیکھ رہے ہوں گے: وہ سب کیا سوچ رہے ہوں گے؟ ظاہر ہے کسی کو بھی اس مشہور غیر ملکی رپورٹر کی تو فکر ہوگی نہیں، اس نے اندازہ لگایا۔ وہ ایک پیشہ ور خاتون تھی، وہ ایک امریکی شہری تھی، وہ جو چاہتی تھی پہن سکتی تھی۔ اگر اسے صدور سے انٹرویو کرنے کے لیے پُش اپ برا اور بڑے گلے والے لباس پہننے ہیں تو ٹھیک ہے، اسے پیسہ بھی تو اسی کا مل رہا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کا تعلّق ہے تو؟ اسے واقعی نہیں معلوم تھا کہ عوام اس کے بارے میں کیا کہتے تھے، لیکن اس کے اردگرد ایسے لوگ تھے جو اسے یہ بتاتے تھے کہ یہ سب اخبار کی سازش ہے، کہ یہ تصویر توڑ مروڑ کر تیار کی گئی ہے اور ایسا فحش مواد شائع کرنے پر مدیر کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔

لیکن وہ تصویر میں جو کچھ دیکھ رہے تھے، اگر وہ اس پر یقین بھی کر لیتے تو کیا ہو جاتا؟ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ پرہیزگاری اور پردے کے ان تمام بھاشنوں کے پیچھے ایک گرم خون رکھنے والا مرد ہے جو تاکا جھانکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اور پھر اسے لگا کہ وہاں ایک اور بھی شخص ہے، جو تصویر میں نظر

نہیں آ رہا، جس کا نام کیپشن میں بھی درج نہیں، اور جو قوم کے مضحکہ اڑانے کا اصلی ہدف ہوگا۔ وہ کابینہ کے اجلاسوں میں ہنسی کی ہلکی ہلکی آوازوں کو سن سکتی تھی: ہمیں نہیں معلوم تھا کہ صدر صاحب کو بڑے بڑے اور سفید پسند ہیں۔ وہ نیشنل کمانڈ کے بنکر میں ہونے والی طنزیہ گفتگو سن سکتی تھی: بوڑھا سپاہی اب بھی اہداف پر نظر رکھتا ہے بھئی۔ اینٹی بیلسٹک کی عمدہ جوڑی ہے جناب۔ اور ہائی سوسائٹی کی ان بیگمات کے بارے میں کیا خیال ہے: بے چارہ۔ بھلا قصور ہی کیا ہے اُس کا؟ اس کی بیوی دیکھی ہے کبھی؟ دیکھنے میں ایسی لگتی ہے جیسے سارا دن چولہے کے آگے گزارنے کے بعد ابھی ابھی اپنے گاؤں سے آئی ہو۔

خاتونِ اوّل نے محسوس کیا جیسے تیرہ کروڑ لوگوں کی قوم اُس لمحے اسی تصویر کی طرف دیکھ رہی ہے، اور اسے اُس پر ترس آ رہا ہے، وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے بُحیرۂ عرب کے ساحلوں سے لے کر ہمالیہ کی پہاڑیوں تک قہقہوں کی ہول ناک آوازیں بلند ہوتے ہوئے سنیں۔

'میں نوچ ڈالوں گی وہ آنکھیں۔' وہ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکاری۔ 'اور تمھارے اُس بڈھے کا تو میں قیمہ بناؤں گی، حرامی۔'

کچن سے ڈیوٹی ویٹر بھاگتا ہوا آیا۔ 'میں واک پر جا رہی ہوں۔ پی ایم کے آدمیوں سے کہو میرا پیچھا نہ کریں۔' خاتونِ اوّل نے اخبار کو رول کر کے ایک ٹائٹ سا ڈنڈا بناتے ہوئے کہا۔

جذبۂ فولاد

۱۱

مجھے آنکھوں پر پٹی باندھنے والا آدمی اس قسم کے کاموں کا ماہر لگتا ہے۔ اس کے تازہ شیو کیے ہوئے دائیں گال پر آدھے چاند جیسا زخم کا نشان، اس کی پینسل جتنی پتلی مونچھ اور اس کی اچھی طرح سی استری کی ہوئی شلوار قمیص اسے کسی اصلاح شدہ بدمعاش جیسا روپ دیتے ہیں۔ اس کی انگلیاں نرمی سے کام کرتی ہیں اور وہ میرے سر کے پیچھے پھرتی سے ایک چھوٹی سی گانٹھ لگا دیتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتا ہے اور مجھے باہر لے جاتا ہے۔ آنکھوں پر لگی پٹی اتنی ڈھیلی ضرور ہے کہ میں اپنی آنکھیں کھول سکوں لیکن اتنی سخت بھی ہے کہ ان میں روشنی کی کوئی بھولی بھٹکی شعاع نہ آ سکے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ مجھ سے آنکھوں کی پٹی کے پیچھے اپنی آنکھیں کھولے رکھنے کی توقع کی جا رہی ہے یا بند رکھنے کی۔
جب ہم غسل خانے سے باہر آتے ہیں تو میں ہوا سے بڑی بڑی سانسیں بھرتا ہوں، اس امید میں کہ یہ میرے جسم کو غسل خانے کی بد بُو سے چھٹکارا دلا دیں گے، لیکن میں اُس بدبُو کا ذائقہ اب بھی اپنے حلق کے پچھلے حصے میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اس بد بُو کو ختم کرنے کے لیے تو عُبید کے پرفیوم کی ساری کلیکشن بھی کافی نہیں ہوگی۔

راہ داری چوڑی ہے، چھت اونچی ہے اور میرے بوٹوں کے نیچے پتھر کی غیر مسطح اینٹوں کا بنا فرش ہے۔ ہمارے بوٹوں کی آواز، جو پہلے چند غیر یقینی قدموں کے بعد پریڈ جیسے ردھم میں تبدیل ہو جاتی ہے، راہ داری میں گونج رہی ہے۔ ہم رُک جاتے ہیں۔ وہ

سلیوٹ کرتا ہے۔ میں کھڑا رہتا ہوں، آدھا اٹینشن، آدھا ایٹ ایز۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کسی کو دیکھ نہ رہے ہوں تو اسے سلیوٹ کرنے کی توقع آپ سے نہیں کی جاتی۔ کمرے میں گلاب کے پھول والے ائر فریشنر اور ڈن ہل کے دھوئیں کی مہک پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ کاغذ سرسراتے ہیں، ایک سگریٹ، میز کے آر پار ایک فائل پھینکی جاتی ہے۔

'تمھیں جو کرنا ہے کرو، لیکن میں اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔' میجر کیانی کی آواز بیٹھی ہوئی ہے، جیسا اس کا گلا یہ مخصوص آرڈر دیتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا ہو۔ فائل اُٹھا لی جاتی ہے۔

'میں تم لوگوں کی طرح قصائی نہیں ہوں۔' ایک بے صبر آواز سرگوشی کرتی ہے۔

'اتنے جل ککڑے بننے کی ضرورت نہیں۔' میجر کیانی کہتا ہے۔ ایک کرسی کھینچی جاتی ہے۔ 'میں یہاں اپنے آدمی سے بات کر رہا ہوں۔'

اس کی بات نہ سنو، میں خود سے کہتا ہوں۔ یہ وہی پرانا اچھا سپاہی، بُرا سپاہی والا گند ہے۔ یہ سب ایک ہی کتیا کے بچے ہیں۔

کمرے میں قدم حرکت کرتے ہیں۔ میجر کیانی کے ڈن ہل سگریٹ کا جلتا ہوا کونا ایک لمحے کے لیے میرے چہرے کے قریب آتا ہے، پھر وہ چلا جاتا ہے۔

'بیٹھ جاؤ، پلیز۔' مجھے مخاطب کرنے والی آواز اچھے والے سپاہی کی ہے، لیکن وہ یقینی طور پر میری جانب نہیں دیکھ رہا۔ میں آگے کی جانب بڑھ کر رُک جاتا ہوں۔

'ہمیں اس چیز کو ہٹانے کی ضرورت ہے۔'

میں ساکت کھڑا رہتا ہوں۔ کیا آپ سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ آپ خود اپنی باندھی آنکھوں کی پٹی کھول دیں؟

'پلیز اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دو، مسٹر شگری۔'

میری سامنے بیٹھا ہوا آرمی میجر اپنی خاکی وردی کے دائیں کاندھے پر میڈیکل کور کا نشان لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے ایک گول سُرخ مخملیں بیج پر دو سیاہ سانپ آپس میں

لپٹے ہوئے ہیں اور ان کے منہ آدھے کھلے ہوئے ہیں، جیسے یہ کوئی سینسر شدہ بوسے کا منظر ہو۔ اس کی لمبی سرمئی قلمیں فوجی ہیئر کٹ کے قواعد کے خلاف ہیں۔ وہ ایک پیلی اور سبز فائل کے صفحات کو آہستگی سے اُلٹ رہا ہے، اس کی زبان کی نوک اس کے دانتوں کے نیچے ہے، جیسے اس نے ابھی ابھی یہ دریافت کیا ہو کہ میں کسی ایسی غیر معمولی بیماری میں مبتلا ہوں جو اس سے پہلے کبھی اس کے سامنے نہیں آئی۔

'میں یہاں کام نہیں کرتا۔' وہ اپنا ہاتھ ہلا کر دفتر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اس جگہ چمڑے کی کرسیاں ہیں، ایک میز ہے جس کے اوپر سبز چمڑا مڑھا ہوا ہے اور ایک صوفہ ہے جس کے کور مخملیں ہیں۔ جنرل ضیا کا ایک سرکاری پورٹریٹ دیوار پر سجا ہوا ہے۔ اس تصویر میں اس طرح رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ اس کی کالی سیاہ مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹ گلابی نظر آ رہے ہیں۔ اگر میجر کیانی کی وردی، اس کی نیم پلیٹ کے ساتھ، دیوار پر لٹک نہ رہی ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ ہم کسی بینک منیجر کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔

میں کرسی کے کنارے پر بیٹھ جاتا ہوں۔

'ہمیں کچھ ٹیسٹ کرنے ہیں۔ جو بہت سادہ ہیں۔ پہلے ٹیسٹ میں تمھیں کئی جواب والے سوال دیے جائیں گے۔ بہت زیادہ سوچے بغیر ان میں جو تمھیں ٹھیک لگتا ہے اس پر نشان لگا دو۔ دوسرے حصے میں مَیں تمھیں کچھ تصویریں دکھاؤں گا اور تم انھیں کچھ لفظوں میں بیان کرو گے کہ وہ تصویریں تمھارے لیے کیا معنی رکھتی ہیں۔'

پہلے تو ملک کے لیے میری وفاداری پر شک کیا گیا، اب وہ یہ ڈھونڈنے کے لیے میرے ذہن کے تاریک گوشوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ اس دھرتی پر جو بھی اُتھل پُتھل ہو رہی ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

'اگر آپ ناراض نہ ہوں، سر، تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔۔'

'تم جو چاہے پوچھ سکتے ہو، نوجوان، لیکن یہ ایک معمول کا جائزہ ہے۔ مجھے اسلام آباد سے بھیجا گیا ہے اور مجھے کہا گیا ہے کہ نتائج اپنے ساتھ لاؤں۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے

لیے یہی بہتر ہوگا کہ ان لوگوں کے بجائے میرے ساتھ وقت گزارو جو تمھارے جسم پر کوئی نشان نہ چھوڑنے کی اتنی کوشش کر رہے ہیں۔'

تمام اچھے سپاہیوں کی طرح اس کی بات معقول ہے۔

وہ اسٹیپل کیے ہوئے کاغذات کا ایک پلندا میری طرف بڑھاتا ہے، اس کے اوپر پینسل رکھ دیتا ہے اور اپنی کلائی کی گھڑی اتار لیتا ہے۔

'ان سوالوں کے کوئی درست یا غلط جواب نہیں ہیں۔' وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔'اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ تم تمام ساٹھ سوالوں کے جواب پچیس منٹ میں دے دو۔ اس میں کرنا یہ ہے کہ سوچنا بالکل نہیں ہے۔'

تم چاہو تو پھر سے یہ کہہ لو۔ اگر میں سوچنے والا آدمی نہ ہوتا تو اس وقت بھی پریڈ اسکوائر میں یہاں سے وہاں مارچ کر رہا ہوتا اور میری بھی کوئی عزت ہوتی، اور میں یہاں چتیاپے کے ٹیسٹ پاس کرنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا۔

میں پیپر کی جانب دیکھتا ہوں۔ سر ورق پر صرف لکھا ہے 'ایم ڈی آر ایس، پی۹۳۰۸‘۔

اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ سرورق کی شیٹ کے اندر ہے کیا۔

'ریڈی؟' وہ پوچھتا ہے اور مجھے ایک ہلکی سی حوصلہ افزائی کرتی ہوئی مُسکراہٹ پیش کرتا ہے۔

میں اپنا سر ہلا دیتا ہوں۔

'گو۔' وہ اپنی گھڑی میز پر رکھ دیتا ہے۔

سوال۔۱: آپ اپنی موجودہ دماغی حالت کو کس لفظ میں بیان کرنا پسند کریں گے؟

ا۔غم گین

ب۔ کچھ کچھ غم گین

ج۔خوش

د۔ان تینوں میں سے کوئی نہیں

میرے ابا چھت کے پنکھے سے لٹکے ہوئے پائے گئے تھے۔ بے بی او ایک پورے بلڈی جہاز کے ساتھ غائب ہو چکا ہے۔ میں نے پچھلی رات ایک سویلین نئی خانے میں بند رہ کر گزاری ہیں۔ آئی ایس آئی مجھ سے ان جرائم کی تفتیش کر رہی ہے جو میں نے بالکل بھی نہیں کیے۔ میں نے ابھی ابھی اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی خود اپنے ہاتھوں سے کھولی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

لکھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں دی گئی، بس چھوٹے چھوٹے چوکور خانے بنے ہوئے ہیں، نشان لگانے کے لیے۔

میں نشان لگا دیتا ہوں، کچھ کچھ غم گین۔

اس میں میری روحانی صحت سے مُتعلق بھی سوال ہیں، کچھ کچھ روحانی؛ کبھی خودکشی کا خیال آیا، کبھی نہیں؛ میری جنسی زندگی، گیلا کر دینے والے خواب کبھی کبھار۔ خدا پر یقین؟

کاش انھوں نے یہ کہنے کا بھی آپشن دیا ہوتا کہ 'اے کاش'۔

میں اُس چوکور خانے میں نشان لگا دیتا ہوں جس کے سامنے لکھا ہے 'پکا یقین رکھنے والا'۔

جب تک میں اس سوال تک پہنچتا ہوں جو اس بارے میں ہے کہ اگر میرے دوست کی بلّی دریا میں ڈوب رہی ہو تو کیا میں اسے بچاؤں گا یا خود سے یہ کہہ لوں گا کہ بلیاں تیر سکتی ہیں، میں ٹیسٹ کا لطف لینے لگتا ہوں اور میری پینسل کسی ایسے شخص کے جوش وجذبے کے ساتھ چوکور خانوں میں نشانات لگانے لگتی ہے جو خود اپنی فہم وفراست کا جشن منا رہا ہو۔

اچھا سپاہی میز پر سے اپنی گھڑی اُٹھاتا ہے اور مجھے داد دیتی ہوئی مُسکراہٹ سے نوازتا ہے۔ وہ خود چاہتا ہے کہ میں اچھی کارکردگی دکھاؤں۔

وہاں منشیات سے مُتعلق وہ ناگزیر سوال بھی موجود ہے۔ اس میں آپ کے پاس یہ کہنے کا آپشن بھی نہیں کہ 'صرف ایک مرتبہ'۔ اس میں یہ بھی نہیں پوچھا گیا کہ کیا آپ کو اس تجربے میں مزہ آیا۔

کبھی نہیں، میں نشان لگاتا ہوں۔

بینن کے کمرے سے دوڑ کر واپس آتے ہوئے میں نے شہداء ایونیو سے آنے کے بجائے ایک جنگلے پر سے چھلانگ لگائی اور ان جھاڑیوں میں چلنا شروع کر دیا جو پریڈ اسکوائر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ نجانے کہاں سے ایک جگنو نکلا اور میرے سامنے پرواز کرنے لگا جیسے کہ وہ راستے پر میری رہ نمائی کر رہا ہو۔ جنگلا ایک ٹھیک ٹھاک بنی ہوئی دیوار کی طرح پریڈ اسکوائر کے ساتھ ساتھ چلتا گیا تھا اور اس کے کانٹے بہت تیز تھے۔ میرے بوٹوں کے نیچے گھاس صبح سویرے پڑنے والی شبنم کی وجہ سے نم تھی۔ میں بہت شدت سے سوچ رہا تھا، جیسے کہ آپ اُس وقت سوچتے ہیں جب آپ کا خون چترالی حشیش کو جذب کرتا ہے اور پھر دور دراز کے فوری نوعیت کے پیغامات لیے آپ کے دماغ کا رُخ کرتا ہے، اور ہر قسم کے شکوک وشبہات دور کر دیتا ہے اور آپ کے چھوٹے موٹے ردِعمل کو ہر طرح سے تیار منصوبوں کی شکل دے دیتا ہے۔ جو پیغامات میں وصول کر رہا تھا وہ اتنے صاف اور واضح تھے کہ میں نے یہ جاننے کے لیے جنگلے کو لات ماری کہ کیا یہ سب خواب تو نہیں۔ جنگلا روشن ہو گیا اور ہزاروں جگنو خوابِ غفلت سے جاگ اُٹھے اور انھوں نے رات پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ بہت اچھے، میں نے کہا؛ جاگ اُٹھنے اور روشنی پھیلانے کا وقت آ گیا ہے۔

منشیات کے خلاف جنگ کے موضوع پر ریڈرز ڈائجسٹ کے خصوصی شمارے کے مطابق اب تک کوئی سائنس دان انسانی دماغ پر منشیات کے اثرات کا تعیّن کرنے میں کام یاب نہیں ہو سکا۔ اور جہاں تک چترالی حشیش کی بات ہے تو انھیں تو یہ اپنی لیبارٹری کے چوہوں کے پاس بھی نہیں چھوڑنی چاہیے۔

میں نے جو دیکھا وہ یہ تھا: پریڈ اسکوائر کے کونے پر ڈائس پر موجود ایک پول پر، جس پر پاکستانی پرچم لہراتا ہے، ایک سایہ لہرا رہا ہے۔ ایک آدمی ڈائس پر چڑھا، اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر آہستگی سے پول پر سے پرچم کو کھول لیا جو رات کی وجہ سے باندھ دیا گیا تھا۔

میرے ذہن میں وہ پرچم گھوم گیا جو میرے ڈیڈ کے تابوت کے گرد لپیٹا گیا تھا۔ میں اپنے دماغ میں نمازِ جنازہ کی صدائیں سن سکتا تھا جو اونچی، اور اونچی ہوتی جاتی تھیں۔ تابوت کھلا اور پرچم کے ستارہ و ہلال کے درمیان میں نے اپنے ڈیڈ کا چہرہ دیکھا جو بدمزگی کا تاثر لیے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

ایک شگری کو کیا کرنا چاہیے؟

میں نے اپنے ہی احکامات کی تعمیل کی۔ میں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل لیٹ گیا اور اپنے ہدف کا نشانہ باندھ لیا۔ کئی برس تک ممنوع قرار دیے گئے شارٹ کٹ استعمال کرنے اور رات دیر سے لگنے والی فلمیں دیکھنے کے لیے اکیڈمی کی دیواریں پھلانگتے رہنے نے مجھے اس لمحے کے لیے تیار کیا ہوا تھا۔ میں جنگلے کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا۔

کوئی بیمار ذہنیت والا احمق ہمارا پرچم چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی حرامی میرے ڈیڈ کا کفن چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس واضح ذہنی کے ساتھ سوچ رہا تھا جو صرف چترالی حشیش ہی عطا کر سکتی ہے۔ میں اپنے گھٹنوں اور کہنیوں پر گھسٹتا ہوا چلنے لگا، کسی ایسے شخص کی طرح جس نے اپنے ملک کا وقار اور اپنے باپ کے میڈلوں کو بچانے کا عزم کر رکھا ہو۔ جگنو اب میرے سر کے اردگرد منڈلانے لگے۔ نم آلود گھاس پھونس میرے بوٹوں اور میری وردی کی شرٹ کے اندر راستہ بنانے لگی، لیکن میری آنکھیں اُس چور پر مرکوز تھیں جو اب ڈائس پر رینگ رہا تھا اور اُس رسّی میں بندھے پرچم کو نکالنے کی جدوجہد

کر رہا تھا جس کی مدد سے پرچم کو لہرایا جاتا تھا۔ لگتا تھا اُسے کوئی جلدی نہیں، لیکن میں نے اس عزم کے ساتھ اپنے گھسٹنے کی رفتار تیز کر دی کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لوں گا۔ گھاس میں کہیں گہرا دبا ہوا ایک کانٹا میری کہنی کے عقب میں پیوست ہو گیا۔ مجھے تھوڑی سی چبھن اور اس کے بعد آستین پر نمی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے گھسٹنے کی رفتار کم نہ کی۔

جب میں ڈائس کے قریب پہنچا تو میں نے جنگلے کو پھلانگ لیا اور اس سے پہلے کہ چور مجھے دیکھ سکتا میں اس پر کود کر اسے زمین سے پیوست کر چکا تھا۔

'تم مجھ جیسے بڈھے سے کشتی کیوں لڑ رہے ہو؟' انکل سٹارچی کی آواز بہت پُرسکون تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے اپنے گدّے کے سوراخ میں کچھ ڈالتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ آج سے اس شے کا دوبارہ کش نہیں لگانا، میں نے خود سے وعدہ کیا۔

'میں سوچ رہا تھا کہ کوئی شخص پرچم کے ساتھ گند کر رہا ہے۔' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

'اس کے ساتھ پہلے ہی گند ہو چکی ہے، میں اسے دھونے کے لیے لے جا رہا تھا۔' اس نے کہا اور ڈائس پر کوئی شے تلاش کرنے لگا جیسے اس سے کچھ گر گیا ہو۔ اس کا ہاتھ اپنی قمیص میں غائب ہوا، کچھ دیر وہاں کچھ ٹٹولتا رہا اور پھر ایک چھوٹی سی، پٹ سن کی بنی خالی بوری کو لیے نمودار ہوا۔

'تم بے وقوفی کر رہے تھے، بیٹے۔ کیا خیال ہے تمھارا تم جا کہاں رہے ہو؟'، اس نے افراتفری میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے بات کر رہا ہو۔ میں خود کو احمق محسوس کر رہا تھا لیکن میں کہیں جا تو نہیں رہا تھا، اس لیے میں وہیں کھڑا رہا اور اس کی نظر کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل لیٹ گیا اور اپنا چہرہ ڈائس کے قریب کر لیا اور پھر اس نے اپنی کہنیوں کے بل چلنا شروع کر دیا جیسے اس کا بے وقوف بیٹا کوئی کیچوا رہا ہو۔

انکل سٹارچی میں کسی عمر بھر کے نشئی کا سا آہستہ گام وقار تھا۔ وہ اتنی پھرتی اور

اپنے مقصد پر ایسے کامل یقین کے ساتھ حرکت کر رہا تھا کہ میں یہ جانے بغیر اس کی تلاش میں شامل ہو گیا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ڈائس سے رینگ کر نیچے اترا اور اس نے ڈائس اور پریڈ اسکوائر کے کنارے کے درمیان چھوٹی چھوٹی گھاس پر کوئی شے ڈھونڈ نکالی؛ اپنے ہاتھ کے گرد پرچم لپیٹ کر وہ اس کی جانب لپکا۔ میں ایک سیکنڈ کے مختصر ترین حصے میں اسے دیکھ سکا کہ وہ شے گھومی، اس نے اپنا گہرا سبز سر اُٹھایا اور اس کی زیبرے جیسی پٹیاں اس کی طوالت کے گرد چکر کھا گئیں۔ پھر اس شے نے چکّر دار سیڑھیوں کی طرح خود کو گھما لیا۔ انکل نے اس شے کو اس کی دُم سے پکڑا تھا اور اب اس کے سر کی پشت کو اپنی شہادت کی انگلی سے یوں سہلا رہا تھا جیسے وہ کسی نایاب ہیرے کو پیار کر رہا ہو۔ کریت[1] کا سر خود اُس کے اپنے ہی جسم پر ڈھے گیا اور انکل نے اسے پرچم میں بند کر دیا اور پھر اسے اپنی دو انگلیوں میں پکڑ کر اپنے جسم سے ایک فاصلے پر اُٹھا لیا۔

میں تو یہی سوچتا کہ میں کسی واہمے کے زیرِاثر ہوں اگر انکل سٹارچی خود ہی وضاحت نہ کرنے لگتا۔ 'اس ملک میں کچھ بھی خالص نہیں، نہ حشیش، نہ ہیروئن، لال مرچیں بھی نہیں۔'

میں نے سوچا کہ آج انکل سٹارچی ان میں سے کس شے کے نشے میں ہے۔

'یہ فطرت کا شہد ہے۔' اس نے لپیٹا ہوا پرچم میری آنکھوں کے سامنے گھمایا۔ لگتا تھا کہ سانپ سو گیا ہے۔ پرچم پر مڑے تڑے ستارہ و ہلال ساکت تھے۔

'انکل، آپ کو کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے۔' میں نے اپنی انگلی اپنے ماتھے پر رکھی اور اسے ایک دائرے میں گھمایا۔ 'لگتا ہے آپ پھر سے پیٹرول کا نشہ کرنے لگے ہیں۔'

'اس کی بدبُو تو بہت خوف ناک ہوتی ہے اور آپ کی زبان ایسا محسوس کرتی ہے جیسے وہ مردہ گوشت کا کوئی ٹکڑا بن گئی ہو۔ بیہودہ۔' اس نے بے مزگی سے تھوک دیا۔

[1] کریت (Krait): جنس بنگارس کا زہریلا سانپ جو مشرقی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔

'اور یہ؟' میں نے اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی چیز کی جانب اشارہ کیا۔ 'یہ حرامی بہت تیز لگتا ہے۔ آپ کو مار بھی سکتا ہے۔'

انکل کے لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ اُبھر آئی، اُس نے اپنے ہاتھ سے اپنے لپٹے ہوئے پرچم کو ذرا سا چھوا اور پھر کسی چیز کو اپنی دو انگلیوں میں پکڑ لیا۔ اس نے نرمی سے اسے باہر نکالا اور میں نے اس چھوٹے سے حیوان کا خوب صورت سر اچھی طرح ملاحظہ کیا، اس کی آنکھیں دو چھوٹے چھوٹے زمرّد تھے، اس کا مُنھ کھلا تو اس کے فرش پر ایک دھندلا، پٹی دار ڈیزائن نمودار ہو گیا؛ اس کی دو شاخی زبان اِدھر اُدھر غصیلی ضربیں لگا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں یہ سوچتا کہ انکل ستارجی کے ذہن میں کیا ہے، اس نے اپنی قمیص کے بٹن کھولے، اپنا کاندھا ننگا کیا اور کریت کا سر اس سے ایک ضرب کے فاصلے پر کر دیا۔ اس کی زبان انکل ستارجی کے کاندھے کی جانب لپکی۔ انکل نے اپنا ہاتھ تیزی سے پیچھے کیا، انکل کا سر سلوموشن میں بائیں جانب جھکا اور تقریباً اس کے کاندھے پر گر گیا، اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور اس کے مُنھ سے ایک آہ سی نکل گئی۔ پھر اس کی آنکھیں آہستگی سے کھل گئیں۔ وہ اتنی الرٹ تھیں جیسے نگرانی پر مامور دو سپاہی۔ اس کا ماتھا جو عموماً شکنوں کے جال سے بھرا ہوتا، پرسکون تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا سایہ بھی طویل ہو گیا ہے کہ وہ پریڈ اسکوائر کی پوری طوالت میں پھیلا ہوا تھا۔

اس نے پرچم کو ایک سخت گٹھان کے ذریعے باندھا، اسے پٹ سن کی بوری میں بند کیا، اور اب جب کہ وہ اپنا قیدی واپس حاصل کر چکا تھا، میری جانب ایسے دیکھا جیسے وہ اپنی پرفارمنس پر کوئی تبصرہ چاہ رہا ہو۔

'یہ تمھیں مار بھی سکتا ہے۔' میں نے کہا اور میری آواز میں اس کے تحفظ کا احساس تھا۔

'صرف تب جب میں لالچ میں آ جاؤں۔' اس نے کہا اور پھر بعد میں آنے والے ایک خیال کے تحت اضافہ کیا، 'یا اگر اس سے کسی کو ڈسوا لیا جائے۔'

'کیا؟'

'اگر اسے خالص شکل میں لیا جائے تو یہ ایک دوا بھی ہے۔ اگر اسے کسی دھات کے ساتھ ملا دیا جائے تو یہ زہر بن جاتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس کریں کہ جیسے آپ نشے میں ہیں، لیکن بالآخر یہ آپ کو مار دے گی۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ اس کی ایک بوند کسی چاقو کی نوک پر رکھو، پھر کسی ہاتھی کی جلد پر اس سے خراش ڈالو اور ہاتھی دھڑام سے گر کر مر جائے گا۔ ہاں ہاتھی ہو سکتا ہے کہ پہلے ذرا سا جھوم کر دکھائے۔ یا ہاتھی شاید یہ سوچے کہ اس کے پر نکل آئے ہیں۔ ہاتھی شاید اپنے پیر بھی گھسیٹتا رہے کچھ دیر۔ لیکن ہاتھی بھی بالآخر دھڑام سے گرے گا اور مر جائے گا۔'

شفاف بادل کے اندر سے چاند دکھائی دیا اور چاچے کا سایہ خود اس کے قد جتنا محدود ہو گیا جیسے کہ اسے کسی ایسے سائز میں تہہ کیا جا رہا ہو جسے سنبھالا جا سکے۔

'ایک خوراک کے کتنے ہوئے؟' میں نے اپنی خالی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا، اور مجھے پتا تھا کہ چاچا کلف اپنے اوزاروں کی کوئی قیمت نہیں لیتا تھا۔

'آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں، سر؟ منشیات فروش؟' وہ ایک بار پھر اپنی بڑبڑاتی ہوئی شخصیت میں واپس آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی بھی بجھنے لگی تھی۔

'مجھے کچھ گھریلو کام نبٹانے ہیں۔' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

'اس کے ہاں ختم ہو گئی ہے۔' اس نے اپنی پٹ سن کی بوری کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ 'آپ کی ضرورت پوری کرنے میں اسے ایک ہفتہ اور لگے گا۔'

ساتویں روز میں نے تازہ کلف لگی ہوئی وردیوں کا بنڈل کھولا جو انکل ستارجی میرے بستر پر چھوڑ گیا تھا اور اس میں سے انگلی کے سائز کی ایک شیشی باہر نکل آئی جس کے پیندے سے پتھرائے ہوئے مائع گوند کی کچھ بوندیں چپکی ہوئی تھیں۔

مجھے چائے پیش کی جاتی ہے، شاید مقررہ پچیس منٹوں سے دو منٹ قبل ہی پہلا ٹیسٹ مکمل کر لینے کے انعام کے طور پر۔ مجھے چائے سے نفرت ہے، لیکن یہ گرم مشروب

میرے حلق کے عقب کو سکون پہنچاتا ہے اور ایک لمحے کے لیے وہ بو بھی جل کر ختم ہو جاتی ہے جو میرے تالو پر جمی رہ گئی تھی۔

دوسری ٹیسٹ میں کوئی سوال نہیں، صرف تصویریں ہیں۔ تصویریں بھی باقاعدہ نہیں بلکہ کسی جنونی چوتیے نے زندگی کے لایعنی سے روپ بنائے ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر کوئی یہ بھی نہ بتا سکے کہ یہ ایمیبا ہے یا بھارت کے کسی فوجی اڈے کا کوئی نقشہ۔

محتاط رہو، میں خود سے کہتا ہوں۔ میں اپنے چائے کے کپ پر جھک جاتا ہوں۔ یہ ہے وہ اصل امتحان جس کے ذریعے یہ لوگ کسی احمق اور میرے جیسے تقریباً قسم کے جینئس میں فرق کر سکتے ہیں۔

پہلی تصویر، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ، کسی لومڑی کے کٹے ہوئے سر کی ہے۔

'جھیل۔ شاید برمودا مثلث۔' میں کہتا ہوں۔

برمودا مثلث کے اوپر غائب ہو جانے والے طیاروں کے بارے میں ہر تیسرے مہینے ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک مضمون چھپتا ہے۔ سب سے زیادہ عاقلانہ جواب یہی ہوتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر میرے جواب خود بھی لکھ رہا ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ جتنا کچھ میں بتا رہا ہوں، وہ اس سے بہت زیادہ لکھ رہا ہے۔

دوسری تصویر میں ایک بہت بڑی چمگادڑ الٹی لٹک رہی ہے۔

'بو ٹائی۔'

'کچھ اور آتا ہے تمھارے دماغ میں؟' وہ پوچھتا ہے۔

'ایک گلابی اور سیاہ بو ٹائی۔ ایک بہت بڑی بو ٹائی۔'

مجھے دو عضو دکھائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے پر حملہ آور ہیں۔

'فوجی بوٹ۔' میں کہتا ہوں۔ 'فوجی بوٹ آسان باش پوزیشن میں۔'

ایک آدمی کھمبی جیسے ایک بادل کے درمیان اکڑوں بیٹھا ہے۔

'طوفان۔ یا شاید کوئی زیرِ زمین آب دوز۔'

خون کی پیاسی چڑیلیں کشتی لڑ رہی ہیں۔

'گھوڑے کی نعل۔'

سور کے بچوں کی ایک جوڑی مجھے گھور رہی ہے۔

'آئینے میں یوڈا[1] نظر آ رہا ہے۔'

آخری تصویر اتنی واضح ہے جتنی واضح ان بیمار قسم کی تصویروں کو بنانے والا بنا سکتا تھا: گلابی برف کے ایک بلاک پر خصیوں کی ایک جوڑی رکھی ہے۔

'آم۔' میں کہتا ہوں۔ 'یا کوئی پھل۔ شاید برف پر رکھا ہوا۔'

میں بیٹھ کر اپنے چائے کے خالی کپ کو گھورتا ہوں جب کہ اس دوران ڈاکٹر اپنے نوٹ پیڈ پر تیزی سے اپنے آخری مشاہدات قلم بند کرتا ہے۔

وہ یقینی طور پر جلدی میں ہے۔ وہ اپنی تصویریں، کاغذات، پینسل بریف کیس میں پھینکتا ہے، میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے، 'گڈ لک، نوجوان' اور ایک ہی پل میں دروازے پر کھڑا اپنی بیرٹ ٹوپی درست کرتا نظر آتا ہے؛ یہ ٹوپی میڈیکل کور کی ایک اور نشانی ہے، اس پر سانپوں کی ایک اور جوڑی بنی ہوئی ہے جس کی زبانیں باہر ہیں۔

'سر، آپ کو بھیجا کیوں گیا تھا؟'

'یاد رکھو، نوجوان، ہمارا موٹو ہے مارو یا مر جاؤ۔ لیکن پوچھو مت۔۔۔'

'سر میڈیکل کور کا موٹو تو ہے 'انسانیت کی خدمت کرنا بغیر کسی۔۔'

'دیکھو، نوجوان، مجھے اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنی ہے۔ وہ فوری طور پر رزلٹ مانگ رہے ہیں۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا تمھیں پتا بھی ہے کہ تم کیا کرتے پھر رہے تھے۔ پتا ہے کیا تمھیں؟'

'میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔'

[1] یوڈا: اسٹار وارز فلموں کا مشہور عجیب الخلقت کردار

'میرے سوال نامے میں اس جواب کی گنجائش نہیں، اس لیے میں اسے اپنی جائزہ رپورٹ میں شامل نہیں کر سکتا۔ تم انھیں خود بتا دینا۔

وہ اس سپاہی کو اشارہ کرتا ہے جو مجھے غسل خانے سے یہاں لایا تھا اور جو اچانک راہ داری میں نمودار ہو گیا ہے۔

'گڈ لک۔ لگتا ہے تم ایک اچھی فیملی سے ہو۔'

سپاہی میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا۔ وہ مجھے چلاتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے آتا ہے جو شکل وصورت سے اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ کوئی عقوبت خانہ دکھائی دے۔ نائی کی ایک کرسی کے بازوؤں سے ربڑ کی پٹیاں بندھی ہیں جو ناقص سے بجلی کے آلات سے جوڑ دی گئی ہیں۔ ایک میز پر ڈنڈوں، چمڑے کے کوڑوں اور درانتیوں کا ذخیرہ لال مرچوں کے شیشے والے جار کے ساتھ پڑا ہے۔ ایک دیوار پر ہُک کے ساتھ نائیلون کی رسیاں لٹک رہی تھیں اور چھت پر دھاتی زنجیروں کے ساتھ پرانے ٹائروں کی ایک جوڑی لٹک رہی ہے، شاید قیدیوں کو اُلٹا لٹکانے کے لیے۔ ان چیزوں میں واحد نیا آئٹم فلپس کی استری ہے، جس کا پلگ اترا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس عقوبت خانے سے لانڈری روم کا کام بھی لیا جاتا ہوگا۔ یہ تمام چیزیں لگتا ہے کہ سجائی گئی ہیں، کچھ کچھ کسی تھیٹر کے متروک سیٹ کی طرح۔ لیکن پھر میں چھت پر دیکھتا ہوں، مجھے خشک لہو کے چھینٹے نظر آتے ہیں اور پھر اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہاں موجود تمام تر چیزیں کام میں لائی جا چکی ہیں۔ میں اب تک اندازہ نہیں لگا پایا کہ یہ لوگ کسی کے لہو کے چھینٹے چھت پر پھینکنے میں آخر کس طرح کام یاب ہوئے ہوں گے۔

'سر، پلیز اپنی وردی اتار دیں۔' سپاہی مجھ سے بڑی عزت سے کہتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اب یہی بات پتا چلنے والی ہے۔

'کیوں؟' میں خود میں کچھ افسرانہ قسم کا وقار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

'میں یہ بات یقینی بنانا چاہتا ہوں کہ آپ کے جسم پر کوئی نشان تو نہیں ہے۔'

میں آہستگی سے اپنی شرٹ اتار دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے شرٹ لے کر اُسے ایک ہینگر پر لٹکا دیتا ہے۔ میرے بوٹ بھی ایک طرف رکھ دیے جاتے ہیں۔ وہ میری پتلون بڑی احتیاط سے تہہ کرتا ہے۔ میں اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہوں، اور اسے چیلنج کرتا ہوں کہ آئے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر ڈالے۔ وہ میرے انڈر ویئر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

میں حکم بجا لاتا ہوں۔

وہ میرے اردگرد چکر لگاتا ہے۔ میں سیدھا کھڑا ہو جاتا ہوں، میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں، نہ کسی چیز سے کھیل رہے ہیں نہ کہیں خارش کر رہے ہیں۔ اگر وہ مجھے ننگا دیکھنا چاہتا ہے تو اسے کسی ہیجڑے کو دیکھنے کا اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔

میں تفتیش شروع ہونے کا منتظر ہوں لیکن لگتا ہے کہ اس کے پاس کوئی سوال نہیں۔

'سر، پلیز ایک کونے میں کھڑے ہو جائیں اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔' وہ کمرے سے نکلنے سے پہلے استری کا پلگ ساکٹ میں لگا دیتا ہے۔

تشدد کرنے والے پیشہ ور بھی کبھی کبھار اپنا کام معرضِ التوا میں ڈال سکتے ہیں، میں خود سے کہتا ہوں۔

یا شاید یہاں اپنی مدد آپ قسم کا کوئی ٹارچر سسٹم ہے؛ کہ آپ کو یہاں بس کھڑا رہ کر ان آلات کو دیکھنا ہوتا ہے اور سوچنا ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے مختلف حصے ان کے تشدد پر کیسا ردِعمل دیں گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ استری پر جلنے والی بتی کی طرف نہ دیکھوں۔ میجر کیانی نے کہا تو تھا کہ نشان نہیں پڑنا چاہیے۔

وہ ایک پیلی ہری فائل اور میرے خاندان میں ایک نئی نئی دلچسپی کے ساتھ واپس آتا ہے۔

'کیا تم مرحوم کرنل شگری کے رشتے دار ہو؟'

میں ایک لمبی سانس بھرتا ہوں اور اثبات میں سر ہلاتا ہوں۔

'میں ان کی تدفین میں آیا تھا۔ میں شاید آپ کو یاد نہیں۔'

میں اس کے ارادوں کا کچھ پتا لگانے کے لیے اس کے چہرے کو کھوجتا ہوں۔

'مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے، سر۔ میں صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں۔'

میں اپنا سر ایک مرتبہ پھر اثبات میں ہلاتا ہوں جیسے میں نے پہلے ہی سے اسے معاف کر دیا ہو۔ وہ ایک ایسا شخص لگتا ہے جو مدد تو کرنا چاہتا ہو لیکن یہ بھی چاہتا ہو کہ اسے غلط نہ سمجھ لیا جائے۔

'آپ کو پتا ہے کہ یہ جگہ اُنھوں نے ہی بنائی تھی۔ دو ہفتے کے نوٹس پر۔ میں کنسٹرکشن سپروائزر تھا۔'

'میرا تو خیال تھا کہ یہ جگہ مغلوں نے بنائی ہے۔'

اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر بات چیت کے لیے ایک عقوبت خانہ کوئی مناسب مقام نہیں۔

'نہیں، سر، یہ توسیع، یہ دفاتر، یہ بیرکیں اور زیرِ زمین یہ سب چیزیں۔ ان کی تعمیر کا حکم اُنھی نے دیا تھا۔'

'اچھا کام کیا ہے، ڈیڈ۔

اس کے ہاتھ میں موجود فائل پر لکھا ہے 'کانفیڈنشل' اور اس پر میرا پاک فضائیہ کا نمبر لکھا ہے۔ پتا نہیں اس میں میرے بارے میں کیا لکھا ہوگا۔ اور عبید کے بارے میں؟ ہمارے بارے میں؟

'کیا انھوں نے اس کی تعمیر کا بھی حکم دیا تھا؟ کیا وہ لوگوں پر۔۔۔؟' میں نے اپنا ہاتھ نائی کی کرسی اور چھت سے لٹکتی ہوئی زنجیروں کی طرف لہرایا۔

'کرنل صاحب صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔' وہ فائل بند کر لیتا ہے اور اپنے بندھے ہوئے بازوؤں کے نیچے فائل کو سینے سے لگا لیتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ابا

جنرل ضیا کے لیے افغانستان کی چھاپا مار جنگ کے لاجسٹکس چلا رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جنگ کے لیے پیسہ دینے والے امریکیوں اور آئی ایس آئی میں رابطے کا کام کر رہے تھے، جو ان فنڈز کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کی ذمہ دار تھی۔ لیکن انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ ان کی ڈیوٹی میں ایسی سہولیات کی تعمیر اور انتظام بھی شامل ہے۔

'ہم سب اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہیں۔' میں سرگوشی کرتا ہوں اور نائی کی کرسی کے ساتھ پڑی میز کی جانب لپکتا ہوں جہاں سے میں درانتی اُٹھاتا ہوں اور اپنی گردن پر رکھ لیتا ہوں۔ دھات ٹھنڈی ہے لیکن یہ نہیں لگتا تھا کہ اس سے کوئی چیز کاٹی جا سکتی ہے۔

'ہلنا مت۔ اگر تم ہلے تو تمھیں میرے جسم پر بہت سے نشان ملیں گے۔'

وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھول لیتا ہے، اسے اب بھی یقین نہیں کہ میں اُس سے چاہتا کیا ہوں۔

'مجھے یہ فائل دے دو۔'

وہ ایک ہاتھ سے فائل مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اپنا بازو میری طرف بڑھاتا ہے۔

'سر، بے وقوفی مت کریں۔'

'پانچ منٹ کے لیے۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔' میری آواز میں موجود دھمکی پر میرا پُرتیقن دلاسا حاوی آ جاتا ہے۔

وہ ہچکچاتے ہوئے میری طرف بڑھتا ہے اور فائل کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے ایک جانب رکھے رہتا ہے۔ شاید ننگے قیدیوں کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کا اُس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

'میرے ابا نے تمھارے لیے جو کچھ کیا، اس کے بدلے میں تم کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہو،' میں اس سے اصرار کرتا ہوں۔

مجھے کچھ پتا نہیں کہ ابا نے اس کے لیے کیا کیا ہوگا۔ لیکن اس نے کہا تو تھا کہ اس نے اُن کی تدفین میں شرکت کی تھی۔

'پانچ منٹ۔' وہ دروازے کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے گال پر آدھے چاند جیسے ایک داغ کو کھجاتا ہے جو اچانک سرخ ہو گیا ہے۔

میں پوری توانائی کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتا ہوں اور اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتا ہوں، اور اپنے پرامن ارادوں کی نشانی کے طور پر اپنی درانتی اسے پیش کرتا ہوں۔

وہ ایک ہاتھ سے درانتی لیتا ہے اور مجھے فائل تھما دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔

ابتدائی رپورٹ از میجر کیانی۔۔۔

میں سرورق کو پلٹتا ہوں۔ پہلی رپورٹ میرا اپنا بیان ہے۔ میں صفحہ پلٹتا ہوں اور کوئی چیز نیچے گر جاتی ہے۔ میں فرش پر سے ایک پولارونڈ تصویر اُٹھا لیتا ہوں۔ تصویر بہت دھندلی ہے؛ جہاز کا ایک تڑا مڑا پنکھا، پچکی ہوئی کنوپی، ڈھانچے سے ٹوٹا ہوا ایک پر۔ یہ سب ایک گر کر تباہ ہونے والے ایم ایف سترہ طیارے کے علاوہ ہے۔ تصویر کے نیچے ایک تاریخ بھی لکھی ہے؛ یہ وہ تاریخ ہے جب عُبید چھٹی لیے بغیر غائب ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں ایک لمحے کے لیے دھندلا جاتی ہیں۔ میں تصویر پھر سے فائل میں رکھ دیتا ہوں۔ ایک اور فارم، ایک اور بیان جس پر بینن کے دست خط ہیں۔ 'پیپر پر دفائل: انڈر آفیسر شگری۔' جب تک میں کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنوں 'زبردست افسر،' 'میرا ذاتی نقصان' اور 'خفیہ قسم کا رویہ' جیسے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے چمک جاتے ہیں۔

'بعد میں سہی۔' سپاہی کہتا ہے۔ وہ میرے ہاتھ سے فائل چھین لیتا ہے اور اس سے پہلے کہ میں اس کی اگلی حرکت کا اندازہ لگا پاؤں، مجھے میری کمر سے پکڑ کر اُٹھاتا ہے، میرا سر ٹائر کے اندر ڈالتا ہے اور ایک دھاتی زنجیر کھینچ لیتا ہے۔ میں خود کو فرش اور چھت کے درمیان لٹکتے ہوئے پاتا ہوں۔

میجر کیانی کی آواز بیٹھی ہوئی ہے اور وہ مجھے ہوا میں آرام سے جھولتے ہوئے دیکھ کر، جب کہ میرا دھڑ ٹائر پر توازن سے دھرا ہے، خوش نہیں ہوتا۔

'میں نے کہا تھا نشان نہیں پڑنا چاہیے۔' میجر کیانی ایک دائرے کی صورت میرے نیچے سے گزرتا ہے۔ ڈن ہل کا دھواں میرے نتھنوں میں آ گھستا ہے اور میں اسے بڑی بے چینی سے اپنی سانسوں میں بھرتا ہوں۔ 'میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہاں پکنک منانا شروع کر دو۔'

پھر وہ فلپس کی استری اُٹھاتا ہے اور میرے سر کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے جیل لگے بال اور گھنے ابرو میرے چہرے کے برابر ہیں۔ وہ استری کا کونا میرے بائیں ابرو کے قریب لاتا ہے۔ میری آنکھیں گھبراہٹ میں سختی سے بند ہو جاتی ہیں۔ مجھے جلتے ہوئے بالوں کی بُو آتی ہے اور میں ایک جھٹکے سے اپنا سر پیچھے ہٹا لیتا ہوں۔

'نارزن، لوگ تمھارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان کی نیک خواہشات ختم ہو جائیں، بہتر ہے کہ تم کچھ بتانا شروع کر دو۔ اس استری کی مدد سے تمھارے منھ سے سچ اگلوانے میں مجھے ایک منٹ بھی نہ لگے، لیکن پھر تم کسی اور کے سامنے کپڑے اُتارنے کی کبھی خواہش نہیں کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کبھی نہیں چاہو گے۔'

پھر وہ ایک اور سپاہی کی طرف مُڑتا ہے جو اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آیا تھا۔

'اسے کچھ کپڑے پہناؤ اور اسے وی آئی پی روم میں لے چلو۔'

۱۲

رول کیے ہوئے اخبار کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے خاتونِ اوّل آرمی ہاؤس کے لان میں چلتی جا رہی تھی، اس نے مالی کو نظرانداز کر دیا تھا جس نے گلاب کے ایک پودے کی جڑوں سے سر اُٹھایا تھا اور اپنا مٹی سے بھرا ہوا ہاتھ اپنے ماتھے تک لے جا کر اسے سلام کیا تھا۔ جب وہ آرمی ہاؤس کے مرکزی گیٹ تک پہنچی تو ڈیوٹی گارڈ اپنے کیبن سے باہر نکل آئے، گیٹ کھولا اور اس کے پیچھے چلنے کو ہوئے۔ اس نے اوپر دیکھے بغیر ہاتھ میں پکڑے اخبار سے گارڈز کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی پوسٹ پر ہی ٹھہرے رہیں۔ انھوں نے سلیوٹ کیا اور اپنے کیبن میں واپس آ گئے۔ گارڈ سیکیورٹی کوڈ ریڈ کے اسٹینڈرڈ پروسیجر پر عمل کر رہے تھے جس میں خاتونِ اوّل کی نقل و حرکت کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

اسے یاد نہیں تھا کہ وہ آخری مرتبہ کب اس گیٹ میں سے چلتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک منی کانوائے کے ساتھ باہر نکلتی جس میں دو آؤٹ رائیڈر ہوتے، پھر اس کی اپنی سیادہ مرسیڈیز بینز گاڑی ہوتی اور اس کے پیچھے مسلّح کمانڈوز سے بھری کھلے چھت والی جیپ ہوتی۔ اس کے پیروں کے نیچے سڑک کسی متروک رن وے کی طرح صاف اور نہ ختم ہونے والی تھی۔ اس نے ان قدیم درختوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جو سڑک کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ سفیدی پھرے ہوئے تنوں اور اونگھتی ہوئی چڑیوں سے بھری شاخوں

کے ساتھ یہ درخت بھوتوں کی کسی کہانی کا پس منظر ہو سکتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی جب اسے آرمی ہاؤس سے ملحقہ کیمپ آفس کے داخلی دروازے پر، جہاں اس کا شوہر صدر صدر کھیل رہا تھا، کسی نے نہیں روکا۔

'بلڈی عورت بلڈی قطار میں لگو،' ایک آواز اُس پر چلّائی، اور اس نے خود کو عورتوں کی ایک طویل قطار کے آخر میں کھڑے پایا، بوڑھی یا درمیانی عمر کی خواتین جنھوں نے سفید دوپٹے لیے ہوئے تھے۔ وہ ان کے چہرے دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ غریب عورتیں تھیں لیکن انھوں نے اس موقع کی مناسبت سے لباس پہن کر آنے کی پوری سعی کی تھی۔ ان کے سوتی شلوار قمیص کے جوڑے صاف ستھرے اور استری شدہ تھے؛ کچھ نے اپنے گالوں اور گردنوں پر ٹالکم پاؤڈر بھی مل رکھا تھا۔ اس نے ان کی انگلیوں پر سُرخ نیل پالش کے کم از کم دو شیڈ بھی دیکھے۔ خاتونِ اوّل قطار کے دوسرے کنارے پر اپنے شوہر کو دیکھ سکتی تھی؛ اس کے دانت لشک رہے تھے، مونچھ ٹیلے وژن کیمرا کی خاطر چھوٹا سا رقص کر رہی تھی، اس کے بالوں پر بیچ کی مانگ سورج کی روشنی کے نیچے چمک رہی تھی۔

وہ ان میں سفید لفافے تقسیم کر رہا تھا اور لفافے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے وہ ان عورتوں کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتا، جیسے وہ سخت مجبوری میں خیرات وصول کرنے والی عورتیں نہیں بلکہ صبح کی اسمبلی میں کھڑی اسکول کی بچّیاں ہوں۔ خاتونِ اوّل نے سوچا کہ وہ آگے نکل آئے اور ٹیلے وژن عملے کے سامنے اس کا سامنا کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ کیمرے کے سامنے اخبار لہرائے، ایک تقریر کرے اور دنیا کو بتائے کہ یہ مردِ مومن، مردِ حق، یہ بیواؤں کا یار، بس ایک مٹے تاڑو ہے اور کچھ نہیں۔

لیکن یہ خیال اُسے بس لحظے بھر کو ہی آیا کیوں کہ اسے احساس تھا کہ اس کی تقریر نہ صرف یہ کہ قومی ٹیلے وژن کی اسکرینوں پر نہیں آئے گی بلکہ اس کی وجہ سے اسلام آباد میں طرح طرح کی افواہیں بھی گردش کرنے لگیں گی جو دن ختم ہونے سے پہلے ملک کے چاروں کونوں میں پھیل جائیں گی: مثلاً یہ کہ خاتونِ اوّل پاگل ہے جو ان بیواؤں سے بھی

جلتی ہے جن کی ان کا شوہر مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اخبار کھولنے اور قطار میں کھڑی دوسری عورتوں کو وہ تصویر دکھانے کا سوچا، لیکن اسے احساس ہوا کہ وہ یہ سوچیں گی کہ اُس کا ردِّعمل ضرورت سے زیادہ ہے۔ 'صدر کے گوری عورتوں سے بات کرنے میں برائی ہی کیا ہے؟' وہ پوچھیں گی۔ 'سارے صدر ایسا کرتے ہیں۔'

اس نے خود سے آگے عورتوں کی ایک لمبی قطار دیکھی، اپنے ماتھے پر دوپٹا سختی سے باندھا اور قطار میں صبر کے ساتھ انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور جیسے جیسے قطار اپنے کرم فرما کی جانب بڑھتی گئی، وہ ان کے ساتھ انچ انچ آگے چلتی گئی۔ اس کے ہاتھ اخبار کو رول کر کر کے اسے سخت سے سخت تر ڈنڈے کی صورت دے رہے تھے۔ خاتونِ اوّل کے سامنے کھڑی عورت اس وقت سے اُسے شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جب سے وہ قطار میں آئی تھی۔ اس نے خاتونِ اوّل کے ہیرے کی انگوٹھی دیکھی، اس کی سونے کی بالیاں، اس کا مدر آف پرل کا ہار دیکھا اور پھنکار کر کہا۔ 'تمھارے شوہر نے یہ سارا زیور مرتے ہوئے تمھارے لیے چھوڑا؟ تمھیں اس کے لیے اُسے مارنا تو نہیں پڑا؟'

اِن دنوں جب جنرل ضیا نے کوڈ ریڈ کے باعث سرکاری تقریبات کے لیے بھی آرمی ہاؤس سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے وزیرِ اطلاعات کو ان ڈور قسم کے آئیڈیاز سوجھنے میں بڑی مشکل ہوتی تھی جن کی مدد سے اس کا باس ٹیلے وژن کی خبروں کی شہ سرخیوں میں اپنی جگہ برقرار رکھ سکے۔ جب جنرل ضیا نے وزیرِ اطلاعات کو حکم دیا کہ وہ صدر کے پروگرام برائے بحالیِ بیوگاں کے لیے پرائم ٹائم میں سے کوئی جگہ نکالے تو وزیرِ اطلاعات پہلے تو کچھ ہچکچایا۔ 'لیکن یہ کام تو ہم رمضان میں کرتے ہیں، سر۔' وزیرِ اطلاعات معذرت خواہانہ لہجے میں بڑبڑایا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سال کے اس حصّے میں اتنی زیادہ بیواؤں کا بندوبست کہاں سے کرے گا۔

'کیا اس ملک میں ایسا بھی کوئی قانون ہے جو مجھے جون کے مہینے میں غریبوں کی خدمت سے روک سکے؟' جنرل ضیا اس پر چلّاتے ہوئے بولا۔ 'کیا کوئی معاشی سروے ہوا

ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہماری بیواؤں کو کل صبح نہیں بلکہ صرف رمضان میں مدد کی ضرورت پڑے گی؟'

وزیرِ اطلاعات نے اپنے ہاتھ اپنے عضو کے سامنے باندھ لیے اور جوش و جذبے کے ساتھ سر ہلایا۔ 'یہ زبردست آئیڈیا ہے، سر۔ ہمارے نیوز کے ایجنڈے میں بھی یہ ایک اچھی تبدیلی ثابت ہوگی۔ لوگوں نے سوویت فوجوں کی ان کے وطن روانگی اور ہمارے افغان مجاہدین کی ایک دوسرے پر گولہ باری میں دلچسپی چھوڑ دی ہے۔'

'اور یہ بات یقینی بناؤ کہ سو سو روپے کے نوٹ نئے ہوں۔ ان بوڑھی عورتوں کو کرارے نوٹوں کی خوش بُو سے عشق ہوتا ہے۔'

وزارتِ سماجی بہبود کو حکم جاری کر دیا گیا کہ مذکورہ تقریب کے لیے عمدہ پوشاکوں میں ملبوس تین سو بیواؤں کا بندوبست کیا جائے۔ اسٹیٹ بینک کے کیشئر حضرات نے اوور ٹائم لگا کر تین سو سفید لفافوں میں سو سو کے نوٹ بھرے۔ ایک پریس ریلیز جاری کی گئی جس میں اعلان کیا گیا کہ صدر مستحق بیواؤں میں زکوٰۃ تقسیم کریں گے۔ وزیرِ اطلاعات نے ایک اضافی نوٹ بھی تیار کیا جو تقریب کے بعد مدیران کے نام جاری کیا جانا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ صدر بیواؤں میں گھل مل گئے اور ان کی حوصلہ مندی دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

صبح بسوں کا ایک کارواں دو سو تینتالیس عورتوں کو آرمی ہاؤس پہنچا گیا۔ محکمۂ سماجی بہبود کے اہل کار، اپنی بہترین کوششوں کے باوجود، مطلوبہ تعداد میں اصلی بیوائیں نہیں گھیر سکے تھے اور انھوں نے آخری مرحلے میں اپنے اسٹاف اور یاروں دوستوں اور رشتے داروں کے گھروں سے بھی خواتین اکٹھی کی تھیں۔

گارڈ ڈیوٹی پر فائز ایک مضطرب میجر نے بریگیڈیئر ٹی ایم کو فون کیا اور بتایا کہ کیمپ آفس کے باہر سیکڑوں خواتین اندر آنے کی منتظر ہیں۔ اس کے پاس اُن خواتین کی جسمانی تلاشی کا کوئی بندوبست نہیں تھا کیوں کہ ڈیوٹی پر خاتون پولیس کی کوئی اہل کار نہیں

تھی اور کوڈ ریڈ کے معیاری ضابطۂ عمل کے مطابق وہ انھیں پوری جسمانی تلاشی کے بغیر اندر آنے نہیں دے سکتا تھا۔

'انھیں وہیں پر روک کر رکھو۔' بریگیڈیئر ٹی ایم نے کہا اور فی الفور اپنی صبح کی ورزش میں پانچ سو ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے کا معمول توڑ دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے ہولسٹر کو سنبھالتا ہوا کود کر اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔

عورتوں نے آرمی ہاؤس کے گیٹ کے باہر جمگھٹا لگا لیا۔ ان میں سے کچھ خواتین نے، جو ایسی تقریبات میں پہلے بھی شرکت کر چکی تھیں، ڈیوٹی گارڈ کو دھمکی دی کہ صدر سے شکایت کریں گی۔ 'ہم اُن کے مہمان ہیں، کوئی سڑک پر پڑے ہوئے فقیر نہیں۔ ہمیں انھوں نے بلایا ہے۔' گارڈ لحہ بہ لحہ مضطرب سے مضطرب تر ہوتے جا رہے تھے لیکن جب بریگیڈیئر ٹی ایم اپنی جیپ سے اترے اور عورتوں کو تین قطاروں میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تو انھوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

اگر کوڈ ریڈ نافذ نہ بھی ہوتا تب بھی کوئی ایسی تقریب جس میں صرف خواتین موجود ہوں، سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے بریگیڈیئر ٹی ایم کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھی۔ وہ تمام شلواریں قمیصیں، لہراتے ہوئے دوپٹے، اُن کے بیگ، زیورات جنھیں سونگھ کر میٹل ڈیٹکٹر پاگل ہو جائیں اور پھر وہ حرام کے بُرقعے! کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ کسی نے اس خیمے کے نیچے راکٹ لانچر نہیں چھپا رکھا؟ بلکہ کسی کو یہ بھی کیا پتا کہ وہ عورتیں ہیں بھی یا نہیں؟ بیواؤں کے برقعوں کے معاملے پر تو بریگیڈیئر ٹی ایم نے فوراً فیصلہ لیا۔ اُس نے وزیرِ اطلاعات کو بلایا، جو کیمپ آفس کے لان پر کیمرے کے عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔ 'میں جانتا ہوں کہ یہ برقعے ٹیلے وژن پر بہت اچھے لگتے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صدر صاحب انھیں پسند کرتے ہیں لیکن ہمارا سیکیورٹی لیول ریڈ ہے اور میں ایسے کسی تمبو کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا جس کی میں شکل نہ دیکھ سکوں۔'

وزیرِ اطلاعات، جو وردی والوں سے معاملہ کرتے وقت ہمیشہ معقولیت کا ثبوت دیتا

تھا، فوراً مان گیا اور حکم دیا کہ برقعے والی خواتین بس پر چڑھیں اور وہاں سے چلی جائیں۔ ان کا احتجاج نظرانداز کر دیا گیا حالانکہ اُن میں سے ایک نے اپنا برقعہ اتارنے کی بھی پیش کش کی تھی۔ پھر بریگیڈیئر ٹی ایم نے باقی رہ جانے والی خواتین پر اپنی توجہ مرکوز کی جو یہ دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں کہ ان کی بہنوں کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔

'تم میں سے کوئی قطار سے باہر نہیں نکلے گا،' بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنی آواز کی پوری شدت سے چلّا کر کہا۔ 'کوئی صدر صاحب کے پاؤں چھونے کے لیے نیچے نہیں جھکے گی۔ کوئی انھیں گلے لگانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اگر وہ اپنا ہاتھ تم میں سے کسی کے سر پر رکھ دیں تو کوئی اچانک بلے بلے گی نہیں۔ اگر تم میں سے کسی نے ان احکامات کی خلاف ورزی کی تو۔۔۔' بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنا ہاتھ ہولسٹر پر رکھا اور پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بیواؤں کے ایک جتھے کو اپنے ریوالور سے دھمکی دینا کچھ ضرورت سے زیادہ لگتا تھا۔ 'اگر تم میں سے کسی نے ان ضابطوں کو توڑا، تو اسے صدر صاحب سے ملنے کے لیے دوبارہ نہیں بلایا جائے گا۔' جب قطاریں ایک مرتبہ پھر مُڑنے تڑنے لگیں اور بیواؤں نے گرمی کی چھٹیوں کے بعد پھر سے ملنے والی طلبا کی طرح ٹرٹر شروع کر دی تو بریگیڈیئر ٹی ایم کو اپنی دھمکی کے خالی خولی ہونے کا احساس ہوا۔ وہ کود کر اپنی جیپ میں سوار ہوا اور کیمپ آفس کے لان پر واقع اس احاطے کی طرف چلا گیا جہاں کیمرے کا عملہ تقریب کی فلم بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے اخبار ہاتھ میں لیے ایک اکیلی عورت کو ان بیواؤں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جنھیں گارڈ دوبارہ قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ مُڑ کر اُس طرف کو جائے اور جاننے کی کوشش کرے کہ آخر وہ کیوں دوسری بیواؤں کے ساتھ کھڑی نہیں ہو رہی، لیکن پھر اس نے دیکھا کہ جنرل ضیا نے وزیرِ اطلاعات سے گفتگو شروع بھی کر دی تھی۔ صدر کی جانب تیزی سے جانے سے پہلے ہی اس نے چلّا کر اُس عورت کو حکم دیا۔

'بلڈی قطار میں لگو۔'

جب صحیح معنوں میں غریب اور ضرورت مند لوگ اُس کے ارد گرد ہوتے تھے تو جنرل ضیا اپنی ریڑھ کی ہڈی کے گودے میں ان کے لیے ایک پاکیزہ سی سرسراہٹ محسوس کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ محض لالچی لوگوں سے حقیقی مجبور لوگوں کو الگ شناخت کر لیتا تھا۔ اپنے گیارہ سالہ اقتدار کے دوران اس نے ان سڑکوں کے لیے کروڑوں ڈالر کے کانٹریکٹ دیے تھے، جن کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ مون سون کی پہلی آمد پر تحلیل ہو جائیں گے۔ اس نے ان فیکٹریوں کے لیے اربوں روپے کے قرضوں کی منظوری دی تھی جن کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہاں کسی شے کی پیداوار نہیں ہوگی۔ وہ یہ سب اس لیے کرتا تھا کیوں کہ یہ امورِ ریاست داری کا حصّہ تھا اور اسے کرنا ہی تھا۔ اسے اس میں مزہ کبھی نہیں آیا۔ لیکن ایک ایسی عورت کو، جس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی مرد موجود نہ ہوتا، چند سو روپے کے نوٹوں سے بھرا لفافہ دینے میں وہ خود کو بہت اونچا محسوس کرتا۔ ان عورتوں کے چہروں پر آ جانے والا اظہارِ تشکّر دل سے نکلا ہوا لگتا، اور وہ اسے جو دعائیں دیتیں وہ حقیقی ہوتیں۔ جنرل ضیا سمجھتا تھا کہ اللہ ان کی اپیلیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اُن کی دعائیں تیزی سے سفر کرتی ہوں گی۔

تفاصیل پر نظر رکھنے والا ایک ٹیلے وژن پروڈیوسر چلتا ہوا وزیرِ اطلاعات کے پاس آیا اور ایک بینر کی جانب اشارہ کیا جسے اُس تقریب کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا جانا تھا۔

اس پر لکھا تھا،

President's Rehabilitation Programme for Windows

وزیرِ اطلاعات اپنے تجربے سے یہ بات جانتا تھا کہ املا کی ایک غلطی جنرل ضیا کا دن اور خود اُس کا اپنا کیریئر برباد کر سکتی ہے۔ جنرل ضیا اخبارات کے مضامین کی فوٹو کاپی کرا کے، چاہے اُن میں اس کی تعریف ہی کیوں نہ کی گئی ہو، انھیں شکریے کے نوٹ اور ٹائپ کی غلطیوں پر سرخ نشان کے ساتھ مدیران کو بھجواتا تھا۔ وزیرِ اطلاعات نے خود کو

بڑی احتیاط سے اُس بینر کے آگے کھڑا کر لیا اور پوری تقریب کے دوران وہاں سے ہٹنے کی ہر ترغیب رد کر دی۔ شاید یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ وزیرِ اطلاعات سرکاری ٹی وی کی فوٹیج میں اپنی مخصوص جگہ پر اپنے مخصوص موڈ میں دکھائی نہیں دے رہا تھا؛ وہ ہمیشہ اپنے باس کے پیچھے کھڑا ہوتا اور اُس کی گردن بڑی کاوش کے ساتھ جنرل ضیا کے کاندھوں سے اوپر سے نکلتی نظر آتی اور وہ اتنی دل جمعی سے دانت نکالتا تھا کہ جیسے قوم کی بقا صرف اسی کے اچھے موڈ پر منحصر ہے۔

'پاکستان کے روشن مستقبل اور میری صحت کے لیے دعا کیجیے۔' جنرل ضیا نے مرجھائے ہوئے سیب جیسی ایک پچھتر سالہ بیوہ سے کہا، جو ایسی تقاریب کی ایک پرانی مستحق تھی اور اسی لیے قطار میں سب سے آگے کھڑی ہوتی تھی۔ 'پاکستان پہلے ہی پھلا پھولا ہے۔' بیوہ نے لفافہ اُس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے اُس کے دونوں رخساروں پر اپنے دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں لیں۔ 'اور تم تو کسی جوان بیل کی طرح صحت مند ہو۔ اللہ تمھارے سب دشمنوں کو برباد کرے۔'

جنرل ضیا کے دانت باہر نکل کر چمکے، اس کی مونچھ ذرا سا مُڑی اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر اپنے بائیں ہاتھ سے بوڑھی عورت کے کاندھے پر تھپکی دی۔ 'آج میں جو کچھ ہوں سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'

جنرل ضیا کو، جو کچھ دنوں سے حضرت یونس والی آیت کے بعد پیدا ہونے والے سیکیورٹی الرٹ کے سبب فکر مند تھا، بہت عرصے بعد پہلی مرتبہ سکون محسوس ہوا۔ اس نے خواتین کی لمبی قطار کو دیکھا جن کے سر ڈھکے ہوئے تھے، جن کی آنکھیں اُمید سے بھری تھیں، اور محسوس کیا کہ اس کے محافظ فرشتے وہی ہیں، اس کے دفاع کی آخری لائن۔

بریگیڈیئر ٹی ایم فریم سے باہر کھڑا تھا اور جس طریقے سے عورتیں اس کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہی تھیں اس پر اس کے بال سیہہ کی طرح کھڑے ہو رہے تھے۔ لیکن کیمرا چل رہا تھا اور ٹیلی وژن کے سامنے رہنے کے اتنے آداب بریگیڈیئر ٹی ایم کو آتے تھے کہ تصویر سے دور رہے، اپنے غصّے پر قابو پائے اور قطار کے آخر پر توجہ مرکوز کرے جہاں لگتا تھا کہ بلّیوں والی کوئی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

قطار میں کھڑی زیادہ تر خواتین جانتی تھیں کہ صدر کو چند سو روپے دیتے ہوئے اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ صدر باتوں کے موڈ میں تھا، ہر خاتون سے اس کی صحت سے متعلق پوچھتا، اور پھر اس کے لمبے چوڑے جواب بڑے صبر سے سنتا، اور پھر انھیں اپنی صحت کے لیے دعا کرنے کو کہتا۔ اس تقریب کے لیے جو ڈیڑھ گھنٹا مختص کیا گیا تھا وہ ختم ہونے والا تھا اور ابھی قطار میں آدھی سے زیادہ خواتین باقی تھیں۔ وزیرِ اطلاعات نے سوچا کہ آگے بڑھ کر صدر سے پوچھے کہ، اگر ان کی اجازت ہو تو، وہ خود باقی لفافے تقسیم کر دے، لیکن پھر اسے غلط املا والا لفظ یاد آیا جسے وہ چھپائے ہوئے تھا؛ اس نے صدر کی طرف دیکھا جو عورتوں سے باتیں کر رہا تھا، اور فیصلہ کیا کہ صدر کا شیڈول اس کا مسئلہ نہیں ہے۔

خاتونِ اوّل کو وہ خواہرانہ مدد نہیں مل رہی تھی جس کی توقع وہ قطار میں موجود دوسری خواتین سے لگائے ہوئے تھی۔ 'اس جیسی بیگمات ہی ہماری بدنامی کا سبب بنتی ہیں۔' خاتونِ اوّل کے سامنے کھڑی عورت نے اپنے آگے کھڑی ہوئی عورت سے کُھسر پُھسر کرتے ہوئے یہ بات یقینی بنائی کہ اسے خاتونِ اوّل بھی سن سکے۔ 'اس گائے کو دیکھو تو کتنا سونا پہنا ہوا ہے اس نے۔' عورت نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ 'شاید اس کا خاوند یہ زیورات دلانے کے لیے اپنی جان سے گیا۔'

خاتونِ اوّل نے اپنا دوپٹا اپنی پیشانی پر اور بھی آگے کو سرکا لیا۔ اس نے اپنے ہار کو چھپانے کے لیے دیر سے کی جانے والی کوشش کے طور پر اسے اپنے سینے کے گرد کس لیا۔

پھر اُسے احساس ہوا کہ ان خواتین کے نزدیک وہ کوئی فراڈ لگ رہی ہوگی، کوئی امیر بیگم جو بیوہ ہونے کا بہانہ کر رہی ہو اور سرکاری خیرات کھانا چاہ رہی ہو۔

'میرا خاوند مرا نہیں ہے۔' اُس نے اپنی آواز کو اتنا بلند کرتے ہوئے کہا کہ اُس کے سامنے کھڑی دس عورتیں اسے سن سکیں۔ عورتیں مُڑیں اور اس کی طرف دیکھا۔ 'لیکن

میں نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ لو، یہ سب تم رکھ سکتی ہو۔' اس نے اپنی بالیاں اتار دیں اور اپنے ہار کا ہُک کھول دیا اور ان دونوں زیورات کو اپنے سامنے کھڑی دو عورتوں کے ہچکچاتے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔

ایک سرگوشی قطار میں سفر کرنے لگی کہ پیچھے ایک عورت سونا تقسیم کر رہی ہے۔

جنرل ضیا کی دائیں آنکھ نے قطار کی پچھلی جانب افراتفری نوٹ کر لی۔ اپنی بائیں آنکھ سے اس نے وزیرِاطلاعات کو تلاش کیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ لیکن وزیرِاطلاعات بینر کے سامنے ایسے کھڑا تھا جیسے وہ حملے کی زد پر آئی ہوئی فرنٹ لائن کے آخری مورچے کی حفاظت کر رہا ہو۔

ایک ناقابلِ یقین حد تک جوان عورت نے، جو بہ مشکل اپنی عمر کی دو دہائیاں پار کر سکی ہو گی، ضیا کی جانب سے اپنی جانب بڑھنے والا لفافہ مسترد کر دیا اور اس کے بجائے اپنے سر سے دوپٹا ہٹا کر اسے کیمرے کے سامنے ایک بینر کی طرح لہرا دیا۔

اس پر لکھا تھا، اندھی زینب کو رہا کرو۔

جنرل ضیا پیچھے ہٹ گیا، بریگیڈیئر ٹی ایم اپنے دائیں ہاتھ کو ریوالور نکالنے کے لیے تیار رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹیلے وژن کیمروں نے چلّاتی ہوئی عورت کا کلوز اپ شاٹ لیا۔

'میں بیوہ نہیں ہوں۔' وہ بار بار چلّا کر کہہ رہی تھی۔ 'مجھے نہیں چاہیے آپ کا روپیہ۔ مجھے بس یہ چاہیے کہ آپ اُس غریب اندھی عورت کو رہا کر دیں۔'

'ہم نے نابینا افراد کے لیے اسپیشل اسکول بنا دیے ہیں۔ میں نے اسپیشل لوگوں کے لیے ایک اسپیشل فنڈ بھی قائم کر دیا ہے۔' جنرل ضیا بڑبڑایا۔

'مجھے نہیں چاہیے آپ کی خیرات۔ مجھے زینب کے لیے انصاف چاہیے، اندھی زینب کے لیے۔ اگر وہ خود پر حملہ آور ہونے والوں کو شناخت نہیں کر سکتی تو یہ اُس کی اپنی غلطی ہے کیا؟'

جنرل ضیا نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اس کے سیدھے ابرو نے وزیرِ اطلاعات سے

پوچھا کہ وہ اس بیوہ کو آخر کس جہنّم سے پکڑ کر لایا ہے۔ وزیرِ اطلاعات کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی؛ یہ سمجھتے ہوئے کہ کیمرا اب اس کا کلوز اپ لے رہا ہوگا، اس کا مُنھ کھل گیا اور دانت ایک ہنسی کی صورت میں باہر نکل آئے۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور کل کے اخبارات کے لیے ایک تصویری کیپشن سوچا: صدر وزیرِ اطلاعات کے ساتھ ایک خوش گوار موڈ میں۔

بریگیڈیئر ٹی ایم قطار کی ایک جانب بے ضابطگی برداشت کر سکتا تھا لیکن اب قطار کے دونوں جانب عورتیں انگلیاں نچا رہی اور چلّا رہی تھیں، اور ان میں اُس سے جو سب سے زیادہ دور تھی وہ قطار کی آخری عورت کو کھری کھری سنا رہی تھی اور یہ جو اس کے سامنے کھڑی تھی صدارتی پروٹوکول کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ اس نے اپنا ریوالور نکالا اور کیمرامینوں کی جانب چلا۔

'فلم بنانا روک دو۔'

'یہ اچھی ہے، زبردست فوٹیج ہے۔' کیمرا مین نے کہا۔ جس کی آنکھ اب بھی کیمرے پر ٹکی ہوئی تھی۔ پھر اُس نے اپنی پسلیوں کے ساتھ کوئی سخت شے ٹکراتی ہوئی محسوس کی اور کیمرا بند کر دیا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم نے احتجاج کرنے والی عورت کو ہٹوا دیا اور تقریب دوبارہ سے شروع ہو گئی، اس مرتبہ ٹیلے وژن کیمرے کے بغیر۔ جنرل ضیا کی حرکات وسکنات میکانیکی ہو گئیں، اور اب جب کوئی عورت اپنا لفافہ لینے کے لیے اس کی طرف قدم بڑھاتی تو وہ اُس کی جانب دیکھتا بھی مشکل ہی سے تھا۔ اس نے ان کی خیر خواہانہ دعائیں بھی نظر انداز کر دیں۔ اگر اس کے دشمن اس کے محافظ فرشتوں میں بھی در اندازی کر چکے ہیں، وہ سوچ رہا تھا، تو وہ کسی پر یقین کیسے کر سکتا تھا؟

جب تک قطار میں کھڑی آخری عورت آگے آ کر اپنا لفافہ وصول کرتی، جنرل ضیا پہلے ہی وزیرِاطلاعات کی جانب جانے کے لیے مُڑ چکا تھا۔ وہ آج اُس کی اچھی طرح

سے خبر لینا چاہتا تھا۔ جنرل ضیا نے اُس عورت کو دیکھے بغیر اس کی طرف لفافہ بڑھا دیا؛ عورت نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی میں پیتل کی ایک انگوٹھی چڑھا دی۔ جب وہ اسے دیکھنے کے لیے مُڑا تو اسے شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

اس کی بیوی وہاں کھڑی تھی اور اپنی کانچ کی چوڑیوں سے بھری کلائیاں ایک دوسری پر مار رہی تھی، اور ایسا ایک عورت تبھی کرتی تھی جب وہ اپنے شوہر کی موت کی خبر سنتی تھی۔

اس کے بعد جب جنرل ضیا نے پریس میں اپنے دشمنوں پر الزام دھرا، قومی مفاد کی صدا لگائی اور اپنے اڑتیس سال کے ساتھ کو یاد کیا تو اُس نے اسے صبر سے سنا۔ اس نے وہ سب کچھ کہا جو خاتونِ اوّل کا خیال تھا کہ وہ کہے گا۔ وہ خاتونِ اوّل کی حیثیت سے اپنے رسمی فرائض کی انجام دہی جاری رکھنے پر تیار ہو گئی، کہ وہ سرکاری تقریبات میں سامنے آیا کرے گی اور دوسری خواتینِ اوّل سے علیک سلیک کیا کرے گی، لیکن یہ سب اُس نے تب کیا جب وہ اُسے اپنے بیڈ روم سے لات مار کر باہر نکال چکی۔

لیکن اُس لمحے اس نے وہاں سے جانے سے پہلے صرف ایک ہی بات کہی۔

'بیواؤں کی فہرست میں میرا نام بھی درج کرلو۔ میرے لیے تم مر چکے ہو۔'

۱۳

مجھے ٹارچر چیمبر سے ساتھ واپس لانے والا سپاہی میرے ہاتھ کھول دیتا ہے مگر میری آنکھوں کی پٹی اُتارنے کی زحمت نہیں کرتا۔ اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن نیچے کرتا ہے، میرے پچھواڑے پر لات مارتا ہے اور مجھے ایک کمرے میں دھکیل دیتا ہے۔ میں منھ کے بل گرتا ہوں اور میری زبان ریت کا ذائقہ چکھتی ہے۔ جو دروازہ میرے پیچھے بند ہوتا ہے وہ چھوٹا سا ہے۔ مجھے یہ نوٹ کر کے راحت ہوتی ہے کہ میں اب اُس غسل خانے میں نہیں ہوں جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ میں اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے کی کوشش کرتا ہوں، جس کی گانٹھ بہت سخت ہے۔ میں اسے کھینچ کر نیچے لاتا ہوں اور وہ کسی غریب آدمی کے کتے کے پٹے کی طرح میری گردن میں لٹک جاتی ہے۔ میں آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھتا ہوں لیکن میری آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ میں انھیں پھیلاتا ہوں، پھر انھیں سکیڑتا ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ کیا میں مکمّل طور پر اندھا ہو چکا ہوں؟ میں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہوں، اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینے سے ڈرتا ہوا، خود کو ایک قبر میں پانے سے خوف زدہ۔ میں سانس کھینچتا ہوں اور ہوا سے اُس رضائی جیسی بو آتی ہے جس نے مون سون کی رات باہر گزاری ہو، لیکن یہ بو پچھلی رات کی بدبُو سے بہتر ہے۔ میں اپنے دائیں ہاتھ کو ویسے ہی حرکت دیتا ہوں اور اپنے بازو کو باہر کی جانب پھیلاتا ہوں۔ میرا ہاتھ کسی چیز کو نہیں چھوتا۔ میں اپنے بائیں ہاتھ کو پھیلاتا ہوں؛ وہ بھی

ایک خلا میں تیر کر رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بازو سامنے کی جانب، پیچھے کی جانب پھیلا کر دیکھتا ہوں، پھر اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پر گھوم جاتا ہوں، مگر میرے ہاتھ کسی چیز سے نہیں چھو پاتے۔ میں اپنے ہاتھ اپنے سامنے رکھتے ہوئے چلتا ہوں اور اپنے قدموں کو گنتا جاتا ہوں۔ دس قدم بعد میرا ہاتھ ایک اینٹ کی سطح سے ٹکراتا ہے۔ میں اپنا ہاتھ اُن دبلی اور چپٹی اینٹوں پر پھیرتا ہوں جو مغلوں نے اس قلعے کی تعمیر کے لیے استعمال کی تھیں۔ طے یہ کرتا ہوں کہ میں ابھی تک قلعے میں ہی ہوں۔ میں قلعے کے ایک ایسے حصے میں ہوں جو قلعے میں آرمی کی جانب سے کی جانے والی کوئی توسیع نہیں۔ میں بائیں جانب چلتا ہوں۔ بیس قدم دور میری ملاقات مغل تعمیرات کے ایک اور نمونے سے ہوتی ہے۔ میں دیوار پر دستک دیتا ہوں اور جیسا کہ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا، مجھے اس تاریخی عمارت کے مقابل صرف اپنی دستک کی ہی مردہ آواز سنائی دیتی ہے۔

میں کسی قبر میں نہیں ہوں۔ میرے پاس کافی جگہ ہے، میں سانس لے سکتا ہوں۔ میں ایک لگژری سائز کے تہ خانے میں ہوں۔ میری آنکھیں اندھیرے سے آشنا ہو جاتی ہیں، لیکن پھر بھی کچھ دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اندھیرا مزید تاریک ہوتا جاتا ہے۔ یہ وہ تاریکی کی ایک قدیم قسم ہے، جسے مغلوں کے سادیت پسند تخیل نے ساخت کیا۔ اُن لوطیوں نے اپنی بادشاہت چاہے کھو دی ہو لیکن وہ تہ خانے بنانا ضرور جانتے تھے۔ میں اپنی کہنیوں کے بل جھک جاتا ہوں اور کہنیوں کے بل چل کر اپنی قیام گاہ کا دورہ کرتا ہوں۔ ریت اصلی ریت ہے، اس کے نیچے فرش ہے، پتھر کی بے شمار ٹھنڈی سلیبوں سے بنا۔ اگر کوئی شخص یہاں سرنگ لگانے کا منصوبہ بنائے تو اسے کسی مائننگ کمپنی کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ سولھویں صدی کی تعمیراتی اقدار پر مبنی اس جگہ پر جدید دور کے لیے جو واحد رعایت موجود ہے وہ ایک کونے میں پڑی پلاسٹک کی بالٹی ہے جس سے میرا سر ٹکراتا ہے۔ یہ غالباً کافی عرصے سے استعمال نہیں کی گئی لیکن اس سے آنے والی گندی بُو مجھ پر یہ بات بالکل واضح کر دیتی ہے کہ مجھے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے

کہ مجھے حوائجِ ضروریہ کے لیے کوئی الگ جگہ فراہم کی جائے گی۔

میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھ جاتا ہوں اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ توقع کرتا ہوں کہ تاریکی کم ہو جائے گی، جیسا کہ سنیما میں ہوتا ہے۔ میں آنکھیں پھر سے کھولتا ہوں۔ یہ جگہ کوئی سنیما نہیں۔ یہاں تو میں کوئی تخیلاتی سایہ بھی نہیں لا سکتا۔

منٹ گزرتے ہیں، گھنٹے گزرتے ہیں۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ مجھے یہاں کتنی دیر ہو چکی ہے؟ اگر میں یہاں ساکت بیٹھا رہا تو میری بینائی چلی جائے گی، اور میرے دماغ کا کچھ حصہ اور شاید میری ہاتھ پیر ہلا جلا سکنے کی صلاحیت بھی۔ میں مضطرب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ پیروں پر کھڑے ہو جاؤ، مسٹر شگری، کچھ کرو۔ میں خود کو دوڑنے کا حکم دیتا ہوں۔ میں اُس جگہ پر کچھ دیر دوڑتا ہوں، میرا جسم گرم ہو جاتا ہے۔ میں اپنا مُنھ بند رکھتا ہوں اور اپنی ناک کے ذریعے سانس لینے پر توجہ مرکوز رکھتا ہوں۔ یہ مشق کے لیے کوئی اچھا انتخاب نہیں کیوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں فرش سے اُٹھتی ہوئی ریت کو سانسوں میں بھر رہا ہوں جو اب ہوا میں اڑنا شروع کر چکی ہے۔ میں رُک جاتا ہوں۔ میں اپنے ہاتھ اپنی گردن کے پیچھے لے جاتا ہوں اور اپنے پنجوں کے بل بیٹھ جاتا ہوں اور بیٹھکیں لگانے لگتا ہوں۔ میں پانچ سو بیٹھکیں لگاتا ہوں اور پھر رُکے بغیر ہوا میں چھلانگ لگاتا ہوں اور زمین پر یوں واپس آتا ہوں کہ میرے ہاتھ ریت پر اور جسم زمین کے متوازی ہے۔ اس کے بعد میں ایک سو ڈنڈ نکالتا ہوں، پسینے کی ایک مہین چادر میرے جسم کو ڈھانپے ہوئے ہے، اور ایک اندرونی روشنی میرے چہرے پر مُسکراہٹ لے آتی ہے۔ جب میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتا ہوں میں سوچتا ہوں کہ عُبید اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر ریڈرز ڈائجسٹ کو بھیج سکتا تھا اور ڈاک کے ذریعے سو ڈالر حاصل کرنے کا خواب پورا کر سکتا تھا: 'قیدِ تنہائی میں ورزش کے طریقے۔'

میں نے ایک شمشیر زن کی حیثیت سے اپنے مختصر کیریئر کی ابتدا بستر کی ایک چادر

سے کی۔ میں نے اُس چادر کو اپنے کمرے میں لگے ایک پردے کے اوپر لٹکا دیا اور تقریباً ایک ایسی بلندی پر ایک دائرے کو نشان زد کر لیا جہاں میرے ہدف کا چہرہ موجود ہونا تھا۔ پھر میں بستر کی چادر کی جانب پیٹھ کیے کھڑا ہو گیا اور اُس ہدف میں تمام ممکنہ زاویوں سے تلوار گھونپنے کی کوشش کی، اپنے کاندھوں کے اوپر سے اپنے بائیں ہاتھ سے، اور ہاتھ کو اُلٹا گھماتے ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد چادر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی مگر ہدف اب تک کم و بیش سلامت ہی تھا اور میری تلوار بازی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

اگلے روز جب عُبید اپنی ہفتے وار چھٹی کے لیے باہر جانے کو تیار ہوا تو میں نے یہ بہانہ بنایا کہ مجھے بخار ہے۔ عُبید میرے بستر کے پاس آیا، اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا اور ایک مصنوعی تشویش کے ساتھ اپنا سر ہلایا۔ 'غالباً یہ صرف سر کا درد ہے۔' اس نے مُنھ لٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ اس امکان پر مایوس تھا کہ اسے گنز آف نیوروِن میرے بغیر دیکھنا پڑے گی۔

'میں تمھاری طرح کا کوئی شہری بابو نہیں ہوں۔ میں پہاڑوں کا ہوں جہاں سر درد صرف عورتوں کو ہوتا ہے۔' اپنے ہی جھوٹ پر تلملا کر میں نے کہا۔ عُبید حیران رہ گیا۔ 'تم عورتوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟' اس نے اپنی کلائیوں پر پوائزن اسپرے کی بڑی بڑی پھواریں پھینکتے ہوئے مجھے طعنہ دیا۔ 'تمھیں تو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ تمھاری ماں کی شکل کیسی تھی۔' میں نے اپنی بیڈ شیٹ سر پر چڑھا لی اور خود کو آہستہ آہستہ اس منظر سے الگ کرنے لگا۔

جیسے ہی وہ رخصت ہوا میں نے کمرے کو لاک کیا اور یونی فارم پہن لیا؛ بوٹ، پی کیپ، تلوار کی بیلٹ، تلوار اور باقی تمام چیزیں۔ آج کے بعد سے ہر ریہرسل فل ڈریس ریہرسل ہوگی۔ اس مشق کو ٹکڑوں میں کرنے کی کوئی تُک نہیں بنتی تھی، اصل حالات کی نقل اتارے بغیر یہ سب فضول تھا۔ میں نے ایک سفید تولیہ نکالا۔ ایک دائرہ بنانے کے بجائے اس بار میں نے پنسل سے اس پر ایک بیضوی شکل بنائی، پھر اس میں آنکھوں کے لیے دو چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیے، پھر اُلٹا سیون لکھ کر ناک بھی بنا دی۔ مجھے جھاڑو کی

طرح کی مونچھ بناتے ہوئے بہت لطف آیا۔ میں نے اپنی تخلیق پردے پر لٹکا دی، اپنا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر رکھا اور پانچ قدم پیچھے ہٹا۔ پھر میں نے اپنے ہدف کی جانب رخ کیا اور میری آنکھیں تولیے پر بنے مونچھوں والے اس چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے تلوار کھینچی اور اسے ہدف کی جانب بڑھایا۔ تلوار ہوا میں چلی اور تولیے سے کچھ انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔

پریڈ کمانڈر اور پریڈ کا معائنہ کرنے والے گیسٹ آف آنر کے درمیان فاصلہ پانچ قدموں کا ہوتا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ میں نے تلوار پھینک کر نشانہ لگانے کی کوشش کی۔ اس بار تلوار نے اُس کی ٹھوڑی چیر دی لیکن تلوار کا پھینکنا امکان سے باہر ہوا کرتا ہے۔ آپ کسی زندہ ہدف کے سامنے ایسا نہیں کر سکتے کیوں کہ اگر آپ کا نشانہ نہ لگے تو پھر آپ نہتے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ میں نشانہ نہ لگنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے بیسٹ آف تھری قسم کا موقع ملنے والا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ مسئلہ فاصلے کا نہیں تھا۔ مسئلہ اس حقیقت کا بھی نہیں تھا کہ میرا ہدف متحرک ہونا تھا؛ مسئلہ تھا تلوار گھماتے ہوئے میرے ہاتھ اور خود تلوار کے درمیان تعلّق کا۔ یہ دونوں دو الگ الگ فریق بنے ہوئے تھے۔ مشق کے ذریعے میں اپنے ہاتھ اور آنکھ کی موافقت بہتر بنا سکتا تھا، میں ان کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کو بہتر بنا سکتا تھا لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ یہ کافی نہیں تھا۔ میرے بازو اور میری تلوار کو یک جان ہونے کی ضرورت تھی۔ میرے بازو کی مچھلیوں اور میری تلوار کے مالیکیول کے ساتھ ضم ہو جانے کی ضرورت تھی۔ مجھے تلوار کو ایسے اُٹھانا تھا جیسے وہ میرے بازو کی توسیع ہو۔ جیسے کہ بینن نے ہمیں ہمارے چاقو پھینکنے کے سیشن میں بار بار بتایا تھا کہ، مجھے اپنے جذبہ فولاد پر مزید کام کرنے کی ضرورت تھی۔

یہ اپنے اندر اسٹیل کا جذبہ تلاش کرنے کا وقت تھا۔

میں نے اپنی تلوار کا بیلٹ اتار دیا اور اپنے جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا اور تولیے

پر بنائے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے دائروں کو گھورتا رہا اور پھر ارد گرد کے ماحول سے خود کو مکمل یک سوئی کے ساتھ لاتعلق کر لیا، جو کہ خود میری ہی ایجاد کردہ ایک مشق تھی۔ یہ ایک سست رفتار مشق ہے اور اسے کرنے کے لیے جو ذہنی اسٹیمنا درکار تھا وہ کسی کسی میں ہوتا ہے کیوں کہ اس میں آپ کو اپنے تمام خیالات سے چھٹکارا پانا ہوتا ہے اور اپنے پٹھوں پر پورا قابو رکھنا ہوتا ہے۔ میں اس چُھٹی کے دوران خود میں یہ اسٹیمنا پیدا کرنے میں کام یاب ہو سکا تھا جب کرنل شگری دن میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی کے خواست گار ہوا کرتے اور پھر شاموں کو اسکاچ کی بوتل پر افغانستان میں اپنی اگلی کارروائی کے منصوبے کا پلاٹ تیار کیا کرتے تھے۔ ان دنوں میرے پاس بہت سا وقت تھا۔

ارد گرد سے مکمل لاتعلقی کی مشق کا آغاز میں نے اپنی کھوپڑی سے کیا اور پھر اسے اپنے پنجوں تک لے گیا۔ میں خود میں سمٹا، سانس اندر روکی اور پھر اپنے پٹھوں کی ایک ایک گانٹھ باری باری ڈھیلی چھوڑ دی، جبکہ میرا باقی جسم اس سے لاتعلق رہا؛ اس مشق میں پہلے سے اندازہ لگانا اور کسی شے کی خواہش کرنا دونوں نقصان دہ تھے۔

فولاد کا جذبہ پٹھوں میں نہیں ہوتا، سر میں ہوتا ہے۔ تلوار کو چاہیے کہ آپ کی خواہش آپ کی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کر سکے۔

عُبید واپس آیا تو مجھے یونی فارم میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اس کی جانب سے دی گنز آف نیورون کی روداد کو نظر انداز کر دیا، اپنے ڈرل کے ایک پرانے بوٹ سے کاٹا ہوا سیاہ چمڑے کا ایک آئی پیچ نکالا اور اسے کہا کہ اسے اپنی آنکھ پر پہن لے۔ پہلی مرتبہ تو اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا، نہ ہی اس نے مجھے شوباز شگری کا طعنہ دیا۔ میں نے جب پردے چڑھا دیے اور تمام بتیاں ایک ایک کر کے بُجھا دیں تب بھی وہ ایک لفظ نہ بولا۔

جب اس نے میری تلوار کی بیلٹ کی بکل کی آواز سنی تو وہ بالآخر بولا۔ 'میں توقع کرتا ہوں کہ تم جانتے ہو گے کہ تم کر کیا رہے ہو۔' میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا، سفید

بوٹ پالش کی ایک بوتل نکالی اور اپنی تلوار کی نوک اس میں تر کی۔ عُبید مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اس کی نظروں کے سامنے میرے سینگ نکل رہے ہوں لیکن اتنی عقل اس میں ضرور تھی کہ وہ بولا کچھ نہیں۔ 'او کے، بے بی او۔ تم جہاں چاہو حرکت کر سکتے ہو لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری دونوں آنکھیں سلامت رہیں تو اتنے ہی ساکت کھڑے رہو جتنا تم رہ سکتے ہو۔ اور ہاں، مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں، اس لیے اپنا لیکچر بعد کے کسی وقت کے لیے محفوظ رکھو۔'

میں نے ٹیبل لیمپ بُجھا دیا۔ میں چلتا ہوا عُبید کے پاس گیا اور اس کے بہت قریب کھڑا ہو گیا، میں اس کی سانسوں سے الائچی کی بو سونگھ سکتا تھا۔ مُنھ کی خوش بو کے لیے وہ الائچی چباتا تھا اور سبز الائچی کے کچھ دانے ہمیشہ اس کی جیب میں ہوا کرتے تھے۔ میں پیچھے کو چلا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ قدم۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر رکھا، اور بائیں ہاتھ سے نیام پکڑ کر سیدھی کی۔ تاریکی میں تلوار نے پردے کی ایک درز سے چھن کر آتی ہوئی چاند کی روشنی کا نظارہ کیا اور ایک لمحے کے لیے چمکی۔ ایک روز یہ تلوار ایسے ہی چمکے گی، اگر اس روز بادل نہ ہوئے، میں نے سوچا۔ لیکن جو کچھ میں نے سوچا وہ غیر مُتعلق تھا۔ کمانڈ نے اپنی بات میرے دماغ سے میرے بازوؤں کی مچھلیوں تک پہنچا دی تھی اور میری تلوار کی دھات کے مردہ مالیکیول زندہ ہو گئے تھے اور میرا ارادہ تلوار کی وہ نوک بن چکا تھا جو چمڑے سے بنے ہوئے ٹکڑے کے درمیان میں جا گھسی تھی۔ میں نے تلوار دوبارہ سے نیام میں رکھی اور عُبید سے کہا کہ لائٹ روشن کر دے۔ جب عُبید لائٹ کا سوئچ آن کر کے لوٹا تو میں نے اس کی دائیں آنکھ پر بندھے سیاہ آئی پیچ کے درمیان میں ایک چھوٹا سا سفید نقطہ دیکھا۔ میرے کندھے کے پٹھے پُرسکون ہو گئے۔ عُبید آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا، آئی پیچ اُٹھایا اور اپنی زبان باہر نکال کر مجھے الائچی کا آدھا چبایا ہوا دانہ پیش کیا: وہ دانہ اس کی زبان کی سرخ مخملیں نوک پر سبز مکھی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور اپنے مُنھ میں رکھ کر اس کی میٹھی خوش بو سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس کے تلخ بیج وہ پہلے ہی کھا چکا تھا۔

وہ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ دیے۔ میرا جسم تن گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لائے اور کہا، 'تمھیں اتنا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟'

'یہ میرے خون میں ہے۔' میں اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکال کر اپنی تلوار کی نوک کی پالش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ 'اگر تمھیں کبھی اپنا باپ چھت کے پنکھے سے لٹکا ہوا ملتا تو تم بھی جان لیتے۔'

'ہم ایک ایسے آدمی کو جانتے ہیں جس سے پتا چل سکتا ہے۔' اس نے اپنی ٹھوڑی میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے گال کی گرمی محسوس کر سکتا تھا۔

'میں اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ اور میں کہوں گا بھی کیا؟ ''آفیسر بینن، کیا آپ اپنے روابط استعمال کر کے ان حالات پر روشنی ڈال سکتے ہیں جو کسی کرنل شگری کی اندوہ ناک موت کا سبب بنے۔ کرنل شگری کی موت، جس نے شاید سی آئی اے کے لیے کام کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور جس نے خود کو مار ڈالا ہو یا ایسا نہ کیا ہو؟''

'تمھیں کہیں سے تو شروع کرنا پڑے گا نا۔'

میں نے اپنی تلوار نیام میں ڈالنے سے پہلے اس کی نوک ایک آخری مرتبہ زور زور سے پونچھی۔

'میں کوئی چیز شروع نہیں کر رہا۔ میں تو یہاں اختتام کی تلاش میں ہوں۔'

وہ اپنے ہونٹ ایک بار پھر میرے کانوں کے قریب لے آیا اور سرگوشی کی، 'کبھی کبھی آپ کی نظروں کے عین نیچے کوئی ایسی جگہ ہوتی ہے جسے آپ دیکھ نہیں پاتے۔' اس کا الائچی کی خوش بو والا سانس کسی دل فریب سمندر کی لہروں کی طرح میرے کانوں میں چڑھا آ رہا تھا۔

• • •

مجھے یقیناً اونگھ آ گئی ہو گی کیوں کہ جب میں جاگا تو اندھیرے میں موجودگی کا

احساس ابھی نیا تھا اور کوئی میرے سر کی پشت کو کسی شے سے چھونے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ شے کوئی اینٹ لگتی تھی۔ میرا ابتدائی ردِّعمل یہ تھا کہ یہ گہری تاریکی میرے دماغ کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے اور میں کسی تخیلاتی ہم دم کو ایجاد کر رہا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں پھر سے بند کر لیتا ہوں اور اپنا سر دیوار میں اسی جگہ ٹکا دیتا ہوں اور ایک مرتبہ پھر میرے سر کو اینٹ کی جانب سے چھوٹا سا ٹہوکا ملتا ہے۔ میں مُڑتا ہوں اور اپنی انگلیوں سے اینٹ کے کنارے تلاش کرتا ہوں۔ اینٹ دیوار سے نصف انچ باہر نکلی ہوئی ہے۔ میں ایک ایسے دل کے ساتھ اس کے کنارے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو بڑی شدت سے اس بات کا آرزومند ہے کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ اینٹ پھر سے ہلتی ہے۔ اسے پچھلی جانب سے دھکا دیا جا رہا ہے۔ میں اس پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوں اور آہستگی سے اُسے پیچھے کو دھکیلتا ہوں۔ اس مرتبہ اُسے میری جانب اور زیادہ زور سے دھکیلا جاتا ہے۔ اب اینٹ کا نصف حصّہ دیوار سے باہر آ چکا ہے۔ میں اُسے پکڑ لیتا ہوں اور اس امید کے ساتھ بڑے آرام سے اُسے دیوار سے باہر نکال لیتا ہوں کہ اینٹ کی چرچراہٹ کے ساتھ تہ خانے میں روشنی کا سیلاب اُمڈ آئے گا۔ ہوتا کچھ بھی نہیں۔ وہاں اب بھی اُتنا ہی اندھیرا ہے جتنا مغل رکھنا چاہتے تھے۔ میں اپنا ہاتھ دیوار میں بن جانے والے خلا میں لے کر جاتا ہوں، میری انگلیاں ایک اور اینٹ کو چھوتی ہیں۔ میں اُسے ٹٹولتا ہوں اور اینٹ حرکت کرنے لگتی ہے، میں اسے ذرا سا دھکا دیتا ہوں تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔ اب بھی روشنی کی کوئی لکیر اندر نہیں آتی۔ میں دوسری جانب انسانی سانس رُکتا ہوا محسوس کرتا ہوں، جو پھر ناک سے آرام کے ساتھ نکال دیا جاتا ہے۔ میں ہنسی کی آواز سنتا ہوں، ایک جسیم، موٹی آواز والے مرد کی دانستہ ہنسی۔

ہنسی رکتی ہے اور دیوار میں بننے والے سوراخ سے ایک سرگوشی سنائی دیتی ہے؛ ایک یونہی سی سرگوشی، جیسے ہم دونوں قلعے کے دیوانِ عام کے دو درباری ہوں جو اکبرِ اعظم کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔

'درد تو نہیں ہو رہا؟'

آواز یہ سوال مجھ سے ایسے پوچھتی ہے جیسے وہ تہہ خانے کا درجۂ حرارت معلوم کر رہی ہو۔

'نہیں۔' میں کہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے لفظ پر اتنا اصرار کیوں کر رہا ہوں، پھر بھی میں کرتا ضرور ہوں۔ 'بالکل بھی نہیں۔ اور تمھیں؟'

ہنسی پھر سے لوٹ آتی ہے۔ میں خود سے کہتا ہوں کہ وہ لوگ یہاں کسی احمق کو چھوڑ کر بھول گئے ہوں گے۔

'اپنی اینٹ حفاظت سے رکھ لو۔ جب میں تم سے کہوں تو تم اسے دوبارہ یہاں رکھ دینا۔ تم انھیں میرے بارے میں کچھ بھی بتا سکتے ہو، لیکن اس اینٹ کے بارے میں نہیں۔'

'تم ہو کون؟' میں اپنا چہرہ سوراخ کے قریب لانے کی زحمت کیے بغیر پوچھتا ہوں۔ میری آواز تہہ خانے میں گونجتی ہے اور تاریکی اچانک زندہ ہو جاتی ہے، امکانات سے بھری ایک کوکھ کی طرح۔

'پُرسکون ہو جاؤ۔' وہ شدّت کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ 'سوراخ میں بات کرو۔'

'تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمھارا نام کیا ہے؟' میں سوراخ میں اپنا نصف چہرہ ڈالے سرگوشی کرتا ہوں۔

'اتنا بے وقوف میں نہیں ہوں کہ تمھیں اپنا نام بتا دوں۔ یہ جگہ جاسوسوں سے بھری ہوئی ہے۔'

میں انتظار کرتا ہوں کہ وہ مزید کچھ کہے۔ میں اپنی پوزیشن تبدیل کرتا ہوں اور اپنا کان سوراخ کے پاس لے آتا ہوں۔ میں انتظار کرتا ہوں۔ وہ ایک طویل وقفے کے بعد بولتا ہے۔ 'لیکن میں تمھیں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں یہاں کیوں ہوں۔'

میں خاموش رہتا ہوں اور انتظار کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے خلاف چارج شیٹ پڑھ کر سنائے، لیکن وہ خاموش رہتا ہے، شاید اسے میری جانب سے مزید حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔

'میں سن رہا ہوں۔' میں کہتا ہوں۔

'جنرل ضیا کو قتل کرنے کی وجہ سے۔' وہ کہتا ہے۔

حرامی سویلینز، میں اس کے مُنھ پر چلّا کر کہنا چاہتا ہوں۔ میجر کیانی نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے، مجھے اس کنگ سائز قبر میں پھینک دیا ہے اور ایک پاگل سویلین کو میرا پڑوسی بنا دیا ہے اور رابطے کا ایک چینل خود پیدا کیا ہے۔ غالباً اچھے خاندانوں سے آنے والے لوگوں پر تشدّد کرنے کا اس کا یہی طریقہ ہے۔

'واقعی؟' میں مشہورِ عالم شگری استہزاء کے ساتھ کہتا ہوں۔ 'تم نے کام ٹھیک سے نہیں کیا۔ میری اُس سے دو روز پہلے ہی بات ہوئی ہے اور وہ مجھے کافی زندہ زندہ لگا تھا۔'

اگر وہ ایک سویلین تھا تو اس کا ردِّعمل ایسا نپا تُلا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

'تو کیا تم اُس کے ذاتی مہمان ہو؟ اس اعزاز کے مستحق ہونے کے لیے تم نے آخر کیا کیا ہے؟'

'میں فوج میں سے ہوں۔ انھیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔' میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کافی متاثر ہوا ہوگا کیوں کہ وہ کافی دیر خاموش رہا تھا۔

'تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟' وہ کہتا ہے، اس کی آواز کچھ سوالیہ ہے اور کچھ پریشانی کی غماز۔

'میں اب بھی وردی میں ہوں۔' میں ایک حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ یہ بات میں خود کو یقین دلانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔

'اپنا چہرہ سوراخ کے سامنے رکھو، میں تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'

میں اپنا چہرہ سوراخ میں رکھ دیتا ہوں اور بے چینی سے سرگوشی کرتا ہوں۔ 'تمھارے

پاس روشنی ہے؟' اگر اس کے پاس روشنی ہے تو پھر اس کے پاس سگریٹ بھی ہوگا۔

میں حیران رہ جاتا ہوں جب میری آنکھوں کو اس کا تھوک آ کر لگتا ہے، اتنا حیران ہوتا ہوں کہ تھوک سے ہی اُس کا جواب بھی نہیں دے پاتا۔ جب تک میں اسے 'یہ کیا چتیاپا ہے؟' کہہ سکوں وہ اینٹ سوراخ میں رکھ دیتا ہے اور میں اپنی آنکھ مسلتا اور خود کو احمق محسوس کرتا رہ جاتا ہوں جس پر ایک ایسے شخص نے تھوک دیا جس کا نام بھی مجھے نہیں معلوم تھا اور جس کا چہرہ بھی میں نے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اُسے کہا کیا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے میں غصّے میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگانے لگتا ہوں، میرے پاؤں ابھی سے جانتے ہیں کہ انھیں کہاں پر جا کر رُکنا اور پھر مُڑنا ہے۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں نے اُسے اپنے آخری الفاظ میں کیا کہا تھا۔ میں نے اُسے صرف یہی کہا تھا کہ میں نے ابھی تک اپنی وردی پہن رکھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سویلین لوگ ہماری وردیوں سے پیار کرتے ہیں۔ اس وردی کی تعریف میں تو ریڈیو پر گانے چلتے ہیں، ٹیلے وژن پر ڈرامے آتے ہیں اور اخبارات کے خصوصی ایڈیشن چھپتے ہیں۔ باہر سیکڑوں ہزاروں عورتیں ہیں جو وردی میں ملبوس کسی بھی شخص کو اپنا فون نمبر دینے کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔ شاید میرا سویلین پڑوسی حسد کی کسی بدترین قسم کا شکار ہے۔

لیکن آخر میں سویلین لوگوں کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں یا یہ کہ وہ کیا سوچتے ہیں؟ میں ان کے بارے میں وہی کچھ جانتا ہوں جو ٹیلے وژن یا اخبارات مجھے بتاتے ہیں۔ پاکستان کے قومی ٹیلے وژن پر تو وہ ہر وقت ہماری تعریف میں گاتے نظر آتے ہیں۔ ہماری اکیڈمی میں واحد اخبار پاکستان ٹائمز آتا ہے جس میں کسی بھی جنرل ضیا کی ایک درجن تصویریں ہوتی ہیں اور اس میں کوئی سویلین نظر آتا بھی ہے تو وہ ہوتا ہے جو جنرل ضیا کے پاس تسلیمات بجا لانے کے لیے حاضر ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہمیں ان جنونیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے جو آپ پر تھوک پھینکنا چاہتے ہیں۔

میں اینٹ کو دوسری اینٹوں کے ساتھ رگڑ کھاتے ہوئے سنتا ہوں۔ میں دیوار میں ہو جانے والے سوراخ سے ایک کم آواز سیٹی سنتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنی دیوار والی اینٹ دیوار میں رکھ کر، بہ قول عُبید، اپنے اکیلے پن کو مکمل تنہائی میں بدل ڈالوں۔ لیکن میرا پڑوسی بات چیت کے موڈ میں ہے۔ میں اپنا کان سوراخ کے ایک جانب رکھتا ہوں، یہ بات یقینی بناتے ہوئے کہ میرے چہرے کا کوئی حصّہ اس کے حملے کی زد میں نہیں ہے۔

'کیا تم معافی مانگنا چاہتے ہو؟' وہ سرگوشی کرتا ہے، ظاہر ہے مجھ پر طنز کر رہا ہے۔

'کس بات کے لیے؟' میں بس یوں ہی پوچھتا ہوں، اپنا چہرہ دیوار میں ہوئے سوراخ میں رکھے بغیر، اپنی آواز کم کرنے کا تکلف کیے بغیر۔

'شش۔ تم ہمیں مروا دو گے۔' وہ غصّے سے کہتا ہے۔ 'تمھی لوگوں نے مجھے یہاں بند کرایا ہے۔'

'ہم لوگ ہیں کون؟'

'خاکی وردی والے۔ فوج کے لوگ۔'

'لیکن میں تو ائر فورس سے ہوں۔' میں قوم کی مضبوطی سے جڑی ہوئی مسلح افواج کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

'فرق ہی کیا ہے؟' تم لوگوں کے پر ہوتے ہیں کیا؟ تم لوگوں کے خصیے ہوتے ہیں کیا؟'

میں اس کے طنزیہ فقروں کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ کوئی مناسب قسم کی بات چیت ہو سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے مُنھ پر اینٹ رکھ کر دیوار بند کر دینے سے پہلے اسے یہ ثابت کرنے کا موقع دوں کہ وہ کوئی مکمل سویلین جنونی نہیں ہے۔

'تم کتنے عرصے سے ہو یہاں؟'

'جب سے تم نے وزیرِاعظم بھٹو کو پھانسی دی ہے، اس کے دو دن بعد سے۔'

میں اس کی جانب سے خود کو ایسے جرائم میں ملوث کرنے کی کوشش کو نظرانداز کرتا

ہوں جو واضح طور پر میں نے نہیں کیے۔ 'تم نے کیا کیا تھا؟'

'کیا تم نے آل پاکستان خاکروب یونین کا نام سنا ہے؟' میں اس کی آواز میں موجود احساسِ تفاخر سے یہ بتا سکتا ہوں کہ اسے مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں نے سنا ہی ہوگا، لیکن میں نے نہیں سنا تھا، اس لیے کہ مجھے ان پیشے کی سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اگر گٹر صاف کرنے کو کوئی پیشہ کہا جا سکے تو۔

'ہاں ہاں۔ گٹر صاف کرنے والوں کی تنظیم۔'

'میں سیکرٹری جنرل ہوں۔' وہ کہتا ہے، جیسے اس کے اس بیان کے نتیجے میں مغل فنِ تعمیر سے لے کر اس بیت خانے اور وردی میں ملبوس اس کے ہم وطنوں سے اس کی غیر منطقی نفرت تک ہر چیز کی وضاحت ہو جاتی ہو۔

'تو تم نے کیا کیا تھا؟ گٹروں کی اچھی طرح صفائی نہیں کی تھی کیا؟'

وہ میرا مذاق نظرانداز کر دیتا ہے اور ایک سنجیدہ لہجے میں جواب دیتا ہے، 'انھوں نے مجھ پر جنرل ضیا کے قتل کی سازش کا الزام لگایا ہے۔'

مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ پھر تو ہم دو ہو گئے، لیکن میں اُس شخص پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ کیا پتا وہ کوئی مخبر ہو جو میجر کیانی نے میرا اعتماد جیتنے کے لیے پلانٹ کر رکھا ہو؟ لیکن میجر کیانی کے آدمیوں میں ایسی تخیلاتی صلاحیت یا دل گردہ نہیں ہوگا کہ وہ خاکروبوں کی یونین کے کسی رکن کا کردار ادا کریں۔

'کیا تم اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے؟ تم کس طرح قتل کرنا چاہتے تھے اُسے؟'

'ہماری مرکزی کمیٹی نے جنرل ضیا کو دعوت دی کہ وہ قومی ہفتۂ صفائی کا افتتاح کرے۔ میں اس دعوت کے خلاف تھا کیوں کہ اُس کی فوجی بغاوت قومی بورژوازی کے خلاف کارکن طبقے کی جدوجہد کو نقصان پہنچانے کا باعث تھی۔ یہ سب ریکارڈ پر موجود ہے۔ تم میرے اعتراضات کو اجلاس کی روداد میں پڑھ سکتے ہو۔ خفیہ ایجنسیاں ہماری

یونین میں سرایت کر گئیں، ہمارے ماؤ نواز دوستوں نے ہمیں دھوکا دیا اور ایک متوازی مرکزی کمیٹی بنا لی اور جنرل ضیا کو مدعو کر لیا۔ پھر جنرل ضیا ہفتۂ صفائی کا افتتاح کرتے ہوئے جس گٹر کی صفائی کرنے والا تھا، اس میں سے سیکیورٹی فورسز نے ایک بم برآمد کر لیا۔ اب دیکھو تو سہی کہ فوجی دماغ کیسے کام کرتے ہیں۔ میں ہی وہ شخص تھا جو اسے مدعو کرنے کی مخالفت کر رہا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ ہمارے گٹروں کے قریب بھی نہ پھٹکے اور تم لوگوں نے پہلا آدمی کون سا گرفتار کیا؟ میں۔'

'تو کیا بم تم نے رکھا تھا؟' میں پوچھتا ہوں۔

'پاکستان خاکروب یونین کا ہر رکن سیاسی جدوجہد پر یقین رکھتا ہے۔' اس نے بڑے پُرشوکت لہجے میں کہا اور اس موضوع پر گفت گو ختم کر دی۔

ہم دونوں کچھ وقت کے لیے خاموش رہتے ہیں اور نہ جانے کیوں وہ جگہ مزید تاریک نظر آنے لگتی ہے۔

'کوئی شخص اسے قتل کرنا کیوں چاہے گا؟' میں پوچھتا ہوں۔ 'میرا تو خیال ہے کہ وہ بہت مقبول ہے۔ میں نے اس کی تصویر ٹرکوں اور بسوں پر لگی دیکھی ہے۔'

'تم خاکی وردی والوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تم نے اپنی ہی بکواس پر یقین کرنا شروع کر دیا ہے۔'

میں اسے جواب نہیں دیتا۔ مجھے احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بلڈی سویلین تو ہے لیکن اُس قسم کا جس سے میری اس سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دھیمی سی ہنسی ہنستا ہے اور پرانی یادیں تازہ کرنے والی آواز میں بولنا شروع کر دیتا ہے۔ 'تمھیں پتا ہے انھوں نے ماؤ نوازوں کو اپنے ساتھ ملانے سے پہلے ہماری یونین کے ساتھ کون سا کھیل کھیلا؟'

'نہیں۔' میں نے کہا، کیوں کہ میں ان چیزوں کے بارے میں علم ظاہر کرتے کرتے تھک چکا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

'انھوں نے ہماری یونین میں مولوی گھسانے کی کوشش کی جیسے انھوں نے ہر ٹریڈ

یونین میں کیا ہے۔ انھوں نے تو ہفتۂ صفائی کو بھی اس نعرے کے ذریعے ہائی جیک کرنے کی کوشش کی کہ: صفائی نصف ایمان ہے۔' وہ ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

'پھر کیا ہوا؟' مجھے اُس کے مذاق کی واقعی کوئی سمجھ نہیں آتی۔ یہ نعرہ تو پاکستان میں ہر دوسرے عوامی بیت الخلاء میں لکھا ہوتا ہے، کوئی اس کی پروا بھلے ہی نہ کرتا ہو، لیکن کسی کو یہ نعرہ مذاق بھی تو نہیں لگتا۔

'ہر خاکروب یا تو ہندو ہوتا ہے یا مسیحی۔ اور تم لوگ سمجھتے تھے کہ اپنے کرائے کے مولوی بھیج کر ہماری یونین کو توڑ دو گے۔'

میرے سامنے داڑھی والوں کا ایک امیج ابھرا جو خاکروبوں کی یونین میں دراندازی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچھا بھئی۔ یہ کوئی اچھا آئیڈیا نہیں تھا۔

'لیکن میں تمھیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں جو میں پبلک میں نہیں بتا سکتا۔' وہ بہت شدید لیکن کم آواز سرگوشی میں کہتا ہے۔ 'یہ ماؤ نواز لوگ ملّاؤں سے بھی بُرے ہوتے ہیں۔'

'دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ تم سیکرٹری جنرل وغیرہ ہو، لیکن کیا تم واقعی یقین رکھتے ہو کہ ضیا اور اس کے جنرل وہاں بیٹھے اس بارے میں ہی پریشان ہوتے رہتے ہیں کہ خاکروبوں کی طاقت کا توڑ کیسے کریں؟ میرا خیال ہے تم اتنے ذہین تو ہو کہ ایسی باتوں پر یقین نہ کرو۔'

شاید یہ میرے مربّیانہ لہجے کا اثر تھا کہ وہ خاموش سا ہو گیا، جس کے بعد غصّے میں اس کے منھ سے ایک رَو سی نکلی۔

'تم ری ایکشنری بورژوا اسٹیبلشمنٹ کا حصّہ ہو جسے ہماری تاریخ کی جدلیات کی کبھی سمجھ ہی نہیں آئی۔ میں حکومت کو گرانے کے اتنا قریب پہنچ چکا تھا۔'

میں نے خواہش کی کہ اُسے دیکھ سکتا۔ اچانک وہ بوڑھا اور خبطی سا لگنے لگتا ہے، ان خیالات سے بھرا ہوا جن کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔

'ہم نے ہڑتال کی کال دی۔ کیا تمھیں ۱۹۷۹ء کی آل پاکستان خاکروب یونین کی

ہڑتال یاد ہے؟ مجھے پتا ہے تمھیں نہیں پتا ہوگا۔ تمھارے کنٹونمنٹ کے علاقے کے خاکروبوں کو یونین میں شامل نہیں ہونے دیا جاتا۔ دو تین دن میں غلاظت کے ڈھیر پہاڑیوں جتنے بلند ہو گئے تھے اور سارے گٹر بند ہو گئے تھے اور تمھاری سویلین بورژوا بھائیوں کو اپنی غلاظت خود اُٹھا کر ڈھیروں پر پھینکنی پڑ رہی تھی۔'

میں اسے ٹوکنا چاہتا ہوں اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب خاکروب ہڑتال پر نہیں ہوتے تب بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن مجھے اپنے تہ خانے کی دیوار کے سرکنے کی آواز آتی ہے۔

میں جس تیزی اور دُرستی سے اینٹ دیوار میں رکھ دیتا ہوں اس پر خود حیران رہ جاتا ہوں۔ میں اب اس سیاہ سوراخ سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میجر کیانی کا چھوٹا سا کھیل اب ختم ہو گیا ہوگا۔ وہ جنرل اختر کا ذاتی پالتو ہوا کرے مگر اُس کے پٹے کی رسی اتنی طویل نہیں ہو سکتی۔ میں منتظر ہوں کہ اب اپنے دانت صاف کر سکوں گا، ایک تازہ وردی پہن سکوں گا اور سب سے بڑھ کر اس کا کہ سورج کی شعاعیں پھر سے میری آنکھوں میں گھُس سکیں گی۔

جب دروازہ تھوڑا سا کھلتا ہے تو میں بس روشن سی ایک سرنگ جتنی لائٹ دیکھ پاتا ہوں جو میری آنکھوں کو فوری طور پر چندھیا دیتی ہے۔ واحد چیز جو میں دیکھ پاتا ہوں اسٹین لیس اسٹیل کی ایک پلیٹ کو آگے بڑھاتا ہوا ہاتھ ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اُٹھ سکوں اور دروازے کے پیچھے موجود شخص کو خوش آمدید کہہ سکوں، اس کا استقبال کروں یا اس کے ہاتھ کوئی پیغام بھجواؤں، یا پھر اس کی بندوق چھین کر اسے یرغمال بنا لوں یا اس سے ایک سگریٹ کی بھیک مانگوں، دروازہ پھر سے بند ہو جاتا ہے اور کمرا پھر سے تاریک ہو جاتا ہے اور گرم کھانے کی خوش بو سے بھر جاتا ہے۔

آپ آزادی مانگتے ہیں اور وہ آپ کو چکن قورمہ پیش کرتے ہیں۔

۱۴

جنرل ضیا نے اپنے صبح کے اخبارات کے ڈھیر سے فوٹو کاپی کیا ہوا ایک تراشا اُٹھایا جس پر نیو یارک ٹائمز لکھا ہوا تھا۔ وہ اس پر بھی نظر آ رہی تھی: اندھی زینب، سر اور چہرے کے گرد سفید دوپٹا کیے، اور پلاسٹک کے سستے سے سن گلاسز کی ایک جوڑی سے آنکھیں چھپائے۔ اس نے اس کی تصویر کے نیچے درج کیپشن کو پڑھنے سے پہلے ہی جان لیا تھا کہ وہ وہی ہے، بلکہ سرخی پڑھنے سے بھی پہلے: پاک سرزمین میں اندھا قانون۔

جب سے خاتونِ اوّل نے اسے ناشتہ پیش کرنا چھوڑا تھا، اس کی صبحیں ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ جب وہ کھانے کی میز پر اس کے ساتھ موجود ہوتی تھی تو وہ اس روز کی سرخیوں پر اپنے غصّے کا اظہار اپنی بیوی پر چلّا کر کر لیتا تھا۔ ان دنوں چوبیس نشستوں پر مشتمل ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے بیٹھے ہوئے وہ جہنم کا کوئی لائبریرین لگتا تھا؛ اس نے ایک اخبار اُٹھایا، بری خبروں کو انڈر لائن کیا، ان میں جو اچھے ٹکڑے تھے ان کے گرد دائرے لگائے، حزبِ اختلاف کے رہ نماؤں کی تصویروں کو استہزا سے دیکھا اور اخبار کو ڈیوٹی ویٹر کی طرف پھینک دیا جو کونے میں کھڑا صدقِ دل سے امید کر رہا تھا کہ کم از کم کچھ خبریں تو اچھی ہوں گی ہی۔

مغربی پریس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ ان کے سر پر جنس اور عورت اس قدر کیوں سوار ہیں؟ اندھی زینب سے مُتعلق مغربی پریس میں یہ تیسری اسٹوری تھی۔ غیر قانونی جنسی تعلقات کا سادہ سا معاملہ ایک بین الاقوامی معاملہ بنا دیا گیا تھا۔ کیوں؟ جنرل ضیا کو

حیرت ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ عورت اندھی تھی، اس نے سوچا، کیوں کہ وہ دیکھنے میں اتنی اچھی نہیں لگتی تھی۔ دیکھو ذرا ان امریکیوں کو کہ وہ جنسی کارروائی میں ملوث اندھی عورتوں کے لیے اپنے فرنٹ پیج مخصوص کرتے ہیں۔ جنسی بے راہ روکہیں کے۔

جنرل ضیا کو نیو یارک ٹائمز کا وہ رپورٹر یاد آیا جس نے اس کا انٹرویو کیا تھا: وہ اپنا بال پین چبا چبا کر اس سے بڑے احترام سے کہتا رہا تھا کہ اس نے پوری مسلم دنیا میں اس جیسا صاحبِ مطالعہ رہ نما نہیں دیکھا تھا۔ جنرل ضیا اس سے دو گھنٹے بات کرتا رہا تھا، اس نے اسے ایرانی قالین تحفے میں دیا اور انٹرویو کے بعد اسے اپنے ساتھ لے کر پورچ تک گیا۔ اسے بالکل یاد تھا کہ رپورٹر نے اس سے اندھی عورت کے کیس سے مُتعلق سوال کیا تھا اور اس نے اسے اپنا رٹا رٹایا جواب دے دیا تھا۔ 'معاملہ عدالت میں ہے۔ کیا آپ امریکی عدالت میں زیرِ سماعت کسی فوجداری مقدمے سے مُتعلق امریکی صدر سے سوال پوچھیں گے؟'

اس نے تصویر کی جانب ایک بار پھر دیکھا۔ اسے اس بات پر کبھی یقین نہیں آیا تھا کہ یہ عورت اندھی تھی۔ اندھے لوگ اپنی تصویریں امریکی اخبارات کے فرنٹ پیج پر شائع نہیں کراتے پھرتے۔ اس نے اپنے مطالعے کا چشمہ درست کیا، اسٹوری احتیاط سے پڑھی اور اسے احساس ہوا کہ اسٹوری اتنی بری بھی نہیں۔ اسے ایک 'مُسکراتا ہوا آمر' بیان کیا گیا تھا، 'ایک ایسا شخص جو ادب آداب کا پوری طرح خیال رکھتا ہے'، 'ایک ایسا آدمی جو خود اپنے مُتعلق لطیفے سناتا ہے'، 'ایک ایسا آدمی جو رواں دواں انگریزی میں کھل کر اور بلاجھجک بات کرسکتا تھا، لیکن جس نے اندھی عورت کے کیس پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا'۔ اس کا یہ سکون زیادہ دیر باقی نہ رہا کہ جب اس نے یہ آرٹیکل ایک طرف رکھا اور نیو یارک ٹائمز کے ادارتی صفحے پر موجود ایک اور تراشا دریافت کیا: دو پیراگراف کا ایک ٹکڑا، جس کا عنوان ایک مرتبہ پھر 'اندھا قانون' تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکی اخبارات میں اس سے مُتعلق منفی قسم کے اداریے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان اخبارات کے مالکان آپ

کے پیچھے پڑے ہیں اور وہ ایسا شاید واشنگٹن میں اپنی حکومت کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ اس نے 'بربریت سے بھرپور، مکار آمر، ہماری حکومت کا بنیاد پرست دوست جو اپنے ملک کو بے رحمانہ طریقے سے مارچ کراتے ہوئے وقت میں پیچھے کی طرف لے جا رہا ہے'، جیسے الفاظ انڈر لائن کیے۔ ہر لفظ انڈر لائن کرتے ہوئے اس کا بلڈ پریشر اور اوپر ہو جاتا۔ اس کی بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ اس نے ادارتی صفحے کے اوپر نظر جمائی اور آرتھر سالزبرگ کا نام انڈر لائن کر لیا۔ اس نے فون اُٹھایا اور اپنے وزیرِ اطلاعات کو کال ملائی، جس نے یہ انٹرویو طے کرایا تھا اور اس طرح بیواؤں والی ناکام مہم کے بعد اپنی نوکری بچائی تھی۔

'نام کیسا ہے یہ سالزبرگ؟' وہ جن خوش آمدیدی کلمات کا عادی تھا (کیسے ہیں آپ، بیگم کیسی ہیں اور بچے؟) انھیں ترک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

وزیرِ اطلاعات کو کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وہ کس کا پوچھ رہا ہے اس لیے وہ بولا۔ 'سر، مجھے اس لاعلمی پر معاف فرمائیں لیکن میں نے یہ نام نہیں سنا۔'

'کیا میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ تم اس شخص کو جانتے ہو؟ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں صرف یہ ہے: کس قسم کا نام ہے یہ؟ مسیحی نام ہے، یہودی یا ہندو؟'

'میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، سر۔ لگتا تو جرمن ہے۔'

'میں جانتا ہوں کہ کچھ اخبارات آپ کو ڈس انفارمیشن منسٹر کہتے ہیں، لیکن آپ کو اس خطاب کو اتنی سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ تلاش کیجیے اور مغرب کی نماز سے پہلے پہلے مجھے بتائیے۔' اس نے فون کا چونگا کریڈل پر پٹخ دیا۔

وزیرِ اطلاعات نے سب سے پہلے خود اپنی مانیٹرنگ ڈیسک کو فون ملایا، جو تمام نامہ نگاروں، مدیروں اور ناشروں کی فائلیں تیار رکھتی تھی۔ انھوں نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا۔ اس نے ایک مقامی رپورٹر کو فون کیا جس نے اسے کئی مرتبہ اپنا نیو یارک ٹائمز کا کارڈ دکھایا تھا، لیکن معلوم یہ ہوا کہ وہ تو نیو یارک ٹائمز کے مقامی نامہ نگار کے لیے ایک چھوٹے کا کام کرتا تھا اور اس نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا۔

ہچکچاتے ہوئے، بہت ہچکچاتے ہوئے، وزیرِ اطلاعات نے یہ درخواست آگے انٹرسروسز انٹیلی جینس کے انفارمیشن سیل کو بھجوا دی۔ وہ جانتا تھا کہ اس بات کی اطلاع جنرل ضیا کو بھی دی جائے گی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر انٹیلی جینس ایجنسیوں کو یہ گھٹیا کام بھی کرنا ہے تو ملک میں کسی وزیرِ اطلاعات کی کیا ضرورت ہے۔

جب آئی ایس آئی نے سہ پہر کے بعد اسے احترام سے بتایا کہ ان کے پاس آرتھر سالزبرگ سے مُتعلّق کوئی معلومات نہیں تو وزیرِ اطلاعات ایسا پریشان ہوا کہ اس کے نتیجے میں دو مقامی فلمی رسالوں کی اشاعت کے پرمٹ منسوخ ہو گئے۔ پھر اس کے دماغ میں ایک چمک پیدا ہوئی: نیو یارک ٹائمز نیو یارک میں ہے۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور نیو یارک میں پاکستان کے پریس اتاشی کو فون ملایا جس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن اسے اعتماد تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں معلوم کر لے گا کیوں کہ نیو یارک ٹائمز کے نیوز روم میں اس کے بہترین کانٹیکٹ تھے۔ پریس اتاشی نے اپنے ایک دوست پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کو فون کیا جس کے بارے میں وہ یہ جانتا تھا کہ وہ ہر اخبار کا ہر لفظ پڑھتا تھا اور پاکستان سے مُتعلّق ہر اسٹوری پر اسے الرٹ رکھتا تھا۔

'سالزبرگر۔' کیب ڈرائیور اپنی کیب کے فون پر چلّایا اور اس نے من ہاٹن کی ٹریفک لائٹ کا ایک سگنل توڑ ڈالا۔ 'سالزبرگر۔۔۔ وہ یہودی۔'

یہ انفارمیشن اس کی کیب سے نیو یارک میں پاکستانی قونصل خانے پہنچی، پھر ایک محفوظ ٹیلی پرنٹر کے ذریعے اسلام آباد میں وزارتِ اطلاعات تک گئی اور اپنی ڈیڈلائن سے پانچ منٹ پہلے وزیرِ اطلاعات کو ایک نوٹ موصول ہو گیا جس پر لکھا تھا 'کلاسیفائیڈ'۔

نیو یارک ٹائمز کا مالک ایک یہودی تھا۔

جنرل ضیا نے یہ بات اطمینان کے احساس کے ساتھ سنی۔ جب وہ درست ہوتا تو اسے اپنے اندر اس کا احساس ہو جاتا تھا۔ وہ وزیرِ اطلاعات پر چلّایا: تم انتظار کس بات کا کر رہے ہو؟ نکالو ایک پریس ریلیز اور بتاؤ ان سب کو کہ اس اندھی کے بارے میں یہ

تمام شور یہودی پروپیگنڈا ہے۔ اور اگلی مرتبہ جب ہم امریکا جائیں تو سالزبرگر کو کھانے پر بلانا۔ اپنے ساتھ ایک بڑا ایرانی قالین بھی رکھ لینا۔'

اپنے دفتر میں ایسے سرگرم دن کے اختتام پر وزیرِ اطلاعات جنرل کو یہ تک بتانے کی ہمت نہ کر پایا کہ وہ اس نے تو صبح سب سے پہلا کام ہی یہودی پروپیگنڈے کے بارے میں پریس ریلیز جاری کر کے کیا تھا۔ جب جنرل ضیا سے مُتعلّق منفی خبروں کی تردید کرنا ہوتی تو اس کے آفس میں اس کے لیے معیاری آپریٹنگ پروسیجر موجود تھا۔ یہ پریس ریلیزیں دو قسم کی ہوتیں: یہودی پروپیگنڈا اور ہندو پروپیگنڈا۔ اور چوں کہ وہ اسٹوری نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئی تھی، اس لیے اسے ہندو پروپیگنڈا والے ڈھیر میں تو رکھا جا ہی نہیں سکتا تھا۔

جنرل ضیا جانتا تھا کہ آرنلڈ رافیل مدد نہیں کرے گا، لیکن پھر بھی اس نے اسے فون کیا۔ سفیر نے، ظاہر ہے کہ، انٹرویو دیکھ رکھا تھا۔ 'کچھ اچھے جملے بھی ہیں۔' اس نے جنرل ضیا کا موڈ اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

'اس کا اداریہ۔' جنرل ضیا نے کہا اور پھر توقف کیا۔ 'اداریہ بہت ہی افسوس ناک ہے۔ مجھے ذاتی تضحیک کی پروا نہیں، لیکن کوئی ہماری دوستی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی اس سارے اچھے کام کو خراب کرنا چاہتا ہے جو ہم نے مل جل کر کیے ہیں۔'

'شاید وہاں چند لبرل اوپ ایڈ رائٹر ہیں جن کے لیے اس دن خبریں کم ہوں گی، صدر صاحب۔ میں تو اس کے بارے میں زیادہ پریشان نہ ہوتا۔'

'اس سے نوبیل انعام کے لیے ہمارے چانس کو دھچکا لگ سکتا ہے، دیکھیں نا۔ میں تو امید کر رہا تھا کہ ہم اسے اکٹھے وصول کریں گے۔' دوسری جانب ایک لمحے کی خاموشی ہوئی۔ 'افغانستان کو آزاد کرانے پر۔' اس نے اضافہ کیا اور سوچا کہ یہ آرنی اتنا ذہین نہیں ہے۔

'اس پر ہم پارٹی میں بات کر سکتے ہیں نا، صدر صاحب، مجھے امید ہے کہ آپ وہاں آ سکیں گے۔'

جنرل ضیا کو احساس ہوا کہ یہودی پریس کو الزام دینے والے بیان اور امریکی سفیر سے بات کے بعد اندھی زینب کا مسئلہ حل نہیں ہوگا جبکہ اس دوران خواتین کا ایک اور گروپ اگلے ہی دن اسلام آباد میں مظاہرہ کرنے والا تھا۔ 'سب امیر بیگمات ہیں،' وزیرِ اطلاعات نے اسے بتایا۔ 'مظاہرین سے زیادہ ان کے ڈرائیور ہوں گے۔'

جنرل ضیا جب ایسے کسی قانونی مخمصے میں مبتلا ہوتا تو فون اُٹھاتا اور نوّے سال کے قاضی کو کال کرتا۔ مکّہ میں وہ اس کے اعتبار کا آدمی تھا اور تیس سال پہلے سعودی عرب کی شریعہ عدالت کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوا تھا اور اس کے بعد سے اس نے خانۂ کعبہ میں کوئی نماز قضا نہیں کی تھی۔ وہ عملی طور پر اللہ کے گھر میں ہی رہتا۔

فون کال ہمیشہ کی طرح جنرل کی جانب سے اس خواہش کے اظہار کے ساتھ شروع ہوئی کہ وہ مکّہ میں حج کے دوران فوت ہو جائے اور قاضی کے قدموں میں دفن ہو۔ قاضی نے اسے یقین دلایا کہ اللہ اس کی یہ خواہش ضرور پوری کرے گا اور پھر اس سے فون کال کا مقصد پوچھا۔

'آپ کی مہربانی سے میں نے پاکستان میں نئے قوانین کا نفاذ کر دیا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے ہزاروں گناہ گاروں کو پہلے ہی سزا دی جا چکی ہے: ہمارے پاس دو سو چور ہیں جو اپنے ہاتھ کاٹے جانے کے منتظر ہیں، ہزاروں شرابیوں کو عوام کے سامنے کوڑے مارے جا چکے ہیں۔'

'اللہ آپ کی مدد کرے، اللہ آپ کی مدد کرے۔' قاضی بڑبڑاتا رہا۔

'ہمارے ہاں حال ہی میں سنگ سار کیے جانے کی ایک سزا سنائی گئی ہے اور میں نے اسی بارے میں کال کی تھی۔' جنرل ضیا زینب کا نام لینا نہیں چاہتا تھا۔

'اصلی امتحان تو اب ہے، یا اخی۔ اصلی امتحان۔' فون پر نوّے سال کے قاضی کی آواز بلند ہونے لگی۔ 'ہماری اس سعودی سلطنت کے حکم راں، اللہ ان کی حکومت قیامت

کے دن تک قائم رکھے، انھیں بھی یہ سزا دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ وہ چاہتے ہیں کہ سب کی نظروں میں اچھے بنے رہیں؛ ہر جمعے کی نماز کے بعد کھٹاک کھٹاک سر کاٹتے ہیں اور یہ جا وہ جا۔ وہ نہ صرف مجرم، بلکہ قانون کی روح کا بھی گلا کاٹ دیتے ہیں۔ لوگ صرف ناظر بن کر رہ جاتے ہیں۔ زنا تو معاشرے کے خلاف ایک جرم ہے اور لوگوں کو اس کی سزا پر عمل درآمد خود کرنا چاہیے۔ آپ یہ ذمّے داری کسی کرائے کے جلّاد پر ڈال کر یہ نہیں سوچ سکتے کہ آپ نے اللہ کی دی ہوئی ذمّے داری پوری کی ہے۔'

'جی، قاضی صاحب، میں اس معاملے پر آپ کی رہ نمائی حاصل کرنا چاہتا تھا: اگر کوئی عورت یہ کہے کہ اسے زنا پر مجبور کیا گیا تھا تو پھر کیا ہوتا ہے؟ ہم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ سچ بول رہی ہے یا نہیں؟ میرا مطلب ہے کبھی کبھار آپ کسی عورت کے چہرے پر ہی نظر ڈال لیں تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ زنا کار ہے، لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے قانونی تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔'

قاضی یوں بولا جیسے اس نے اس معاملے پر طویل عرصے سے سوچ بچار کر رکھی ہو۔ 'عورتیں جب بھی زنا کاری کرتی ہوئی پکڑی جائیں یہی بہانہ بناتی ہیں، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ زبردستی جماع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسا کرنے والے کو کم از کم چار ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی۔ کم از کم دو آدمی تو ایسے ہوں جو اسے بازوؤں سے پکڑے ہوئے ہوں، دو نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کر رکھی ہوں اور پانچواں آدمی اس کی ٹانگوں کے درمیان مصروفِ عمل ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ ہاں، ایک عورت سے زبردستی جماع کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک سنگین جرم ہے۔'

'تو کیا اس عورت کو عدالت میں اُن تمام مجرموں کو شناخت کرنا پڑے گا؟' ضیا نے پوچھا۔

'آپ جانتے ہیں کہ ہمارا قانون کوئی پتھر پر لکیر ہرگز نہیں، وہ ہماری حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ عقلِ سلیم استعمال کریں۔ اس لیے جو دو آدمی اسے بازوؤں سے پکڑے ہوئے تھے، ہو سکتا ہے عورت انھیں شناخت نہ کر پائے اور جج اس معاملے میں چھوٹ

دے سکتا ہے۔'

'اور اگر اس نے کسی مجرم کو بھی نہ دیکھا ہو تو؟ اگر انھوں نے نقاب پہنے ہوئے ہوں تو؟'

جنرل ضیا بتا سکتا تھا کہ بوڑھا آدمی یکایک غصّے میں آ چکا تھا۔

'کوئی زنا کار نقاب کیوں اوڑھے گا؟ کیا وہ بینک میں ڈاکا ڈالنے آیا ہے؟ نقاب تو بینکوں میں ڈاکا ڈالنے والے اوڑھتے ہیں۔ اغوا کار اوڑھتے ہیں۔ میں نے تو جج کی حیثیت سے اپنے چالیس سالوں میں کبھی نہیں سنا کہ کسی زنا کار نقاب اوڑھ رکھا ہو۔'

قاضی نے اپنی بات جاری رکھی اور جنرل ضیا خود کو بے وقوف محسوس کرنے لگا۔ اس مرتبہ قاضی کی آواز سرد مُہر، سرزنش کرتی ہوئی اور کسی استاد کی طرح تھی۔ 'زنا کار عورت کی آنکھوں میں خود اپنی شبیہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وہ واحد وجہ ہے جس کے باعث وہ کبھی نقاب نہیں اوڑھے گا۔' قاضی نے کہا۔

'اور اگر وہ عورت، جس کا ذکر ہو رہا ہے، اندھی ہو تو؟' جنرل ضیا نے پوچھا۔

ظاہر ہے قاضی کو جنرل ضیا کی گفتگو کے اس رُخ کی سمجھ نہیں آئی۔

'کیا آپ کا مطلب ہے اخلاقی طور پر نابینا یا پھر ایسی جسے اللہ نے دیکھنے کی طبعی طاقت سے نوازا ہی نہیں ہو؟'

'اندھی۔ ایک عورت جو دیکھ نہ سکتی ہو۔'

'قانون دیکھنے والوں اور دیکھ نہ سکنے والوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ چلیے قانونی دلیل کے طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس معاملے میں زنا کار بھی نابینا تھا، تو کیا اس صورت میں اسے کسی خصوصی استحقاق کا مستحق سمجھا جا سکتا تھا؟ اس لیے شکار، اندھا ہو یا نہ ہو، اسے بھی اسی تفتیش سے گزرنا ہوگا، اور اس کے حقوق بھی وہی ہوں گے۔'

'وہ اپنے زنا کار کو کیسے شناخت کرے گی اور دوسرے لوگوں کو جنھوں نے اسے پکڑ رکھا تھا؟'

'یہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے: اگر وہ شادی شدہ ہو تو اس کے شوہر کو عدالت میں ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اچھے کردار کی مالک ہے اور پھر ہمیں اچھے کردار کے مالک چار بالغ مسلمان مردوں کی ضرورت پڑے گی جنھوں نے وہ جرم ہوتا ہوا دیکھا ہو۔ اور چوں کہ زنا ایک سنگین جرم ہے اس لیے وقوعہ سے حاصل ہونے والے ثبوت اس بارے میں کافی نہیں سمجھے جائیں گے۔ ''ہم نے چیخیں سنیں اور ہم نے خون دیکھا اور ہم نے سنا کہ آدمی اسے ضربیں لگا رہا ہے'' ایسے ثبوت کافی نہیں ہیں؛ ایسے گواہ درکار ہوں گے جنھوں نے واقعی میں دخول ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔ اور اگر عورت شادی شدہ نہ ہو تو اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اس سنگین جرم کے ارتکاب سے پہلے وہ باکرہ تھی۔'

دوپہر کے کھانے تک جنرل ضیا بہت بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس نے قاضی کا قانونی مشورہ پہلے ہی اپنے چیف جسٹس تک پہنچا دیا تھا اور اب اپنے دماغ میں وہ تقریر تیار کر رہا تھا جو وہ کُل پاکستان پیشہ ور خواتین ایسوی ایشن کے سالانہ مینا بازار میں کرنے کے لیے خاتونِ اوّل سے کہنے والا تھا۔ اس نے پہلے تو اسے اس کا وعدہ یاد دلایا کہ وہ اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دیتی رہے گی اور پھر تقریر کے کچھ دلائل اس پر آزمانے کی کوشش کی۔ وہ پہلے تو خاموشی سے سنتی رہی لیکن جب وہ اس حصّے پر پہنچا جو زنا کی شکار عورت کی جانب سے اپنی دوشیزگی کے ثبوت کرنے سے مُتعلق تھا تو خاتونِ اوّل نے اسے ٹوک دیا۔

'کیا تم اندھی زینب کے کیس کی بات کر رہے ہو؟'

'ویل، ہاں، لیکن بنیادی طور پر ہم ایک قانونی نظیر قائم کرنا چاہ رہے ہیں جو عورتوں کے وقار کا تحفّظ کرے گی۔ تمام عورتوں کے وقار کا تحفّظ۔'

'میں قانون کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اگر قانون یہی کہتا ہے کہ میں تقریر کروں تو میں ضرور کروں گی۔' خاتونِ اوّل اپنی پلیٹ پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔ 'لیکن یہ عورت خود کو باکرہ کیسے ثابت کرے گی، جب مردوں کا ایک جتھا تین دن اور تین راتوں تک اس سے زیادتی کرتا رہا ہو؟'

۱۵

میں چکن قورمے کی خوش بو کا پیچھا کرتا ہوں اور کہنیوں کے بل چلتا ہوا دروازے تک جاتا ہوں۔ میں پلیٹ اُٹھاتا ہوں اور اسے واپس رکھ دیتا ہوں۔ پلیٹ گرم ہے۔ مجھے اچانک بہت بھوک محسوس ہوتی ہے۔ میں دروازے کی جانب پیٹھ کیے بیٹھ جاتا ہوں اور کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ میری دنیا ملائم شوربا ٹپکاتے مرغی کے نرم گوشت تک محدود ہو جاتی ہے۔ میرے دانتوں میں پھنس جانے والے مصالحے کے ذرّات بھی مجھے ایک خوش حال اور آزاد مستقبل کا شگون لگتے ہیں۔ میں نے اپنی پلیٹ آدھی ہی ختم کی تھی جب اینٹ باہر کو سرکائی گئی۔ میں اپنی پلیٹ سوراخ تک لے جاتا ہوں اور اپنی طرف کی اینٹ ہٹاتا ہوں۔

'میں دیکھنا یہ چاہ رہا تھا کہ انھوں نے تمھیں کھانا دیا یا نہیں، کیوں کہ کبھی کبھار یہ لوگ نئے آنے والوں کو بھوکا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ تم میرے کھانے سے حصّہ لے سکتے ہو۔ یہ ہے دال کا سوپ کنکریوں سے بھرا اور ففٹی ففٹی روٹی، یعنی جس میں آدھا آٹا ہے اور آدھی ریت۔ تمھارے فوجی باورچی بڑے مستقل مزاج ہیں۔ میں پچھلے نو برسوں سے یہی کھانا کھا رہا ہوں۔'

میں وہ احساسِ گناہ محسوس کرتا ہوں جو استحقاق یافتہ قیدی محسوس کرتے ہوں گے۔

میں اپنی پلیٹ ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔ 'نہیں۔ انھوں نے مجھے کھانا دے دیا ہے۔'

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ مستقبل قریب میں آزاد ہونے کے امکانات کی غیر موجودگی ماحول کو بھاری بنا رہی ہے۔ اچانک کھانے کی وہ گرم اور اچھی پلیٹ ایک طویل قید کا وعدہ نظر آنے لگتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں جیسے تہ خانے کی دیواریں میرے گرد اپنا حصار تنگ کر رہی ہوں۔

'تو تمھاری ہڑتال کام یاب ہوئی کہ نہیں؟' میں کسی بھی ایسے معاملے پر بات چیت کے لیے مرا جا رہا تھا جس میں خوراک کے معیار اور قلعے کے اس حصے میں تاریکی کا ذکر نہ ہو۔

'ہمارا آئیڈیا یہ تھا کہ عوام جب غلاظت کے اتنے زیادہ نہ اُٹھائے جانے والے ڈھیر دیکھیں گے تو ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔ لیکن کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہمارے لوگ ہر چیز کے عادی ہو جاتے ہیں، اپنی غلاظت کی بُو کے بھی۔'

'مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی نے تو نوٹس ضرور لیا ہوگا۔ ورنہ تم یہاں نہ ہوتے۔'

'ارے ہاں، تمھارے لوگوں نے نوٹس لیا تھا۔ جب خفیہ والوں کے کسی تجزیہ نگار کو احساس ہوا کہ مولوی لوگ ہماری صفوں میں نہیں گھس سکتے تو انھوں نے خود اپنا ماؤ نواز گروپ کھڑا کرنا شروع کر دیا۔' اس کی سرگوشی اچانک جان دار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ 'میں یہ بات پبلک میں نہیں کہوں گا، لیکن ماؤ نواز مولویوں سے بھی بُرے ہوتے ہیں۔'

مجھے نہیں معلوم کہ وہ ماؤ نوازوں کے بارے میں بات کیوں کیے جا رہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے اعتراف کے بعد میری جانب سے کسی ردِّعمل کا خواہش مند ہے۔ لیکن واحد ماؤ جسے میں جانتا ہوں وہ چینی باشندہ ہے جو ٹوپی پہنے نظر آتا ہے اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس کے لوگ پاکستان میں خاکروبوں کی یونین میں کیا کر رہے ہیں، بلکہ مجھے تو یہی نہیں پتا کہ پاکستان میں کیا کر رہے ہیں۔

'یہ درست لگتا ہے۔' میں بہت سوچ کر جواب دیتا ہوں۔ 'چین نے مُن زو کے بعد سے اب تک کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کی۔ وہ تو ہمیں جو فائٹر جیٹ دیتے ہیں وہ بھی اُڑنے

والے تابوت ہیں۔'

سیکرٹری جنرل صاحب اپنی دھرتی ماں کے فضائی دفاع کے معیار میں دلچسپی لیتے بالکل بھی نہیں لگ رہے۔

'میں نے اپنی کسانوں کی تحریک کا ٹھوس تجزیہ پیش کر کے انھیں کو ثابت کر کے دیا کہ ہمارے ذرائع پیداوار کو پیٹی بورژوا طے کرتا ہے، فیوڈل زمیں دار نہیں جیسا کہ ماؤ نواز سمجھتے ہیں، مگر یہ ماؤ نواز اپنے نظریے سے ہٹتے ہی نہیں۔ پاکستان میں کسانوں کا انقلاب آ ہی نہیں سکتا۔ تم اتفاق نہیں کرو گے؟' وہ مجھ سے اصرار کر رہا ہے کہ میں اس سے اتفاق کر لوں۔

'ہاں۔' میں نے کہا۔ 'ظاہر ہے۔ پاکستانی کسان خوش ہیں، کوئی یہاں بھوکا نہیں رہتا۔'

'تمھیں آرمی میں وہ لوگ یہی کچھ پڑھاتے ہیں؟ کہ ہمارے کسانوں کو اچھی خوراک ملتی ہے اور ہر رات سونے سے پہلے وہ اپنی بھری بھری فصلوں کے گرد خوشی میں بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ تم لوگ کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہو۔ یہ تو ماؤ نواز پروپیگنڈے سے بھی بھیانک چیز ہے۔'

'وہ لوگ ہمیں ایسی کوئی چیز نہیں پڑھاتے۔' میں کہتا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے۔

'بس اس لیے کہ میں وردی پہنتا ہوں، تم یہ سوچتے ہو کہ میں تمھارے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بھی اسی ملک کا ہوں، میں بھی دھرتی کا بیٹا ہوں۔ میرا تعلّق ایک کسان گھرانے سے ہے۔' میری یہ بات بالکل ٹھیک ہو سکتا ہے کہ نہ ہو، مگر شگری پہاڑ پر ہمارے پچھواڑے میں ہمارا ایک باغ ضرور ہے۔

'اپنا یہ سوڈو فیوڈل جارگن میرے سامنے استعمال مت کرو۔ ہمارے کسانوں کے ساتھ مسئلہ ہی یہی ہے۔ ماؤ نواز سمجھتے ہیں کہ ہم ایک زرعی معاشرے میں رہتے ہیں۔ لیکن ذرا ہمارے ذرائع پیداوار بھی تو دیکھو، ذرا زمین کی ملکیت کا پیٹرن تو ملاحظہ کرو۔ ہم

قبل زرعی، قبل فیوڈل دور میں رہتے ہیں۔ اور یہ ماؤ نواز کسانوں کے انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بورژوا رومانیت پسندی کی بدترین شکل ہے۔'

مجھے ان تفتیش کاروں کا خیال آتا ہے جن کا اُس سے پالا پڑا ہوگا۔ اُس نے انھیں بھی ایک دو چیزیں ضرور سکھائی ہوں گی۔ سیکرٹری جنرل صاحب نے میرے لیے اپنا سبق ابھی ختم نہیں کیا۔ 'کیا تم نے اس قید خانے میں کوئی ایک بھی کسان دیکھا ہے؟'

'تم واحد آدمی ہو جس سے میں یہاں ملا ہوں۔' میں کہتا ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہتا ہے، شاید اچانک یہ احساس کر کے کہ میں اُس جگہ بہت نیا ہوں اور یہ کہ وہ خود میرے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن ہماری بات چیت کے اس غیر متوازن پس منظر پر اس کی یہ خواہش غالب آ جاتی ہے کہ وہ اپنے دلائل مکمل کرے اور وہ مزید گویا ہوتا ہے۔

'کوئی نہیں ہے کسان یہاں۔ کوئی حقیقی کسان نہیں ہے۔ کوئی انقلابی کسان نہیں ہے۔ یہاں میں جن کسانوں سے ملا ہوں وہ اپنے جاگیرداروں کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے حق میں لڑ رہے ہیں۔ وہ اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وہ اس لیے لڑ رہے ہیں تاکہ ان کے جاگیردار انھیں اپنے شکنجے میں کسے رہیں۔ یہ لوگ میرے جیسے اور تمھارے جیسے ورکروں کی جینوئن طبقاتی جدوجہد کو سبوتاژ کر رہے ہیں۔'

میں سکون کا سانس لیتا ہوں۔ بالآخر مجھے اپنا لیا گیا ہے۔ میں ایک ورکر ہوں اور میری جدوجہد جینوئن قرار پائی ہے۔

'ہماری پارٹی کے منشور کے مطابق، ایک خاکروب اور ایک سپاہی میں کوئی فرق نہیں۔' میرا خیال ہے وہ ہمارے تعلق کے اصول و ضوابط کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔ 'یہ دونوں مزدور کے استحصال کی قسمیں ہیں جن پر فوج اور صنعت کاروں کا یہ پیچیدہ نظام چل رہا ہے۔'

مجھے ایک عمومی انداز میں ایک ورکر کہلائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرا

نہیں خیال کہ میں کوئی اچھا خاکروب بن سکوں گا۔

'کیا تم بھی خاکروب تھے؟' میں اس سے پوچھتا ہوں۔ 'میرا مطلب ہے سیکرٹری جنرل بننے سے پہلے۔'

'نہیں۔' وہ تنک کر کہتا ہے۔ 'میں آموں کا کاشت کار ہوا کرتا تھا، اس کے بعد میں نے خاکروبوں کو منظم کرنا شروع کیا۔'

'سیکرٹری جنرل صاحب، کیا میں ایک اختلافی نکتہ اُٹھا سکتا ہوں؟ مجھے شک ہے کہ تم کسانوں کے انقلاب کی اس لیے مخالفت کرتے ہو کیوں کہ تمھیں خطرہ ہے کہ سب سے پہلے وہ تمھارے ہی آموں کے باغ پر قبضہ کریں گے۔' میں ایک فاتحانہ لہجے میں کہتا ہوں، جیسے ہم دونوں کسی زیرِ زمین قید خانے میں نہیں بلکہ اس کی مرکزی مجلسِ انتظامی کے اجلاس میں بیٹھے ہوں۔ میں ایک گہری آہ بھرتا ہوں اور دھوئیں سے بھرے کمروں کا سوچتا ہوں جہاں ایش ٹرے بجھے ہوئے سگریٹوں سے چھلکی پڑ رہی ہوں۔

سیکرٹری جنرل ایک لمحے کے لیے خاموش رہتا ہے، پھر وہ اپنا گلا کھنکارتا ہے اور معذرت خواہانہ انداز میں بولنا شروع کرتا ہے۔ 'میں خود بھی ماؤ نواز ہوا کرتا تھا۔ میں نے ملک بھر میں آم کے باغوں کے مالکان کو منظم کیا تھا۔ میں ان کا بانی چیئرمین تھا۔ ایک سال کے اندر اندر ہم نے بھارت اور میکسیکو میں آموں کے کاشت کاروں سے اسٹریٹیجک الائنس کر لیا تھا۔ لیکن ہمارے ارکان اندر سے بورژوا تھے، ان میں سے ہر ایک طبقاتی جدوجہد کا دشمن تھا۔ وہ دن میں ہمارے اسٹڈی سرکل میں شرکت کرتے اور پھر رات کو تمھارے جرنیلوں کو مینگو پارٹیاں دیتے تھے۔ اگر وہ سمجھ داری سے کام لیتے تو ہم سرمایہ دارانہ نظام کی پوری دنیا میں کسانوں کی سب سے بڑی اشتراکی تنظیم بن سکتے تھے۔ اب اندازہ لگاؤ کہ سرمایہ دارانہ معیشت کو کتنی بڑی زک پہنچتی اس سے۔'

'سیکرٹری جنرل صاحب۔' میں اس کے پرتکلف انداز سے مخاطب ہوتا ہوں، 'کیا میں ایک اور اختلافی نکتہ ریکارڈ پر لا سکتا ہوں؟ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ آموں کی

قیمتیں فکس کر کے آپ سرمایہ دارانہ معیشت کو تباہ کر سکتے ہیں؟'

دوسری جانب خاموشی ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور جب انھیں دوبارہ کھولتا ہوں تو لگتا ہے کہ تاریکی کے ساتھ کچھ روشن دائرے مردہ ہوا میں رقص کر رہے ہیں۔

'مجھے یہ احساس تھا۔ اسی لیے میں نے خود کو ڈی کلاس کیا اور خاکروبوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ لیکن تمھاری فوج کے لوگ ان غریبوں سے بھی غریب لوگوں سے بھی ڈرتے ہیں جو تمھارے گٹر صاف کرتے ہیں۔' یہ کہہ کر اس نے اینٹ پھر سے دیوار میں رکھ دی۔

فرش پر لیٹے ہوئے میرا چہرہ زمین پر ہے اور بایاں رخسار ٹھنڈی ریت پر، بازو باہر کو پھیلے ہوئے اور ہتھیلیاں کھلی ہوئی۔ میں اپنے دماغ کو سوپیروں اور ماؤ نوازوں اور کسانوں اور روشن دائروں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سیکرٹری جنرل اتنا پڑھا لکھا لگتا ہے کہ گٹر میں بم رکھنے کا منصوبہ تو ایک طرف، کسی بھی قسم کی سازش اس سے بہت بعید لگتی ہے۔ اگر میں اسے اپنا پلان بتا دوں تو کیا وہ مجھ پر یقین کرے گا؟ شاید ہم ایک دوسرے کے نوٹس کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ شاید ہم ایک دوسرے کی ناکامیوں سے سیکھ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے تفتیش کاروں سے حاصل کردہ ٹپس کی ساجھے داری کر سکتے ہیں۔ اس کی جانب مکمل خاموشی ہے۔ میرا خیال ہے اب امن کی جانب بڑھنے کی باری میری ہے۔

میں باقی بچا ہوا کھانا اُٹھاتا ہوں اور اینٹ کو اس کی جانب دھکیلتا ہوں۔ 'میرے پاس یہاں تھوڑا چکن کا سالن ہے، اگر تمھیں پسند آئے تو۔' میں سرگوشی کرتا ہوں۔

میں اسے پلیٹ کو سونگھتے ہوئے سنتا ہوں۔ اس کا ہاتھ سوراخ میں داخل ہوتا ہے اور وہ پلیٹ کو میری جانب دھکیل دیتا ہے جس سے سالن میری شرٹ پر گر جاتا ہے۔ 'میں غداروں کا بچا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔' اینٹ پھر سے رکھ دی جاتی ہے، ایک حتمیت کے احساس کے ساتھ۔

میرا خیال ہے اب مجھے انقلاب کا حصہ نہیں بنایا جائے گا۔

میں اپنی شرٹ اتار دیتا ہوں اور تاریکی میں اسے اپنی گردن کے گرد لگی آنکھوں والی پٹی سے صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کی یونی فارم کی شرٹ پر سالن کے دھبے سے بری اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔

کسی کو میری اتنی فکر ضرور ہے کہ مجھے اچھا کھانا دیتا ہے لیکن اتنی فکر نہیں کہ مجھے آزاد کر دے یا کم از کم مجھے کسی ایک سیل میں ہی بند کر دے جس میں کوئی کھڑکی ہو۔

سیکرٹری جنرل نے میرے خیالات پڑھ لیے ہیں۔ اینٹ سرکتی ہے اور وہ ایسے بولتا ہے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ 'تمھیں پتا ہے اس قلعے میں سب سے خوب صورت چیز کون سی ہے؟ شیش محل یا دیوانِ عام نہیں۔ بالکل نہیں۔ ایک زیرِ زمین تہ خانہ ہے جس میں کھڑکی بھی ہے۔ انھوں نے مجھے وہاں رکھا تھا ایک مہینے کے لیے۔ وہاں سے آپ آسمان کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی کھڑکی قلعے کے باغ میں کھلتی ہے۔ وہاں چڑیاں سارا دن گاتی رہتی ہیں۔ وہ میری زندگی کا سب سے اچھا وقت تھا۔'

ایک قیدی جسے ایک اور قید خانہ بے طرح یاد آ رہا تھا! میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

'تو تم نے وہاں بند رہنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے کیا کیا۔ سازش میں شریک اپنے ساتھی خاکروبوں کے نام بتا دیے ہوں گے؟'

'تم نے پریڈ اسکوائر میں یہاں سے وہاں مارچ کرتے ہوئے اتنا وقت گزارا ہے کہ اب تم ظالم اور مظلوم کے درمیان تعلقات کی پیچیدگی کو سمجھنے سے قاصر ہو۔'

'تو سکھا دو نا۔'

'انھوں نے مجھ سے تفتیش کے لیے اپنا بہترین آدمی بھیجا۔ ضیا کا دایاں ہاتھ۔ کرنل شگری۔ پہلے ہی دن اس نے میرے نازک اعضا کے ساتھ بجلی کی تاریں لگا دیں، لیکن جب وہ مجھے توڑ نہیں سکا تو وہ میرا دوست بن گیا۔ اس نے مجھے کھڑکی والے سیل منتقل کیا۔ بہت اچھا آدمی تھا۔ اب تک جنرل بن گیا ہوگا وہ۔'

یہ سوچنا کہ جن ہاتھوں نے آپ کو گود میں جھولا جھلایا ہو وہ کسی کے خصیوں کے

ساتھ بجلی کے تار بھی باندھ سکتے ہیں، کچھ خوش گوار نہیں۔ میرے جسم میں نفرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ میرا معدہ ابکائی کرنے کو آتا ہے۔

'اس کے ٹرانسفر کے بعد انھوں نے مجھے اس تہ خانے میں ڈال دیا۔ وہ ڈائیلاگ پر یقین رکھتا تھا۔ خاکی وردی میں وہ واحد آدمی تھا جس کے ساتھ میری اچھی بات چیت ہوئی۔ پتا نہیں اسے پروموشن ملی یا۔۔'

'وہ مر چکا ہے۔ اس نے خود کو پھندا لگا لیا۔' میں چاہتا ہوں کہ سیکرٹری جنرل اپنا مُنھ بند کر لے۔ اور کچھ لمحوں کے لیے وہ کر بھی لیتا ہے۔

'وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں تھا۔۔' سیکرٹری جنرل کی جذبے سے چور آواز سنائی دیتی ہے۔

'مجھے پتا ہے۔' میں بے پروائی سے کہتا ہوں۔'انھوں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے خود کو پھانسی لگائی ہو۔'

'تمھیں کیسے پتا چلا؟ انھوں نے تمھاری اتنی برین واشنگ کر دی ہے کہ وہ جس بات پر چاہتے ہیں تم سے یقین کروا لیتے ہیں۔' اس کا یہ مسترد کر دینے والا لہجہ مجھے پسند نہیں آتا۔

'صرف اس لیے کہ میں نے وردی پہنی ہوئی ہے، صرف اس لیے کہ انھوں نے مجھے کھانے کے لیے چکن کا سالن دیا ہے، تم یہ سمجھتے ہو کہ میں کوئی بے وقوف ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں وردی میں ملبوس ایک اور احمق ہوں۔ میری بات سنو مسٹر سیکرٹری جنرل، مجھے تمھارے لیکچروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ زندگی میں کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہے جنھیں حقائق کہا جاتا ہے، جنھیں میرا خیال ہے کہ تم قابلِ مشاہدہ حقائق کہتے ہو۔ مجھے کسی مزاحیہ ٹوپی پہنے ہوئے چینے کی لکھی ہوئی کوئی ریڈ بک پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی مجھے یہ جاننے کے لیے کسی کمیونسٹ پمفلٹ کی ضرورت ہے کہ میری زندگی کی حقیقتیں کیا ہیں۔ میں انھیں اپنے لیے خود تلاش کر سکتا ہوں۔'

میں اینٹ زور سے رکھ کر دیوار بند کر دیتا ہوں اور خود سے کہتا ہوں کہ یہ معاملہ ختم

ہوا۔ مجھے کسی سویلین پاگل سے لیکچر سننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور چریا مجھے یہ بتائے کہ کرنل شگری نے اس کی زندگی تبدیل کر دی۔

شرٹ اتار کر میں پیٹھ کے بل فرش پر سو جاتا ہوں۔ میری ننگی کمر کے نیچے ریت اور پتھر اچھے محسوس ہو رہے ہیں۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں ریت بھر لیتا ہوں اور ان سے ریت کی گھڑی کا کھیل کھیلتا ہوں؛ میں ریت کو اپنی ہتھیلیوں سے آہستگی کے ساتھ نکلنے دیتا ہوں اور دونوں ہاتھوں سے ریت کے نکلنے کی رفتار میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ کام مشکل تو ہے، لیکن مشق کے لیے میرے پاس بہت وقت ہے۔

''آپ کے پیچھے ایک Blind Spot ہے''، سالانہ فلائیٹ سیفٹی ویک کے موقع پر لگے ہوئے بہت سے بینروں میں سے ایک سرخ بینر نے اعلان کیا۔ ''چھپے ہوئے خطرات نقصان دہ ہیں''، ٹارمک پر ابھرے ہوئے نارنجی حروف چلّائے۔ رن وے کے وسط میں ایک نئی اور چمک دار ٹیک آف لائن بنائی گئی تھی اور طیارے کے ٹیکسی کرنے کے راستے میں پیلے رنگ سے نئی حد بندی کی گئی تھی۔ ونڈ بیگ پر بنے ہوئے، پرانے ہوتے ہوئے، مرغے کو بھی نئی سنہری کلغی فراہم کی گئی تھی۔

'ہمارے مہمان بور ہو رہے ہوں گے۔ اپنی اگلی پرواز پر انھیں جوائے رائیڈ پر لے چلو۔' کمانڈانٹ نے اس سال کی فلائیٹ سیفٹی مہم کے موٹو پر مشتمل تختی کی نقاب کشائی کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔ موٹو یہ تھا: سیفٹی تو نظارہ بین کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

'شوق سے۔' بینن نے کہا۔ 'تم یہ جو پائلٹ بن کر فضول سے کام کرتے ہو ان میں سے کچھ مجھے بھی دکھاؤ۔'

میں نے کہا، ''کل میں تمھارے لیے آسمانوں میں پکنک کا بندوبست کروں گا۔''

یہ وقت تھا کہ کرنل شگری کے ماضی پر کچھ سیفٹی چیک آزمائے جاتے۔

میں نے اس شام کے لیے انکل سٹارچی کی خصوصی اشیاء میں سے ایک کا آرڈر دیا

تھا۔ انکل ستار جی نے اپنی شرٹ کے اندر سے ایک مُڑا تُڑا سگریٹ نکالا: 'ہر روز ایک پیو تو تمھیں کبھی سر درد ہوگا نہ تمھاری بیوی کو کبھی تم سے شکایت ہوگی۔'

میں نے سگریٹ کو سیدھا کیا اور اسے اپنے فلائیٹ سوٹ کی آستین پر بنی چھوٹی سی جیب میں ڈال لیا۔

'انکل، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ حد ہے یار، یہاں کوئی بھی شادی شدہ نہیں۔'

'تیاری۔ تیاری۔' وہ اپنے گدھے کو کوڑا لگانے سے پہلے بڑبڑایا اور پھر دھونے والے کپڑوں کی گٹھڑیوں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔

بینن ایک نارنجی رنگ کا اسکارف، ایک فلائنگ جیکٹ اور ایک بیس بال کیپ پہنے برآمد ہوا۔ اس کی کیپ پر گنجا عقاب بنا ہوا تھا۔ جب میں پری فلائیٹ چیک میں مصروف تھا اور ٹیک آف کی تیاری کر رہا تھا، تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ لگتا تھا کہ کاک پٹ کا سائز دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی تھی، لیکن اس نے کنوپی پر اپنا ہاتھ پھیرا اور کہا، 'چھوٹا سا پیارا سا پرندہ۔' اپنی سیفٹی بیلٹ لگانے کے بعد اس نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ پھیرا اور پھر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

'پیراشوٹ کوئی نہیں؟' اس نے کہا۔

'فکر مت کریں۔' میں نے کہا۔ 'ہمیں ان کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'

سیفٹی۔۔۔ یہاں، وہاں اور اوپر ہوا میں، ایک اور بینر نے رن وے کے اختتام پر ہمیں خوش آمدید کہا جب ہم نے ٹیک آف کیا اور ٹریننگ ایریا کی جانب پرواز شروع کی۔

بادلوں سے صاف آسمانی رنگ کے آسمان کے پس منظر میں ہمارا دو نشستوں والا ایم ایف سترہ طیارہ لگتا تھا کہ حرکت ہی نہیں کر رہا، یا جیسے کسی ایوی ایشن میوزیم میں غیر مرئی دھاگوں سے لٹکا ہوا تھا۔ یہ ان نایاب دنوں میں سے ایک دن تھا جب ہوا نہ سامنے سے آ رہی ہوتی ہے نہ پیچھے سے۔ ہمارے نیچے پاکستان کی سرزمین کا تناسب ایسا

تھا کہ کسی کی بھی سانسیں روک دے، سبزے کے ہرے ہرے قطعات کو چوڑے چوڑے دریاؤں نے تقسیم کر رکھا تھا جو سورج کی شفیق شعاعوں کو منعکس کر رہے تھے۔

'تم سفید اور سیاہ وادی دیکھنا چاہتے ہو؟'

بینن اپنی نشست پر اکڑا ہوا بیٹھا تھا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ میری ہوابازی کی صلاحیت پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔

'میں ان اڑتے گھومتے ہوئے پرندوں میں اپنے ایسے بہت سے آدمیوں کے ساتھ پرواز کر چکا ہوں جو اب اس دنیا میں نہیں۔ بہت سی یادیں آ رہی ہیں۔' اس نے اپنی سیفٹی بیلٹ میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

'یہ کوئی ہیلی کاپٹر نہیں اور میں ابھی مرا نہیں۔' میں نے اسے خوش کرنے کے لیے اس کی نقل اُتاری۔ اس نے نروس سا ہو کر ایک زبردستی کی مسکراہٹ دی۔ 'یہ دیکھیں۔ میرے پاس آپ کا پسندیدہ نشہ ہے۔' میں نے اپنی جیب سے سگریٹ کا ٹکڑا نکالا اور اسے بینن کی جانب بڑھایا۔ 'مشقیں کرنے کے لیے دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوں۔' میں نے اپنے ماؤتھ پیس میں کہا، گیئر کو پیچھے کی جانب کر کے پرسکون کر دیا اور کنٹرول کے بٹن پھر سے دیکھے۔ اب طیارہ مناسب رفتار سے اوپر اُٹھ رہا تھا اور ہم اپنی نشستوں پر پیچھے کی جانب دھنس چکے تھے۔ جی میٹر پر ایک اعشاریہ پانچ کی ریڈنگ آئی اور کثافتِ اضافی ہمارے رخساروں کو ہلکا ہلکا چھونے لگی۔

بینن وہیں بیٹھا رہا، اسے اب بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ اسے خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔ شروع کریں، میرے مہمان ہیں آپ۔' میں نے کہا۔ 'سیفٹی تو نظارہ بین کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔' میں نے ایک لائٹر نکالا، اپنا بایاں ہاتھ سیدھا کیا، اس کی طرف والی گلاس کنوپی کی جانب کر کے لائٹر کا ایئر وینٹ دھپ سے کھولا اور سگریٹ سلگا لیا۔ طیارہ ہلکا سا لڑکھڑایا، اس کی لرزش کا پیٹرن تبدیل ہوا اور ہوا کو اکیس سو چکر فی منٹ کے حساب سے کاٹتے چلے جانے والے پروپیلر کی آواز اندر آنے لگی۔

سیاہ و سفید پہاڑی سلسلہ ہمارے بائیں جانب ظاہر ہوا۔ سیاہ پہاڑیاں چیڑ کے گہرے سبز درختوں اور گھنی بوٹیوں سے ڈھکی تھیں، جبکہ سفید پہاڑیاں ایک بھورے سے بنجر کنارے کی ایک قطار سی بنائے ہوئے تھیں۔ ایلٹی میٹر پر چھ ہزار فٹ کی ریڈنگ آئی اور پروپیلر نے افق سے ذرا اوپر کی جانب اشارہ کیا؛ گائے کی شکل کا ایک بادل ہمارے طیارے کے دائیں پر کو چٹکی لے رہا تھا، پھر وہ نیچے کو جھکا اور غائب ہو گیا۔ بینن نے اپنی پریشانی میں دو طویل کش لے کر سگریٹ آدھے سے زیادہ ختم کر دیا۔ کاک پٹ ائرکرافٹ فیول اور حشیش کے دھوئیں سے بھر گیا۔ میں نے اپنا سانس روکا۔ جہاز کی سیفٹی کا ذمے دار میں تھا۔ اس نے سگریٹ کا آخری بچ جانے والا ٹکڑا میری جانب بڑھایا۔

'مشین جانتی ہے اسے کون اُڑا رہا ہے۔' میں نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں نے ایک پتھریلی سی ہنسی ہنسی۔

'کچھ مستی کریں؟' اور جواب کے انتظار کے بغیر میں نے جہاز کو تیس ڈگری تک غوطہ دیا، اپنے ایلی رونز کو گھمایا، دائیں رڈر کی جنبش دی اور گیئر کو دائیں جانب موڑ دیا۔ بینن نے اپنی نشست سے اچھلنے کی کوشش کی لیکن جہاز اسے نیچے کی جانب زور سے کھینچ رہا تھا اور کثافتِ اضافی نے اسے اس کی نشست پر جما کر رکھ دیا۔ جہاز کا دایاں پر اوپر اٹھتا رہا اور پھر جلد ہی ہم الٹے ہو گئے، اور اپنی سیفٹی بیلٹوں سے بندھے رہ گئے۔ میں نے جہاز کو وہیں رکھنے کی کوشش کی اور انٹرکام کا بٹن دبایا۔

'کرنل شگری کی پھرکی کس نے گھمائی؟'

دنیا کو دیکھنے کے لیے وہ ایک شان دار نکتۂ مقام تھا؛ ہمارے پیر آسمان کی جانب اشارہ کر رہے تھے، گردن اکڑی ہوئی تھی اور آنکھیں زمین کی جانب گھور رہی تھیں، بالکل ویسے ہی جیسے میں شگری پہاڑ پر اپنے پچھواڑے میں سیر کے درخت سے الٹا لٹک جایا کرتا تھا۔

'فک۔' بینن نے کہا، اس کی آواز انٹرکام پر دھات سے بنی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ 'سیدھا کرو اس کو۔'

میں اس کا حکم بجا لایا۔ میں نے گیئر کو بائیں جانب سکون دیا اور دائیں رڈر کو پُش کیا؛ جہاز نے ایک پورا چکر کاٹا۔ میں نے ایلٹی میٹر چیک کیا۔ چھ ہزار فٹ۔ ہم نے بالکل یہیں سے یہ سب شروع کیا تھا۔

'مزا آیا؟' میں نے بینن کی جانب دیکھا، جبکہ میرا بایاں ہاتھ ٹرم میٹر کے ساتھ مصروف تھا۔ بینن کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ اس نے ڈکار لی تو کاک پٹ میں کوکا کولا اور آدھے ہضم شدہ آملیٹ کی بُو پھیل گئی۔

'خدا کی پناہ دو آدمی ایک دوسرے سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر حساب برابر کر رہے ہیں۔'

ٹاور کچھ سیکنڈوں تک بڑبڑاتا رہا۔

'روجر۔' میں نے سنے بغیر کہا۔

بینن بول رہا تھا۔

'ہمارا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ میں نے کچھ سنا تو ضرور لیکن وہ سب بکواس تھی۔ تمھیں پس منظر دیکھنا پڑے گا اور اس معاملے میں پس منظر یہ تھا۔' اس نے نظر نہ آنے والے نوٹوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے گنا۔ 'بہت سے ملا لوگ افغانستان جا رہے تھے۔ کمیونزم کے خلاف یہ سارا جہاد اور کچھ نہیں تھا بس روکڑے کا کھیل تھا۔ مجاہدین کو اپنے ڈالروں سے عشق تھا، تم تو جانتے ہو۔ اور ہاں ہم نے انھیں ارجنٹائن سے خچر اور مصر سے اَیک اَیک بندوقیں اور چین سے اے کے سینتالیس رائفلیں اور نواڈا سے سٹنگر میزائل لا کر دیے لیکن ان کے ساتھ جو چیز واقعی کام میں آئی وہ ڈالر تھے۔ یاد رہے کہ یہاں میں ان کے مقصد پر سوال نہیں اُٹھا رہا۔ تمھارا اوسط مجاہد ایک کاندھے پر شال اور دوسرے پر راکٹ لانچر رکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہے، اس سے بہتر گوریلا جنگ جو ہمیں نہیں ملا۔ خدایا، میں ان میں سے کچھ کو ویت نام میں ضرور استعمال

کرتا؛ لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کی قیادت کے، ان کے کمانڈروں کے دبئی میں بنگلے بنے ہوئے ہیں اور ہانگ کانگ میں ان کے کزن تجارت کر رہے ہیں، میرا مطلب ہے کہ کسی نے حساب کتاب ہی نہیں رکھا ہوا چیزوں کا۔ اگرچہ پیسہ ان کا بنیادی مقصد نہیں تھا، لیکن پھر بھی مجاہدین اپنے ڈالروں سے پیار کرتے تھے۔ لیکن پیسے سے پیار تو تمھارے فوجی افسر بھی کرتے ہیں اور اگر ایسی صورتِ حال میں کچھ ڈالر اِدھر سے اُدھر ہو جائیں تو یہ تو فطری امر ہے۔'

وہ اب تک اپنے سگریٹ کا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ میں نے وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لیا اور ائر وینٹی لیٹر سے باہر پھینک دیا؛ خلا میں رقص کرنے سے پہلے وہ غبارے کی طرح ایک دم سے اوپر سا اُٹھا۔

'اپنے تجزیے سے مجھے معاف ہی رکھیے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کرنل شگری ان لوگوں میں سے تھے جنھیں تمھارے ڈالروں کی خواہش تھی؟'

ابا کے جنازے کے اگلے دن ان کا بینک منیجر میرے پاس آیا تھا اور ان کا اکاؤنٹ میرے نام کر دیا تھا۔ ان کے کریڈٹ میں پورے تین سو بارہ روپے تھے۔

'ارے نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں یہ الزام بالکل بھی نہیں لگا رہا۔'

مین نے گیئر بائیں گھمایا، اور دائیں رڈر کو ہلایا تاکہ جہاز کہیں اور جانے سے باز رہے۔ میں بینن کے چہرے پر اچھی طرح نظر ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور کاک پٹ سے باہر سیاہ وادی میں جھانکنے لگا جہاں کسی مہم جو کمینے نے ایک پہاڑی راستے پر چیڑ کے تمام پیڑ کاٹ ڈالے تھے اور اس کی جگہ پتھروں پر سفیدی پھیر کر لکھا ہوا تھا: مردِ مومن، مردِ حق، ضیاء الحق، ضیاء الحق۔

'میں غور سے سن رہا ہوں۔' میں نے پہاڑیوں کے کنارے سے کنی کتراتے ہوئے کہا۔ میں اسے اردو کا کوئی سبق دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا نہ اس کے لیے یہ وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ مردِ مومن ایک سیاہ وادی کے ساتھ لگی پہاڑی کی چوٹی پر کیا کر رہا تھا۔

تمھیں پتا ہے کہ کرنل شگری کے ہاتھوں سے کتنا زیادہ پیسہ گزر رہا تھا؟ ہارڈ وئر پر قیمت لکھی ہی نہیں جاتی تھی، انسانی امداد کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ بس ملا لوگ سیمسونائٹ بریف کیس لیے گھومتے تھے۔ تیس کروڑ ڈالر نقد رقم ہر سہ ماہی میں آتی تھی۔ اور یہ میں بات کر رہا ہوں امریکا کے ٹیکس دہندگان کے پیسے کی، اس میں سعودی عرب کا شاہی خزانہ تو شامل ہی نہیں۔ اب اس میں سے ڈھائی کروڑ ڈالر غائب ہو گئے، اور یہ بات تمھیں میں دل پر ہاتھ رکھ کر بتا رہا ہوں، ویسے تو یہ ایک بڑی رقم لگتی ہے لیکن حقیقت میں تھی نہیں۔ ہماری طرف تو کسی نے اس معاملے پر آنکھ تک نہیں جھپکی۔ بھئی جب آپ ہٹلر کے بعد سے اب تک اپنے سب سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہوں تو ریزگاری تھوڑا ہی گننا شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن۔ تم لوگوں کے لیے ڈھائی کروڑ ڈالر بہت بڑی رقم ہے۔ تم اپنے والد کو مجھ سے بہتر جانتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے اپنے ستاروں والی وردی اور اپنے سخت اصول بہت عزیز تھے لیکن وہ آدمی اسکاچ بھی پسند کرتا تھا، وہ اپنی خاتون ساتھیوں کو بھی پسند کرتا تھا، اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتے۔' میں نے آنکھیں جھپکائے بغیر اسے گھور کر دیکھا۔ 'دیکھو، صاحب، میں آپ سے جو کہنا چاہتا ہوں وہ بس یہ ہے: مجھے نہیں معلوم اور آپ کو بھی نہیں معلوم کہ سوئٹزر لینڈ کی ایک طوائف کتنے پیسے لیتی ہے۔ لیکن وہ یقیناً ڈھائی کروڑ امریکی ڈالر تو نہیں لیتی ہو گی نا۔'

'کیا میں ایک ایسا آدمی لگتا ہوں جسے ڈھائی کروڑ ڈالر وراثت میں مل گئے ہوں؟'

اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا، اور اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ میں اس سارے معاملے کو ذاتی نقطۂ نظر سے کیوں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ سے ٹٹول کر پچاس ڈالر کا ایک مُڑا تُڑا نوٹ نکالا۔ 'بس یہی ہے میرے پاس۔' میں نے نوٹ اس کی گود میں پھینک دیا جہاں وہ ایک غیر ثابت شدہ الزام کی طرح پڑا رہا۔

میں نے سوچا کہ مجھے اسے بتا دینا چاہیے کہ اس رقم کو ٹھکانے لگانے میں ابا کی مدد میں نے کی تھی۔ بینن مجھ پر کبھی اعتبار نہ کرتا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور ریڈیو کا

بٹن دبا دیا۔ 'فیوری نو، اب میں ریڈیو سائلنس ڈرل شروع کر رہا ہوں۔'

میں نے گیئر کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس میں مزید آگے جانے کی گنجائش نہ رہی، بایاں رڈر اندر گھمایا؛ جہاز نوز ڈائیو کرنے لگا اور اس کے پر تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پر رقص کرنے لگے۔ جہاز تینوں محوروں پر گھومتا ہوا نیچے کو جا رہا تھا۔ جہاز کی ناک جہاز کی دم کا پیچھا کر رہی تھی، اس کے پر کسی بلینڈر کے بلیڈ کی طرح گھوم رہے تھے؛ منفی کششِ ثقل ہمارے معدوں کو ہمارے حلق کی جانب کھینچ رہی تھی۔ کھیتوں کے سبز قطعے اور چمکتی ہوئی سیدھی نہریں رقص کر رہی تھیں اور ہر گھمن گھیری کے بعد زیادہ بڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے بینن کی جانب دیکھا۔ وہ ہوا میں ہاتھ مار رہا تھا، اور اس کا چہرہ ایک دبائی ہوئی چیخ کی تجسیم بن چکا تھا۔

اچھا؟ تو جب میں اپنی پبلک اسکول کی تعلیم میں ابا کی سرمایہ کاری کو درست ثابت کرنے کے لیے صبح کو پانچ پانچ بجے اُٹھ رہا تھا اور اپنی گرمیوں کی چھٹیاں اپنے لیے جسمانی مشقیں ایجاد کر کر کے گزار رہا تھا، میرے ابا جنیوا میں بیٹھے طوائفیں تاڑ رہے تھے؟

بینن بکواسیات کا بادشاہ تھا۔

الٹی میٹر پر دو ہزار فٹ کا عدد سامنے آیا۔ میں نے تھروٹل کو کاٹ دیا، دائیں ہاتھ کے رڈر کو اندر کھینچا، گیئر کو واپس لا کر سکون دیا اور جہاز آہستگی کے ساتھ ایک قوس بناتا ہوا اوپر جانے لگا۔ سبز قطعے پھر سے پسپا ہونے لگے۔ بینن کی آواز ڈری ہوئی اور کھردری تھی۔

'کیا تم ایک امریکی کو مارنے کی کوشش کر رہے ہو؟'

'میں صرف بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔' میں نے ریڈیو بٹن آن کر دیا اور ائر ٹریفک کنٹرول کو ایک کال دی۔ 'ریڈیو سائلنس آؤٹ۔ سپن ریکوری مکمل۔'

بینن نے نپی تلی آواز میں بولنا شروع کیا، جیسے کہ وہ اپنی پسندیدہ پھپھی کے جنازے پر تقریر کر رہا ہو۔

'اس معاملے میں اس کے لیے کوئی کیس افسر متعین نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا سا انتظام تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ وہ کچھ اچھے آدمیوں میں سے ایک ہے، اور میرا یقین مانو کہ ان میں اچھے آدمی اتنے زیادہ نہیں تھے۔ ہم برباد ہو گئے۔ میں اس وقت اس سب میں ملوث نہیں تھا۔ میں تو جنوبی ایشیا ڈیسک پر بھی نہیں تھا بھئی، لیکن میں ایسے کچھ آدمیوں کو جانتا تھا جنھوں نے اس کے ساتھ کام کیا تھا اور وہ ان دنوں بیئر کے گلاس چڑھا چڑھا کر رویا کرتے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ اور ایسی بات نہیں ہے کہ کسی نے اس پر شور شرابا بھی نہیں کیا، لیکن وہ سب شور شرابا اس بات پر تھا کہ ہمیں راستے پر چلتے رہنا چاہیے اور آگے بڑھنا چاہیے، یہ جو سفارتی گند ہوتا ہے وہی۔'

'تو کسی نے یہ سب جاننے کا تردد نہیں کیا؟'

'نہیں، انھوں نے نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے۔ احکامات اوپر سے آئے تھے۔ سمجھ لو کہ وہ کشتی کا توازن بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میرا مطلب ہے یہ کوئی راز تو نہیں۔ شٹ، یقیناً تم جانتے ہی ہو۔ بہت ٹاپ سے آئے تھے احکامات۔' اس نے سفید پتھروں سے بھری سیاہ پہاڑی کی جانب ہاتھ ہلایا۔ کہا 'مردِ حق۔'

مجھے اردو پر اس کی گرفت پر خوش گوار حیرت ہوئی۔ میں نے اس کے کاندھے پر تھپکی دی اور اس کی طرف تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ 'تو اب تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'

'شٹ۔ میں صرف ایک سائلنٹ ڈرل انسٹرکٹر ہوں۔ تم جانتے ہو ہمارے رولز۔'

میں ایک لمحے کے لیے چپکا بیٹھا رہا۔ 'اس سارے معاملے کا ذکر میٹنگز میں، میموز میں آیا ہوگا۔ آخر وہ سب سے بہترین آدمی تھا تمھارا۔' میں نے گیئر کو بائیں گھمایا اور جہاز کی لینڈنگ کے لیے تیاری شروع کی۔

'ارے تو انھیں کیا کہنا چاہیے تھا؟ یہ کہ ارے ارے روکو ذرا یہ سرد جنگ، ہمارا بھینگی آنکھوں والا مردِ حق ہمارے طے کردہ ضوابط کے مطابق جنگ نہیں لڑ رہا؟ لیکن میرا

اعتبار کرو بھائی، یہ سب اندازے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے اندازے جو لینگلے میں بیٹھے ان لوگوں نے کیے جو تمھارے والد سے پیار کرتے تھے، لیکن تھے تو وہ اندازے ہی نا۔ کسی کو اصل بات کا علم نہیں تھا۔ یہ سب بہت نچلے لیول کا معاملہ تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ ٹریگر کس نے دبایا۔'

'اگر وہ اپنے مُنھ میں اپنی گن کا بیرل رکھ لیتا تو یہ بات سمجھ میں بھی آنے والی تھی۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔ لیکن وہ تو اس کے اپنے بستر کی بیڈ شیٹ نکلی۔' میں نے کہا اور اس کے بعد ٹاور سے لینڈ کرنے کی اجازت طلب کی اور ائر ٹریفک کنٹرول کو یہ اطلاع دی کہ میرے پاس جہاز میں ایک ائر سک مسافر موجود ہے۔

تہِ خانے میں سیکرٹری جنرل کی سرگوشیاں گونج رہی ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اس پر غشی طاری ہے یا وہ مجھے محظوظ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ 'کامریڈ، میرا خیال ہے کہ میں اندھا ہو چکا ہوں۔ میں کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا۔' میں خود اپنی آنکھیں مسلتا ہوں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اندھا نہیں ہوں۔ 'میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا۔ وہ کھانا لایا، اُس نے دروازہ کھولا لیکن میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ ایک بھی چیز نہیں۔'

'غالباً اب رات کا وقت ہے، کامریڈ۔' میں ایک جماہی کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ یاد ہے تمھیں کہ دن کے بعد رات آتی ہے؟ رات، دن، اور اس کے بعد پھر رات۔

۱۶

جب انٹر سروسز انٹیلی جینس کا انسدادِ جاسوسی یونٹ آرمی ہاؤس کے لونگ کوارٹرز کی ہفتہ وار تلاشی کے دوران کسی بگ یا جام کرنے والی ڈیوائس کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو چکا تو بریگیڈیئر ٹی ایم نے اس احاطے کی پرانے طریقے سے اور دستی تلاشی شروع کی۔ اس نے صوفے کے تکیوں پر سے برگنڈی رنگ کے ریشمی کوَر اتارے اور ان کی مخملیں سلائی کے ساتھ ساتھ اپنی انگلیاں پھیریں۔ اس نے اسی رنگ کے پردوں کو اچھی طرح ہلایا، بھورے رنگ کی ریشمی جھالروں کو انگلیوں سے کنگھی کی اور پردوں کے سنہری رنگ کے ہولڈ بیک کو شک سے دیکھنے لگا۔ ایرانی قالین جنھیں افغان مجاہد کمانڈروں نے افغان بادشاہوں کے محلات سے لوٹا اور جنرل ضیا کو پیش کیا تھا، ایک ایک کر کے ہٹائے گئے اور ٹی ایم نے اپنے جوتوں سے سرمئی رنگ کی سنتھیٹک ٹائلوں میں کوئی ناہموار سطح تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ٹیبل لیمپ، جن میں چمک دار پیتل اور ریشمی تاروں سے جڑے سوئچ لگے تھے، بار بار آن اور آف اور پھر آن کر کے دیکھے گئے۔

بریگیڈیئر ٹی ایم کا آئی ایس آئی پر عدم اعتماد اس سادہ سے اصول پر منحصر تھا: چور اور سپاہی کی تنظیم الگ الگ کی جانی چاہیے۔ اسے آئی ایس آئی سے شکایت یہ تھی کہ ہر کام انھی لوگوں سے لیا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے بگ ڈٹیکٹر اور اسکینر کی مدد سے لونگ کوارٹرز کی تلاشی لینے اور اِدھر اُدھر کچھ کرسیوں کو تھپکیاں دے کر بڑے آرام سے ایک دستاویز پر

دست خط کر دیے تھے اور کہا تھا کہ وہاں جاسوسی کا کوئی آلہ دریافت نہیں کیا گیا۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کو نہیں معلوم تھا کہ وہ ان دستاویزات پر یقین کر سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے صدر کے متوقع قاتل جب اپنے ہدف کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو وہ بیانِ حلفی پر دست خط تو نہیں کرتے پھرتے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنا اسٹاف اینڈ کمانڈ کورس کر رکھا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ کسی ملک کو انٹیلی جینس سروس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے، مسلح افواج کو خود اپنے جوانوں اور افسروں کی جاسوسی کے لیے جاسوسوں کی ضرورت کیوں ہوتی ہے، لیکن آپ کسی ایسے آدمی پر بھروسا کیسے کر سکتے ہیں جس نے وردی ہی نہ پہنی ہوئی ہو؟ بریگیڈیئر ٹی ایم آئی ایس آئی کو بدعنوان پاکستانی پولیس اور ست سعودی شہزادوں ہی کے مساوی ایک مصیبت سمجھتا تھا، لیکن چوں کہ اس کا کام تھا کہ دیکھتا جائے اور خاموش رہے اس لیے اس نے جنرل ضیا کے سامنے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ ٹرافیاں رکھنے والی کیبنٹ کی چھان پھٹک کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آرمی ہاؤس میں اتنے زیادہ سامان کی موجودگی ہی سیکیورٹی کا خطرہ ہے۔ 'ان ساری تصویروں کی ضرورت ہی کیا ہے؟' وہ ایک دیوار کے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر ان سابق جرنیلوں کی تصویریں لگی تھیں جنھوں نے ملک پر حکومت کی تھی۔ بریگیڈیئر ٹی ایم یہ نوٹ کیے بنا نہ رہ سکا کہ وہ جرنیل دن بہ دن موٹے ہوتے چلے جا رہے تھے اور ان کے سینوں پر میڈل کی تعداد بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ تصویروں کی قطار کے آخر تک آیا اور ایک بڑے سے پورٹریٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس آئل پینٹنگ میں پاکستان کے بانی محمد علی جناح سیول رو کا ایک ترشا ترشایا سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ایک دستاویز کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ اپنی بائیں آنکھ پر یک چشمی عینک لگائے اور انتہائی شدت سے غور کرتی ہوئی نگاہ کے ساتھ جناح اٹھارویں صدی کے کوئی ایسے کیمیا دان دکھائی دے رہے تھے جو کسی دریافت کے قریب پہنچ چکا ہو۔

بریگیڈیئر ٹی ایم نے بانیِ پاکستان کے پورٹریٹ کو پسندیدگی سے دیکھا؛ اگر سویلین اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے اور سویلین کی طرح تمیز سے رہتے تو اسے ان پر کوئی

اعتراض نہ ہوتا۔ 'اس آدمی کی طرف دیکھو۔' اس نے پورٹریٹ کی جانب ایک قدم بڑھایا۔ 'وہ ایک سویلین تھا اور سویلین لباس پہنتا تھا اور سویلین باتیں کرتا تھا، لیکن دل میں وہ بھی ایک سپاہی تھا۔' ٹی ایم انھیں سلیوٹ کرنے پر معترض نہ ہوا، اس حب الوطنی کے مارے جو صرف ایک اعزاز یافتہ سپاہی ہی محسوس کر سکتا ہے؛ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور سلیوٹ کیا۔ جیسے ہی اس کا قدم قالین پر پڑا، اس کے ہاتھ نے ہوا میں قوس بنائی اور اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی اس کے ابروؤں تک پہنچی، فریم ذرا سا ہل گیا۔ فریم تھوڑا سا ہی ہلا تھا لیکن بریگیڈیئر ٹی ایم کی ہوشیار نگاہ نے اس کے ہلنے کو نوٹس کر لیا اور اس نے اچانک اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایک ایسے بچے کی طرح مضطرب اور شرمیلا محسوس کرنے لگا جس نے کسی امیر کزن کے گھر میں اکی بانا کی نازک سجاوٹ خراب کر دی ہو۔ بریگیڈیئر ٹی ایم آگے بڑھا، فریم کے کونوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا، پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ لیول ہے یا نہیں ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر تھرتھرا کر فریم ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کے ہولسٹر کی طرف بڑھا اور پھر رک گیا۔ بانیِ پاکستان نے اپنی یک چشمی عینک کے پیچھے سے اسے آنکھ ماری تھی۔ وہ قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے ان کی بائیں آنکھ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

'میں نے کئی مرتبہ خود بھی ایسا کیا ہے۔'

جب ٹی ایم نے جنرل ضیا کی آواز سنی تو وہ مڑا اور اس مرتبہ کم شدت کے ساتھ سلیوٹ کیا اور اپنے پیر ذرا سے ایک طرف کر لیے تاکہ فریم کو چھپا لے اور ضیا اس میں آجانے والا جھکاؤ نہ دیکھ لے۔

اپنی وردی اور صدارتی تام جھام کے بغیر جنرل ضیا کافی دبلا نظر آتا تھا۔ اس کا ریشمی گاؤن اس کے گرد لہرا رہا تھا۔ اس کی ہمیشہ تیل سے چپڑی اور مروڑیاں دی ہوئی مونچھ اس کے بالائی ہونٹ پر مرجھائی ہوئی پڑی تھی۔ وہ بے چینی سے اسے چبا رہا تھا۔ اس کے بال جو ہمیشہ تیل سے چپڑے ہوتے اور جن میں بیچ کی مانگ نکلی ہوئی ہوتی، کسی

ایسے پریڈ اسکواڈ کی طرح بکھرے ہوئے تھے جسے چائے کا وقفہ ملا ہو۔

'وہ واحد حقیقی رہ نما تھا جو ہمیں ملا۔' جنرل ضیا نے کہا اور ایسے توقف کیا جیسے وہ بریگیڈیئر ٹی ایم سے اپنی درستی کی امید کر رہا ہو۔

بریگیڈیئر ٹی ایم ابھی تک شاک کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ وہ توہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر آپ کی بندوق میں تیل لگا ہوا ہو اور اس کا سیفٹی کیچ اَن لاک ہو، تو اس میں سے گولی نکلے گی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہوا کی رفتار سے متعلق آپ کے پاس درست پیمائش ہو اور آپ کو اپنی اُترائی پر کنٹرول ہو تو آپ کا پیرا شوٹ آپ کو وہیں اتارے گا جہاں آپ اسے اتارنا چاہیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر آپ کسی قیدی کو تین روز تک جگانے کے بعد اس کے سامنے اس کی بیٹی کا نام لیں تو وہ بولنے لگتا ہے۔ لیکن اپنے سیلوٹ کے جواب میں یک چشمی عینک پہنے کسی مردے کو، سنہرے کنارے والے فریم میں سے، آنکھ مارتے دیکھنے کا تجربہ بریگیڈیئر ٹی ایم کو کبھی نہیں ہوا تھا۔

'یہ پورٹریٹ سیکیورٹی کے لحاظ سے کلیئر نہیں ہے، سر۔ جنرل اختر کو کوڈ ریڈ کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'

'پیارے بیٹے، میں امریکی اخباروں کی جانب سے پھیلائی جانے والی افواہوں کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہوں لیکن کیا مجھے خود اپنے انٹیلی جینس چیف کی طرف سے تحفے میں دی جانے والی تصویروں سے بھی ڈرنا پڑے گا؟ کیا اب جنرل اختر بھی مشکوک ہیں؟ کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں خود اپنے ڈرائنگ روم میں بھی محفوظ نہیں ہوں؟' جنرل ضیا ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر اس نے اضافہ کیا، 'یا پھر کیا تمھیں اس تصویر میں نظر آنے والی شخصیت پسند نہیں؟'

'وہ ایک سویلین تھے، سر، لیکن انھوں نے ہمیں یہ ملک لے کر دیا۔'

جنرل ضیا نے اپنی ناراضی چھپانے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے گاؤن کی جیبوں میں ڈال لیے؛ بریگیڈیئر ٹی ایم کو تاریخ کا پتا ہی نہیں تھا۔ 'ویل، اگر تم ان کا موازنہ اُس بنیے

گاندھی سے کرو، یا اُس زنا کار نہرو سے، تو ہاں، آف کورس وہ ہمارے ایک عظیم رہ نما تھے۔ لیکن ان کے بعد سے اور بھی ایسے رہ نما ہوئے ہیں جنھوں نے خود بڑی انکساری کے ساتھ۔۔۔' جنرل ضیا نے ٹی ایم کے خالی خولی چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے لیے کوئی تعریفی کلمات ادا نہیں کرنے والا اور اس نے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا۔

'بیٹے، میں اس گھر میں ایک قیدی کی طرح محسوس کرتا ہوں۔ یہ آئی ایس آئی کے لوگ بے وقوف ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ روسیوں سے کیسے لڑنا ہے، اور قسم سے انھوں نے اپنے جاسوس آدھی دنیا تک پھیلا رکھے ہیں، لیکن وہ یہ پتا نہیں چلا پا رہے کہ ان کے اپنے صدر کو کون قتل کرنا چاہ رہا ہے۔'

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنی زندگی میں ایک کام کبھی نہیں کیا تھا اور وہ تھا اپنے وردی والے بھائیوں کی برائی، چاہے وہ بھائی وردی نہ ہی پہنتے ہوں۔ اس نے بھی موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی، ایک نیا موضوع تجویز کیا اور فی الفور اس پر پچھتانے لگا۔

'آپ عمرے پر کیوں نہیں چلے جاتے، سر؟'

جنرل ضیا ہر سال کوئی دس مرتبہ مکہ جاتا تھا اور بریگیڈیئر ٹی ایم کو اس کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں جا کر جنرل ضیا خود کو بہت محفوظ محسوس کرتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں جا کر وہ ایک ایسے بارہ سالہ بچے کا سا رویہ اپنا لیتا تھا جس کی سال گرہ کا دن خراب چلا گیا ہو۔ وہ بپھر سا جاتا، وہ روتا، وہ خانۂ کعبہ کی سیاہ سنگِ مرمر کی دیوار کے ساتھ ٹکریں مارتا، اور اس کے گرد ایسے دوڑیں لگاتا جیسے وہ عمرہ کرنے نہیں بلکہ کسی مقابلے کی دوڑ میں شریک ہے۔

'کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جناح ایسے حالات میں عمرہ کرنے چلے جاتے؟'

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے تحت الشعور میں بانیٔ پاکستان کی آنکھ جھپکتے ہوئے محسوس کی۔ وہ اس بات کی نشان دہی کرنا چاہتا تھا کہ جناح تو کبھی مکہ میں زیارت کرنے گئے ہی

نہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر بانیِ پاکستان کو کبھی روحانیت سے معمور ہونے کا وقت مل ہی جاتا تو وہ شاید مغربی لندن کے کسی پب کا رُخ کرتے۔ ٹی ایم ضیا کے سوال نظر انداز کرتے ہوئے چوکنا کھڑا رہا۔ اس نے اپنے بوٹوں کے اندر اپنے پنجے گھمائے؛ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے سر کو خون کے جس دوران کی ضرورت تھی وہ اسے مل رہا تھا یا نہیں۔

'کیا جناح کو کبھی ایسے فیصلے کرنے پڑے؟' جنرل ضیا نے بریگیڈئر ٹی ایم کو تاریخ کے گئے دنوں کا سراغ دینے کی ایک آخری کوشش کی۔ 'کیا جناح پر کبھی ایسا وقت آیا کہ انھیں صبح روسیوں سے لڑنا ہو اور شام کو امریکیوں کو قائل کرنا ہو کہ یہ جنگ اب بھی اس قابل ہے کہ اسے لڑا جائے؟ کیا وہ کبھی خود اپنے ہی آرمی ہاؤس میں قیدی بن کر رہے؟'

'یس، سر' بریگیڈئر ٹی ایم نے چلّا کر جواب دیا اور اپنی ایڑیاں ملا دیں۔

'میرا خیال ہے کہ مجھے ملک کے اندر ہی رہنے کی ضرورت ہے۔'

بریگیڈئر ٹی ایم نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خود بھی مکہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ سنگِ مرمر کے اس خالی کمرے میں دوبارہ نہیں جانا چاہتا تھا۔

بریگیڈئر ٹی ایم اس وقت خود کو زندہ و تابندہ محسوس کرتا جب اسے کوئی ایکشن لینا ہوتا یا کم از کم اس کا امکان ہی ہوتا۔ آپ زمین سے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوں، فری فال کرتے ہوئے، آپ اپنے ہاتھ پیر سیدھے کریں، اپنے جسم کو ہوا کی لہروں پر سواری کرنے دیں، کبھی غوطہ لگائیں اور ایک ہزار فٹ نیچے ہو جائیں، پھر سومرسالٹ کریں، اپنی بانہیں اور ٹانگیں پھیلا دیں، پھر اپنی رپ کورڈ کھینچیں اور اچانک یہ دنیا پھر سے اصلی صورت میں سامنے آ جائے، صدارتی چبوترے کے سامنے کنکریٹ کا ایک ٹکڑا یا پھر دشمن کی صف بندی کے عقب میں کوئی جھاڑی۔

جب وہ اپنے پہلے دورے میں جنرل ضیا کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا خانۂ کعبہ کے

احاطے میں داخل ہوا تھا تو اسے امکانات کے ایسے ہی ایک جہان کے سامنے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اسے ایک سفید رنگ کی چادر پیش کی گئی تھی، جیسی وہاں سب لوگوں نے پہنی ہوئی تھی، لیکن اس نے اپنے ساتھ چلتے سعودی پولیس اہل کار پر ایک نظر ڈالی اور اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خدا کے گھر میں تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی بھول جائے۔ انھوں نے جنرل ضیا سے پوچھا بھی کہ کیا وہ اس کے سکیورٹی چیف کو اندر آنے دیں جس نے جنگی لباس زیب تن کر رکھا ہے، لیکن ضیا زور زور سے رو رہا اور اپنے سر کو ہلا رہا تھا۔ سعودی پولیس کے سپاہی ٹھیک سے کہہ نہیں سکتے تھے کہ وہ ہاں کہہ رہا تھا یا ناں۔ جب وہ اس احاطے کے وسط میں واقع سیاہ کمرے کی جانب رواں تھے، جنرل ضیا سِسکیاں لے لے کر رونے لگا، اس نے اپنا سر احرام میں چھپا لیا اور اونچی آواز میں دعائیں کرنے لگا۔ بریگیڈئر ٹی ایم نے کسی امکانی خطرے کو بھانپنے کے لیے اپنے اردگرد دیکھا۔ عبادت گزاروں کی تعداد کم تھی اور وہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے؛ عبادت کی مختلف حالتوں میں وہ ان لکڑیوں کی طرح نظر آ رہے تھے جو یہاں وہاں بےترتیبی سے پھینک دی گئی ہوں۔ روشنی اتنی زیادہ تھی جتنی کسی منچ کو روشن کرنے کے لیے ضروری ہو، مگر تھی ٹھنڈی۔ بریگیڈئر ٹی ایم کو اچھی طرح روشن کی ہوئی جگہیں پسند تھیں۔ اس کی توجہ کا مرکز سیاہ سنگِ مرمر سے بنا، نیچی چھت والا اور چوکور کمرا تھا جو سیاہ ریشم سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسے یہاں کسی سکیورٹی رسک کا خدشہ نہیں تھا۔ یہ کمرا وہاں چودہ سو سے زائد برسوں سے موجود تھا لیکن اسے احتیاط تو کرنا ہی تھی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اسے جنرل ضیا کے لیے خصوصی طور پر کھولا جانے والا تھا۔ عمرے پر آنے والے باقی لوگوں کو بس اس کی بیرونی دیواروں کو چھونے اور اس کی دیوار پر سجے سیاہ ریشم کو چومنے پر گزارا کرنا پڑا جس پر سنہری کڑھائی کی گئی تھی۔

جب وہ روٹین رسک اسیسمنٹ کر رہا تھا تو اُس نے اس جگہ کے بارے میں آئی ایس آئی سے ایک فائل منگوائی تھی اور انھوں نے اسے ہائی اسکول کی مطالعہ اسلام کی

کتاب کا صفحہ فوٹو کاپی کر کے بھجوا دیا تھا۔

یہ بالکل وہی جگہ تھی جہاں ابراہیم نے اپنا بیٹا ذبح کرنے کی کوشش کی تھی اور جہاں حضرت محمد ﷺ نے بتوں کو توڑا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ہر وہ غیر مسلم جو ہتھیار رکھ دے گا خود کو محفوظ تصور کرے گا۔

آج کی رات وہاں صرف سعودی سیکیورٹی اہل کاروں کے پاس ہتھیار تھے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں انھیں اپنے ہتھیار چلانے بھی آتے ہیں یا نہیں۔ وہ جگہ احترام اور عبادات سے گونج رہی تھی سو اس نے اپنے ہولسٹر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کی نگاہ ایک سیاح کی نگاہ بن گئی، اِدھر اُدھر بھٹکتی، کچھ متجسس مگر شبہ کرنے والی نہیں۔ اس نے یہ بات دلچسپی کے ساتھ نوٹ کی کہ وہاں عبادت کرنے آنے والے زیادہ تر لوگ سیاہ فام تھے، لیکن وہاں دوسری قومیتوں کے لوگ بھی موجود تھے۔ اس نے ایک سفید فام عورت کو ایک کونے میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک بوڑھا چینی ایک ہاتھ میں دعاؤں کی کتاب اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی تھامے اپنے قدموں کو سیاہ چوکور کمرے کی جانب گھسیٹ رہا تھا، جسے دیکھ کر وہ اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم نے سوچا کہ ہو سکتا ہے وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک زائر کی حیثیت سے یہاں آئے اور دیکھے کہ اسے بھی وہ سب محسوس ہوتا ہے یا نہیں جو دوسرے محسوس کرتے تھے۔

سروں پر سنہری کناروں والے کوفیات سجائے ان کے میزبان سعودی شہزادے ان کے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس سلطنت میں کتنے شہزادے تھے، اسے ان کی گنتی بھول چکی تھی۔

جب وہ وسط میں کھڑے سیاہ سنگِ مرمر کے چوکور کمرے تک پہنچے تو بریگیڈیئر ٹی ایم اچانک، یہ احساس کرتے ہوئے کہ وہ ایک انجانی جگہ میں داخل ہو رہے ہیں، اُن سب کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ وہاں کوئی ان کے لیے

گھات لگا کر بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن انھیں خوش آمدید کہنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

کمرا خالی تھا۔

وہاں الوہی روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی، نہ کوئی جھکڑ، کمرے کی دیواریں سیاہ تھیں اور ان پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ اور اگر وہاں جنرل ضیا اپنی رُندھی ہوئی آواز میں معافیاں نہ مانگ رہا ہوتا تو وہ فقط قدیم ہوا سے بھرا ایک خالی کمرا ہی ہوتا۔ اللہ کا گھر ایک تاریک خالی کمرا تھا۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے کاندھے اُچکائے، دروازے پر کھڑا ہو گیا اور خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے زائرین پر نظر رکھنے لگا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے تحت الشعور میں ایک مرتبہ پھر بانیِ پاکستان کی آنکھ جھپکتے ہوئے دیکھی۔ جنرل ضیا کو احساس ہو گیا کہ ٹی ایم گپ شپ کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے اپنا نائٹ گاؤن سختی سے اپنے گرد لپیٹا اور کچھ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا جس میں بریگیڈیئر ٹی ایم بس یہی کچھ سمجھ سکا کہ 'تھوڑا سا سو جاؤ'۔ حالانکہ جنرل ضیا یہ کہہ رہا تھا کہ 'ایسی کتی رات میں کوئی سو بھی کیا سکتا ہے؟'

بریگیڈیئر ٹی ایم بانیِ پاکستان سے آنکھ ملانے سے گریز کرتے ہوئے فریم کی جانب گیا۔ اس کے ہاتھ اپنی دونوں جیبوں میں گئے اور وہ وہاں سے دو سفید رومالوں میں لپٹے ہوئے برآمد ہوئے۔ اس نے فریم کو اُس کے کناروں سے پکڑا اور اُسے اس کیل سے الگ کر دیا جس سے وہ لٹکایا گیا تھا۔ وہ فریم کو اپنے سینے کے سامنے تھامے رہا، اسے صوفے کی طرف لے گیا اور وہاں اُسے ایسے رکھ دیا کہ بانیِ پاکستان کا چہرہ نیچے کی جانب ہو گیا۔ اب اس نے دائیں ہاتھ سے اپنی پتلون کا پائنچا اوپر کیا اور اپنے ٹخنے کے قریب بندھی ہوئی چمڑے کی نیام سے ایک خنجر باہر نکال لیا۔ اس نے ایک ایک کر کے ہک کھولے، خنجر کی نوک کارڈ بورڈ کے نیچے گھبو دی، کارڈ بورڈ کو اوپر اُٹھایا اور اسے پرے پھینک دیا۔ پورٹریٹ کا پچھلا حصہ سبز رنگ کے ایک موٹے مخملیں کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی

انگلیوں نے اس حصے کو ٹٹولنا شروع کیا جہاں اُس کے خیال میں بانیِ پاکستان کا چہرہ ہو سکتا تھا۔ بانیِ پاکستان کی یک چشمی عینک سے ڈھکی آنکھ کے پیچھے اس کی انگلیوں کو کوئی ٹھوس گول سی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے پھر اپنا خنجر اُٹھایا، اس چیز کے اردگرد بڑی صفائی سے ایک سوراخ کیا اور سرمئی رنگ کی ایک دھاتی ڈسک باہر نکال لی جو کچھ موٹی تو تھی لیکن پچاس پیسے کے سکے سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس نے اسے رومال سے لپٹے ہوئے ہاتھ سے اُٹھایا اور اسے اپنے جسم سے دور رکھ کر دیکھنے لگا جیسے وہ پھٹ جانے والی ہو۔

بریگیڈیئر ٹی ایم ڈسک کی دونوں طرفوں کا مشاہدہ کر رہا تھا اور یہ طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا وہ کوئی فنی اختراع ہے جو پورٹریٹ کے مصور نے استعمال کی ہے یا کوئی جان لیوا ڈیوائس ہے جو اسے دھماکے سے اڑا دینے والی ہے کہ یکایک اس کی دھاتی سطح درمیان سے کھلی، جیسے کسی منی ایچر تھیٹر کے پردے سرک جائیں، اور چھوٹے سے محدب عدسے نے اسے آنکھ ماری۔ دھاتی پردے فی الفور پھر سے بند ہو گئے۔

ریموٹ کنٹرول بم ہوں، یا بڑھی ہوئی طاقت والی گولیاں، فاصلے سے پھینکے جانے والے خنجر ہوں یا کسی نشانچی کی رائفل سے لیا ہوا نشانہ، کاندھے پر رکھ کر زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل ہوں یا کشیدہ ابرو اور بے قرار انگلیوں والے باڈی گارڈ، بریگیڈیئر ٹی ایم سبھی سے اپنے دل کی حرکت زیر و زبر ہوئے بغیر نبٹ سکتا تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے خفیہ کیمرے نے اسے اتنا طیش دلایا کہ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی ڈیوٹی بھی بھول گیا؛ بجائے کسی فورنزک ماہر کو بلانے یا کیمرے سے لی جانے والی تصویروں کا کھرا تلاش کرنے کے وہ جنرل ضیا کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ بیڈ روم کے دروازے کے باہر وہ ایک لمحے کے لیے تھوڑا ہچکچایا، خود کو پُرسکون کرنے کے لیے تین لمبے لمبے سانس لیے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

خاتونِ اوّل نے دروازہ کھولا، اس کے وسط میں کھڑی ہو گئی اور اس کا مذاق اڑانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگی جیسے وہ کوئی بچّہ ہو جس نے اپنا بستر گیلا کر دینے

کے بعد اپنی ماں کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی ہو۔

'اب کیا ہے؟' اس نے پوچھا۔ 'کیا اس نے آدھی رات کے وقت کسی خاتون غیر ملکی صحافی سے ملاقات کرنی ہے؟ یا انڈیا ہم پر پھر سے حملہ کرنے والا ہے؟'

بریگیڈیئر ٹی ایم کو بچی میں یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی خاتون کو جواب کیسے دیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ہتھیلی کھولی اور وہ چیز خاتونِ اوّل کو دکھا دی۔

اُس نے اس پر حقارت کی نظر ڈالی۔ 'تمھارا باس اب یہاں نہیں سوتا۔' پھر وہ مڑی اور کاریڈور میں اس کی آواز ابھری۔ 'دیکھو ضیا، تمھارا دوست تمھارے لیے تحفہ لایا ہے۔'

۱۷

’آم پسند ہیں تمھیں؟‘ سیکرٹری جنرل کی سرگوشی بہ مشکل سنائی دیتی ہے۔ وہ ابھی بھی سانسیں لے رہا ہے۔ لگتا ہے وہ تکلیف میں ہے۔ حرامیوں نے اسے کھانا بھی نہیں دیا۔ کتنا وقت گزر چکا ہے؟ تین دن سے زیادہ تو نہیں گزرے ہوں گے۔ میں رینگتا ہوا دیوار کے سوراخ کی جانب جاتا ہوں اور راستے میں ریت کے وہ اہرام مسمار کر دیتا ہوں جو میں نے دن گننے کے لیے تعمیر کیے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے پتا چل جاتا ہو کہ دن کب نکلتا ہے اور کب ختم ہو جاتا ہے۔ دروازے پر ایک بھی دستک نہیں ہوئی ہے۔ کہیں سے بھی کوئی ایک بھی آواز سنائی نہیں دی ہے۔ ’مجھے آم پسند نہیں۔‘ میں کہتا ہوں۔ ’یہ اس قابل نہیں کہ ان کے لیے کوشش کی جائے۔ شگری پہاڑ پر ہمارے پچھواڑے میں سیبوں کے درخت تھے۔ مجھے سیب پسند ہیں۔ انھیں توڑو، اپنی پتلون کے ساتھ رگڑو اور کھا جاؤ۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔‘

سیکرٹری جنرل بڑی دیر تک خاموش رہتا ہے جیسے وہ فرش پر سے میرے الفاظ اکٹھے کر رہا ہو اور ان سے ایک جملہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

’تم رشتے دار ہو اُس کے؟‘

’ہاں۔‘

’بھائی ہو؟‘

'اس سے کہیں بڑا سلسلہ ہے۔'

وہ خاموش رہتا ہے، پھر اس کی مٹھی دیوار سے ٹکراتی ہے۔ تین مرتبہ۔

'تم کیا سمجھتے تھے کہ تم یہ سب کچھ اکیلے کر لو گے؟ تمھیں تاریخ کا کوئی شعور نہیں ہے۔ تمھیں اپنے فوجی بھائیوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ اپنے پیٹی بند بھائیوں کا۔'

کاش سیکرٹری جنرل کو علم ہوتا۔

'میں اُن کا واحد بیٹا تھا۔'

جب میں پریڈ اسکوائر سے اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا تو میں اپنے بوٹوں کے نیچے سڑک کی اسفالٹ سے بنی تہ کو پگھلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا۔ دور فاصلے پر یہ سڑک ایک کے بعد دوسرے غبار جیسے سراب میں منقلب ہو جاتی، میں قریب آتا تو ان میں سے ہر سراب غائب ہو جاتا۔ بینن اور عُبید اب بھی پریڈ اسکوائر میں تھے اور ایکسٹرا ڈرل کا ایک اور سیشن کر رہے تھے۔ اپنے ڈورم میں جانے کی کوئی تُک نہیں بنتی تھی۔ میں نے بینن کے کمرے میں موجود سکون کی راہ لی۔ ائرکنڈیشنر چل رہا تھا اور پسینے سے گیلی میری شرٹ کچھ ہی منٹوں میں اکڑ کر رہ گئی۔ میں نے شرٹ اتار دی اور اپنی سفید بنیان میں وہیں بیٹھ کر کسی ایسی چیز کی تلاش کرنے لگا جو میرے دماغ کو ڈرل کے احکامات سے دور لے جائے جو اب بھی میرے سر میں گھوم رہے تھے۔ میں اپنا سر چٹائی پر رکھ کر فرش پر لیٹ جاتا ہوں اور اپنے جوتے ائرکنڈیشنر کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ پھر میں نے چٹائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور جیسا کہ مجھے توقّع تھی ایک بھورا لفافہ نکال لیا جس میں جولائی کا شمارہ پڑا ہوا تھا۔ سرورق پر تھائی حسینہ ڈائنا لینگ اور یاسر عرفات کی تصویریں تھیں: پلے بوائے کے عالمی خصوصی شمارے کے سرورق پر لکھا تھا: Lang Shots and Arafat's Guns and Poses

میں نے فیصلہ کیا کہ یاسر عرفات کے انٹرویو کا مطالعہ کسی بعد کے وقت کے لیے

اُٹھا رکھوں اور درمیان کا ورق کھولا۔ دروازہ کھلا اور بینن اپنی پی کیپ سے خود کو پنکھا جھلتا ہوا اندر چلا آیا۔ 'میں ہار گیا۔ تمھارا دوست یہ سب نہیں کر پائے گا۔'

اس نے میرے ہاتھ کو نظرانداز کر دیا جو بہ یک وقت رسالے کو لفافے میں ڈالنے اور لفافے کو چٹائی کے نیچے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بینن کے سفید مگرمچھ جیسے چہرے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے چشمے بہہ رہے تھے، اس کے بال اس کی کھوپڑی سے چپکے ہوئے تھے اور وہ خود سے سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا، 'صدر کی انسپکشن میں دو ہفتے رہ گئے ہیں اور میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو قدم ملا کر پریڈ بھی نہیں کر سکتے۔'

میں نے ائرکنڈیشنر کے پاس سے اپنے جوتے اُٹھائے اور بینن سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

'بے بی او ڈرل اسکواڈ میں موجود نہیں رہ سکے گا۔ جیسے ہی پریڈ شروع ہوتی ہے وہ چرچ میں کھڑی رنڈی کی طرح پسینے پسینے ہونے لگتا ہے۔ اس کا رجحان ہی نہیں ہے اس جانب۔'

'عُبید ہو سکتا ہے کہ فطری انداز سے پریڈ نہ کرتا ہو لیکن وہ پُرشوق بہت ہے۔' میں نے کہا۔ 'میں نے اس سے زیادہ لگن آج تک کسی آدمی میں نہیں دیکھی۔ وہ تو رات کو بھی ہمارے ڈورم میں اپنی حرکات کو کامل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔'

'وہ ایک اچھا خودکش بن سکتا ہے لیکن وہ اس ساری منحوس ڈرل کے لیے بنا ہی نہیں ہے۔'

'وہ اس بارے میں بہت جذباتی ہے۔ یقیناً آپ۔۔۔'

میں نے اپنا جملہ ائرکنڈیشنر سے ٹھنڈی کی ہوئی فضا میں جھولتے رہنے دیا۔ یقیناً اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرے کہنے کا کیا مطلب تھا۔ ہم عُبید کا مان نہیں توڑ سکتے تھے۔

'یہ خود اُس کے لیے بہتر ہو گا۔' وہ بڑبڑایا۔ 'اسے دائیں مڑنے کو کہتے ہیں تو وہ بائیں مڑ جاتا ہے۔ اسے رائفل پھینکنے کو کہتے ہیں تو وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اور یہ

سب تو میری زبانی کمانڈ کے باوجود ہو رہا ہے۔ آج ہم رائفل کو گول گھما کر پھینکنے کی مشق کر رہے تھے اور وہ جب بھی رائفل پھینکتا، رائفل میرے سر کی طرف آ جاتی۔ وہ یا تو کسی کو مار دے گا یا مروا دے گا۔ اب تم کچھ کوشش کرو اس کے سر میں تھوڑی سی عقل ڈالنے کی۔ وہ ایک اچھا افسر بن جائے گا لیکن ہمارے ساتھ ریہرسل وہ بالکل بھی نہیں کرے گا۔ اب مجھے جانا ہے اور اپنی فائنل رپورٹ لکھنی ہے۔'

بینن پیچھے دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا، کوئی بھی وعدہ کیے بغیر۔

میں ابھی اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ دل کی شکل کے موئے زہار والی مشرقی لڑکیوں سے بھرے ہوئے رسالے میں یاسر عرفات کیا کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور عُبید اندر چلا آیا، دروازے کو لات مار کر اپنے پیچھے بند کیا، بروس لی کے پوسٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور مجھے ایسے گھورنے لگا جیسے اس کے ہاتھوں اور آنکھوں کے درمیان کوارڈی نیشن نہ ہونے کا واحد سبب میں ہوں۔

اس کی خاکی وردی پسینے کی ٹکڑیوں سے نشان زدہ تھی، اس کا نیلا رومال اس کے دائیں ہاتھ کے ساتھ سختی سے بندھا ہوا تھا اور اس کے دائیں رخسار پر ایک خراش تھی۔ اس کی عموماً پرسکون رہنے والی آنکھیں غصے کے ابلتے ہوئے تالاب بن چکی تھیں۔

پریڈ گراؤنڈ پر اس کی متواتر سبکی کے اسباب مجھ پر ظاہر تھے۔ آپ وار ہسٹری میں سب سے زیادہ نمبر لے سکتے ہیں، آپ اپنی ڈرل کی حرکات و سکنات کو متوازن رکھنے کی رات بھر کوشش کر سکتے ہیں، لیکن جب سائلنٹ زون کی باری آتی ہے، آپ کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ اپنے مینوئل میں سے دیکھ لیں کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ عُبید میرے حصے کی تمام اسٹڈی کرتا تھا۔ میرے نیوی گیشن کے نقشے بھی وہی بناتا تھا، میں جو کسی بھی نصابی کتاب پر دو پیراگرافوں سے زیادہ توجہ مرکوز کرنے کے قابل نہیں تھا تو اس کی تلافی بھی وہی کرتا تھا اور میرے لیے نوٹس بھی وہی تیار کرتا تھا۔ اپنے جسم میں کسی پڑھاکو قسم کی ہڈی کی غیر موجودگی کے باوجود، یا شاید اسی وجہ سے، میں ڈرل کے شعبے میں

بہت آگے جا رہا تھا۔ اور بینن کی بات میں بھی وزن تھا: ایک غلط قدم پڑا، خاموش ٹروں میں ایک سُر غلط لگا تو وہ ساری روٹین تباہ ہو جائے گی جو ہم نے صدر کی انسپکشن کے لیے تیار کی تھی۔ اور اس سے تلوار کا وہ مظاہرہ بھی تباہ ہو جاتا جس کی تیاری میں نے صدر صاحب کے لیے کی تھی۔

میں نے سوچا کہ یاسر عرفات کی تصویروں کی مدد سے عُبید کی توجہ بٹانے کی کوشش کروں لیکن میں نے اس کے بگڑے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور یہ خیال ترک کر دیا۔ وہ اپنی مٹھیاں کھول اور بھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسا غصّہ تھا جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھنے کے لیے اس کی طرف گیا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، مڑا، اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے اور اپنا سر دیوار پر مارنا شروع کر دیا۔

'سب ٹھیک ہو جائے گا۔' میں نے کہا اور خود کو ایک ایسے ڈاکٹر کی طرح محسوس کیا جو آپ کو یہ اطلاع دینے کے بعد کہ آپ کے پاس زندہ رہنے کے لیے چھ ہفتے رہ گئے ہیں، آپ سے کہتا ہے کہ زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارو۔ وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا، پھر اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے بینن کے بستر کی جانب چھلانگ لگا دی، جس کے نتیجے میں کیموفلاج کی ہوئی کنوپی کو اُٹھائے رکھنے والے بانس نیچے چٹائی پر آ گرے۔ اس نے اتنی کتابیں پڑھ رکھی تھیں لیکن ان کتابوں نے اسے اتنا بھی نہیں بتایا تھا کہ جب غصّہ آئے تو کسی کی گاف پر لات ماری جاتی ہے، اپنے کمرے کا فرنیچر دوبارہ سے ترتیب نہیں دیا جاتا۔ وہ اپنی چھلانگ کے اثر سے مایوس ہوا اور اس نے بدھا کا سرامک سے بنا مجسمہ اُٹھا لیا۔ میں آگے کو لپکا اور اسے روک دیا۔ 'نہیں بدھا نہیں۔' میں نے اس کے ہاتھ سے مجسمہ لیتے ہوئے کہا۔ بدھا کے سرامک سے بنے ہوئے اور ائرکنڈیشنر کی ہوا سے ٹھنڈے ہو چکے چہرے پر اس کی انگلیاں گرم محسوس ہوئیں۔ اس نے کوئی اور چیز اُٹھا کر پھینکنے کے لیے ارد گرد دیکھا۔ ائرکنڈیشنر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کی شرٹ پر پسینے کی کچھ ٹکڑیوں

کو خشک کر چکی تھی۔ جب میں اسے پرسکون کرنے کے لیے اس کے قریب گیا تو مجھے اس کی سانسوں کی الائچی کی خوش بو اور اس کے خشک ہوتے ہوئے پسینے کی مُشک جیسی بو محسوس ہوئی۔

'چلو بات کر کے مسئلے کا حل نکالتے ہیں۔' میں نے کہا۔ ایسی صورتِ حال میں وہ خود بھی یہی کہا کرتا تھا۔

'تم مجھے باہر رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔'

'دیکھو، بے بی او۔۔۔' میں لفظوں کی تلاش میں بوکھلا سا گیا اور خاموشی کے اس وقفے کو اپنا ہاتھ اس کے کاندھے سے اس کی گردن کے پچھلے حصے کی جانب لے جا کر بھرنے کی کوشش کی۔ میری ہتھیلی کے نیچے اس کے بال تن سے گئے، کمرے کی ٹھنڈک کے باوجود اس کی گردن اب تک گرم تھی۔ مجھے اس سے ہم دردی نہ کر سکنے پر غصّہ بھی آیا اور یہ غصّہ باہر بھی آیا۔

'دیکھو، میں کسی پکنک پر نہیں جا رہا جہاں میں تم کو لے کر نہیں جا رہا۔ خود تمھارے لیے بھی یہی بہتر ہے، بے بی او۔'

اس نے میرے سرپرستانہ لہجے کو نظرانداز کیا۔ 'اس کا ایک بہت آسان راستہ بھی ہے۔' اس نے کہا۔ 'یہاں کون سی چیز سب سے زیادہ ہے؟ جہاز نا؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک جہاز لیتے ہیں اور چلتے ہیں اُس۔۔۔'

'اب ہم اس معاملے پر دوبارہ بات کبھی نہیں کریں گے۔' میں اسے بیچ ہی میں ٹوک دیتا ہوں۔ ایک وردی پوش سپاہی کی حیثیت سے سپاہیانہ زندگی سے مُتعلق اس کے خیالات بہت احمقانہ تھے۔ وہ خود کو اپنے بستر کے کنارے لگی میز پر دھری کتابوں کے ڈھیر میں موجود "جوناتھن لونگ سٹون سیگل" کے کسی تازہ ایڈیشن کا کوئی کردار سمجھتا تھا اور جہازوں سے مُتعلق ایسے بات کرتا تھا جیسے وہ کروڑوں ڈالر مالیت کی جنگی مشینیں نہ ہوں بلکہ اس کی روحانی جستجو کے سفر کا کوئی وسیلہ ہوں۔ صحراست کہ دریاست۔ تہ بال د

پرماست۔۔۔' اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے کہا۔ 'میں یہ سب کچھ تن تنہا کر سکتا ہوں۔'

اس نے میرا گال تھپتھپایا۔

'تم اس حرام کی چیز کو لینڈ تک نہیں کر سکتے۔ بھول جاؤ اسے۔'

'لینڈ کرنے کی ضرورت ہی کسے ہے؟' اس نے ایک نیوی گیشن میپ نکالا جس میں سارے منصوبے کا نقشہ کھینچا گیا تھا اور جس میں آرمی ہاؤس کے گرد ایک سرخ دائرہ بنایا گیا تھا۔ 'اگر کوئی سامنے کی یا پیچھے کی ہوا نہ ہو تو بس تیئیس منٹ کا سفر ہے۔'

میں نے اس سے نقشہ چھین لیا، اسے اپنے کندھے کے اوپر سے پیچھے پھینک دیا اور اس کی آنکھوں میں گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ بھی پلکیں جھپکائے بغیر میری آنکھوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے انکل سٹارچی کے شہد کے بارے میں بتانے کا سوچا لیکن فی الفور فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

'کرنل شگری نے خودکشی نہیں کی اور نہ ہی میں کروں گا۔' میں نے کہا۔ اس کے بعد میں اپنا مُنھ اس کے کان کے قریب لے گیا اور لیول پانچ پر چلّا کر کہا: 'بات سمجھ میں آئی؟'

میرے اندرونی سُروں کو بہہ دو۔ میں نے سوچا۔

'بات سمجھ میں آئی؟' میں ایک مرتبہ پھر چلّایا۔

اس نے اپنا کان میرے مُنھ کے ساتھ چپکا دیا، اپنا جسم میری طرف بڑھایا اور اپنا ہاتھ میری کمر پر رکھ دیا۔

'اگر تم وہ سب یہاں کرنا چاہتے ہو، تو تمھیں اپنے اسکواڈ میں مجھے رکھنا ہی ہوگا۔ تمھیں بیک اپ کی ضرورت پڑے گی۔'

میں نے اس کا ہاتھ ہٹایا، ایک قدم پیچھے مڑا۔ 'سنو، تم اپنا رِلکے یا جو بھی کچھ ان دنوں پڑھ رہے ہو وہی پڑھتے رہو۔ کیا کرو گے تم؟ ہیں؟ دیکھو، یہ ہے میری تلوار، یہ آ رہا ہے جنرل، دیکھو، یہ میں اس پر وار کر رہا ہوں۔' میں نے ایک تخیلاتی تلوار کے ساتھ اپنی

کلائی ڈھیلی کر نقل سی اتاری۔ 'اررر ے، سوری، نشانہ چوک گیا۔ یار ایک بار پھر کوشش کرلوں؟'

میرا خیال ہے ان الفاظ کے ساتھ میں نے اسے مار کر رکھ دیا۔

میں نے اس کا گھونسا اپنے پیٹ کی جانب آتے ہوئے نہیں دیکھا اور جب میں اسے کھا کر دُہرا ہوا تو اس کا گھٹنا میری پسلیوں سے ٹکرایا جس نے مجھے اُٹھا کر مُنھ کے بل بینن کے بستر پر پھینک دیا، میں نے خود کو بانسوں کے ایک ڈھیر اور کیموفلاج کنوپی پر لیٹا ہوا پایا۔ بے بی او کی جانب سے ضرب لگنے کی حیرانی اتنی شدید تھی کہ مجھے کوئی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دیوار پر بروس لی کا پوسٹر ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں دھندلا گیا۔ عُبید میرے قریب پہنچا اور میرے اوپر کھڑا ہو کر مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے اس نے مجھے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میری لات اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی اور وہ میرے برابر گر گیا۔

میں نے اپنی پسلی کے نچلے حصے کی مالش کی اور آہ بھری۔ عُبید نے خود کو ایک کہنی کے بل پر اُٹھایا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ اچانک ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس نے کچھ طے کر لیا ہو۔ اپنے دونوں گھٹنے میری پیٹھ کے گرد سختی سے دبا کر اس نے میری پتلون کے اندر سے میری بنیان کھینچ لی۔ اس نے میری پسلیوں کے نچلے حصے کی اپنے دونوں ہاتھوں سے آہستگی کے ساتھ مالش شروع کی اور اس تمام وقت کے دوران میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ مجھے یہ پسند نہیں آیا کہ وہ میرا ردِعمل دیکھتا رہے، اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں، میری پیٹھ رضاکارانہ طور پر اوپر اُٹھی اور میری استری شدہ خاکی پتلون اچانک بہت ٹائٹ محسوس ہونے لگی۔ مجھے امید تھی کہ بینن اپنی رپورٹ لکھنے میں کچھ وقت تو لے گا۔

اس نے میری بنیان اوپر کی، ٹھنڈی ہوا نے میرے سینے میں کپکپاہٹ دوڑا دی اور میری چوچیاں بے شرمی سے گلابی ہو کر ایستادہ ہو گئیں؛ میری بیلٹ کھول دی گئی۔ میں نے اپنا پیٹ اندر کیا اور اپنا سانس روکا جب کہ اس کا ہاتھ میری پتلون کے اندر آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس نے مجھے کہیں سے پکڑا نہیں، بس اپنے ہاتھ کی پشت میرے

عضو کے ساتھ لگا دی جیسے وہ کوئی اتفاقی لمس ہو۔ مجھے ان ہونٹوں سے تشویش ہو رہی تھی جو میرے بالوں کو چھوتے ہوئے میرے سینے تک آ رہے تھے۔ مجھے چومے جانے سے الجھن ہوتی تھی۔

میں نے اس کے بالوں سے یاسمین کے تیل کی خوش بو سونگھی اور پھر سے چٹائی پر لیٹ گیا؛ میرے نیچے ایک بانس کڑک کر ٹوٹ گیا اور میں نے پریشانی میں اُٹھ جانے کی کوشش کی۔ میری پتلون میں موجود اس کے ہاتھ نے مجھے زور سے نیچے لٹا دیا۔ اس کے ہونٹ میرے جبڑوں کی بیرونی ہڈی کے ساتھ سفر کرنے لگے، اس کی انگلیوں کے پوٹے میرے عضو کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے دائرے بنانے لگے۔ میں نے آہ بھری اور میری پیٹھ نے پھر سے حرکت کی لیکن اس نے اپنی کہنی سے مجھے دبا دیا۔ اس کے ہونٹوں نے میری پسلیوں کو تلاش کیا اور مسلسل نیچے کی جانب سفر جاری رکھا۔ میں نے اپنی بند آنکھوں کے ساتھ کچھ اور سوچنے کی کوشش کی۔ شگری پہاڑ پر میرے گھر کے قریب ایک چشمہ ہوا کرتا تھا؛ میں نے دیکھا کہ سردیوں کے دن ہیں اور میں اس چشمے میں کھڑا برف جیسے ٹھنڈے پانی میں اپنی پہلی ایستادگی تجربہ کر رہا ہوں۔ میرا جسم اچھلا اور میرا عضو اس کی ناک کی پھننگ سے جا ٹکرایا اور وہ ہنس دیا۔

مزید حیرتیں بھی میری منتظر تھیں کہ جب وہ خود بھی اپنی پتلون سے باہر نکل آیا اور میرا ہاتھ اپنے عضو کی جانب لے گیا۔ میں نے خود کو ایک قوس کو محسوس کرتے ہوئے پایا، کوئی ذرا سی قوس نہیں بلکہ کسی نئے چاند کے جتنا نیم دائرہ۔ اس کا عضو کسی کمان کی طرح مُڑا ہوا تھا اور اس کی ایستادگی کی قوس کا رخ اس کی ناف کی جانب تھا۔ اس نے آہ بھری اور میرے برابر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹوں کے گرد ایک نرم خوش‌کن مسکراہٹ پھیل رہی تھی، ایک بہت پُرسکون، بھرپور اور نرم خو مسکراہٹ، جسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی دنیا میں گم ہو گیا ہے جہاں ہوا اس کے چہرے کے قریب سرگوشیاں کرتی ہے اور اس کے نیچے کوئی ساکت سمندر موجود ہے۔

بہت دیر تک مجھے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کسی مرحلے پر ائر کنڈیشنر بند ہو گیا تھا اور کمرے میں واحد آواز دو ڈرے ہوئے لڑکوں کی سانسوں کی آ رہی تھی۔ 'نہیں۔ نہیں۔' آخر میں اس نے سرگوشی کی، جب وہ اپنے ہاتھوں سے پیالہ بنا کر یہ کوشش کر رہا تھا کہ بستر پر کوئی نشان نہ رہ جائے۔ 'چادر پر نہیں۔'

وہ اپنا چہرہ چھت کی طرف اُٹھائے بول رہا تھا۔ 'تم کوئی بے وقوفانہ کام نہیں کرو گے۔'

'اور تم بھی کسی کام کو بیچنے کی کوشش نہیں کرو گے۔' میں نے کہا۔

'نہیں کروں گا۔' اس نے کہا۔

صبح وہ غائب ہو چکا تھا۔

۱۸ سوچ

زینب اگر اندھی نہ بھی ہوتی تو وہ اخبار میں شائع ہونے والا اپنا انٹرویو نہیں پڑھ سکتی تھی کیوں کہ وہ اَن پڑھ تھی۔ خبریں اسے خوشبوؤں سے، پرندوں سے اور ہوا کی کیفیت سے ملتی تھیں۔ اور اس صبح وہ بری خبر کو ہوا میں سونگھ سکتی تھی۔ وہ بے صبر پرندوں کی آواز کو ہوا میں سُن سکتی تھی۔ وہ بے وطنی اور لمبی لمبی تنہا راتوں کو اپنی جانب چلتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لیے اپنا سانس سینے میں روکا، ہوا میں لہراتی ہوئی بدشگونیوں کو نظر انداز کیا اور اس کام پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی جو اسے کرنا تھا۔

زینب اپنی کوٹھڑی کی لوہے کی سلاخوں سے جڑی کھڑی تھی اور روٹی کے ایک ٹکڑے سے چھوٹے چھوٹے بھورے توڑ کر انھیں ان چڑیوں کی طرف پھینک رہی تھی جو ہر صبح جیل پر اتر آتی تھیں۔ بہت سے اندھے لوگوں کی طرح وہ بھی پرندوں کے پروں کے پھڑپھڑانے سے ان کی تعداد گن لیتی تھی۔ شاید وہاں پندرہ کے قریب چڑیاں تھیں۔ وہ ہنسی خوشی بھورے چگ رہی تھیں، اور ان کی بھوک پہلے ہی مٹ چکی تھی کیوں کہ جیل میں ان کے لیے کافی خوراک موجود تھی۔ ہر صبح بہت سی عورتیں بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے لیے لوہے کی سلاخوں سے ہاتھ باہر نکالے انھی چڑیوں کو راغب کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ امید کرتی تھیں کہ چڑیاں ان کے پھینکے ہوئے بھورے چگ لیں گی اور اگر ان کی قسمت اچھی ہو گی تو وہ ان کی ہتھیلیوں سے بھورے اُچک لیں گی۔ لیکن اس صبح چڑیاں

ایک دوسرے سے کھیلنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔

زینب سزائے موت پانے والے دوسرے قیدیوں کی طرح محسوس نہیں کرتی تھی؛ وہ نمازیں پڑھتے ہیں، روتے ہیں، رحم کے لیے دائر کی جانے والی اپنی اپیلوں پر پیش رفت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور جب ان کی آخری اپیل بھی مسترد کر دی جاتی ہے تو اپنی توجہ آخرت پر مرکوز کر دیتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر گناہوں کی معافی کے خواست گار ہو جاتے ہیں۔ زینب نے کوئی جرم نہیں کیا اور وہ اپنی کوٹھڑی میں سکون سے ہے۔ اس کوٹھڑی کو کال کوٹھڑی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں سزائے موت پانے والے قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ اور وہ اس میں ایسے رہتی ہے جیسے یہ اس کا گھر ہو۔ آج صبح وہ اٹھی تھی، اس نے اپنی کوٹھڑی کی صفائی کی تھی، اسی کوٹھڑی میں رہنے والی اپنی حاملہ ساتھی کے پیر دبائے تھے اور اپنے بالوں میں تیل ڈالا تھا۔ پرندوں کو دانا ڈالنے کے بعد وہ دوسری کوٹھڑیوں کو جائے گی جو کال کوٹھڑیاں نہیں اور وہاں مزید دو حاملہ قیدیوں کے پیروں کی مالش کرے گی۔ اس کا وکیل اور خواتین کے دوسرے گروپ جو جیل کے باہر اس کی سزائے موت کے خلاف بلا گلا کر رہے تھے، انھیں وہ بار بار ایک ہی جواب دیتی، 'کوئی ایک غریب اندھی عورت کو مارنا کیوں چاہے گا؟' اس کے نرم لہجے، دوسرے قیدیوں کی مدد کرنے اور ان کے بچوں کو قرآن پڑھانے کی وجہ سے خاتون جیلر بھی اس کی عزت کرتی تھی۔ زینب جیل سپرنٹنڈنٹ کی پسندیدہ قیدی تھی اور اسی نے زینب کو وہ سن گلاسز لا کر دیے تھے جنھوں نے جنرل ضیا کو اتنا اشتعال دلا دیا تھا۔ 'یہ سورج سے تمھاری حفاظت کریں گے۔' زینب نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اور کسی شکایت کے بغیر، خود پر ترس دلائے بغیر اور اس بات کی نشان دہی کے بغیر انھیں قبول کر لیا تھا کہ سورج کی روشنی تو ان مرے ہوئے سفید تالابوں میں جا ہی نہیں سکتی جو اس کی آنکھیں کہلاتے تھے۔ پلاسٹک کے ان سن گلاسز کے پیچھے اس کی آنکھیں سفید تھیں۔ اس کی پیدائش ہی آنکھوں میں قرنیوں کے بغیر ہوئی تھی۔ جب وہ اس دنیا میں آئی تو ظاہر ہے برے شگون وغیرہ کی بھی بات ہوئی لیکن اس کا چہرہ اتنا نورانی

تھا اور اس کی دوسری حسیات اتنی تیز تھیں کہ اسے ایک بدقسمت بچے کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا اور اس نے اپنے حالات کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا تھا۔ اب بھی جبکہ نئے قوانین کے تحت وہ سنگ ساری کی سزا پانے والی پہلی خاتون بن چکی تھی، اس نے ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا تھا جس نے ان خاتون کارکنوں کو بھی حیران کر دیا تھا جو اس کے مقدمے کو عدالتوں میں اور سڑکوں پر لڑ رہی تھیں۔ 'پتھر مار مار کے؟' سزا سنائے جانے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ 'جیسے وہ لوگ مکہ میں حج کے دوران شیطان کو مارتے ہیں؟ وہ تو صدیوں سے اسے پتھر مار رہے ہیں لیکن اب تک اسے قتل نہیں کر سکے۔ تو وہ مجھ جیسی صحت مند عورت کو کیسے مار سکیں گے؟'

کچھ روز تک دھوپ والا چشمہ پہنے رکھنے کے بعد زینب نے انھیں پسند کرنا شروع کر دیا تھا؛ اسے سورج کی روشنی میں کھڑے رہنے سے سر میں جو درد ہونے لگتا تھا، انھیں پہننے سے اس میں افاقہ ہوا تھا۔ اور جب وہ انھیں اتار کر دوسرے قیدیوں کے بچوں کو اپنی دودھ جیسی سفید آنکھیں دکھاتی تو وہ کلکاریاں بھرنے لگتے۔

زینب نے پروں کی ایک جوڑی کو اڑتے ہوئے سنا، جس کے پر چڑیوں کے پروں سے زیادہ بھاری تھے۔ اس نے اپنی چڑیوں کو بے چینی میں ادھر ادھر پھد کتے سنا لیکن وہ اُڑ کر کہیں اور نہیں چلی گئیں۔ کچھ ہوا میں منڈلاتی رہیں، کچھ زینب سے دور جا کر بیٹھ گئیں۔ اس کے ہاتھ بھورے پھینکتے ہوئے ایک لمحے کو رکے اور اسے اپنی چڑیوں کی حفاظت کا خیال آیا۔ وہ کوّے کو وہ بھورے نہیں دینا چاہتی تھی جو چڑیوں کا حصہ تھے۔ پھر اسے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک کوّا یاد آیا جو اس کے بہت سے تاریک دنوں میں اس کا ساتھی رہا تھا۔ گاؤں والوں نے اسے ایک اور برا شگون کہا تھا لیکن اس کے ساتھ زینب کا وقت اچھا کٹ جاتا تھا اور وہ اس کے لیے ہمیشہ کچھ روٹی بچا کر رکھتی تھی۔ کیا یہ وہی کوّا تو نہیں؟ اس کے ہاتھوں نے جیل میں ملنے والی روٹی کے بھورے توڑنا اور پھر سے باہر پھینکنا شروع کر دیے۔ کیا پتا کوّا واقعی میں بھوکا ہو؟ وہ جانتی تھی کہ چڑیوں کو تو تمام قیدی، بلکہ

جیل عملے میں سے بھی بہت سے ارکان، کھلاتے پلاتے رہتے تھے۔

اس نے جیلر کے قدموں کی آواز کو اپنی جانب آتے سنا۔ وہ جس طرح چل رہی تھی اسی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بری خبر لا رہی ہے۔ اس نے خود تک آتے قدموں میں چھپا ہوا احساسِ گناہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی اور پرندے کو بھورے ڈالنا جاری رکھا۔ وہ بتا سکتی تھی کہ اب کوے نے اس جگہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ چڑیاں اُڑ کر دور چلی گئی تھیں تاہم وہ اب بھی کوے کے زیرِ قبضہ دائرے میں پھدک رہی تھیں اور جب کوے کی پشت ان کی طرف ہوتی تو کوئی بھورا اُٹھا کر محفوظ فاصلے پر چلی جاتی تھیں۔ وہ اپنی انگلیوں پر محسوس کر سکتی تھی کہ ان کے پَرفرار کے لیے تولے جا چکے تھے۔ وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ چڑیاں ایک کھیل کھیل رہی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک کوے کی توجّہ کہیں اور مبذول کرائے تو دوسری چڑیا اس کے کتنے قریب جا سکتی ہے۔

جیلر کے سائے نے سورج کی روشنی روک لی۔ زینب جیلر کے پسینے کی بو سے بتا سکتی تھی کہ وہ مشکل میں تھی۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی اور وہاں نہ ہونے کا دھوکا دینے کے لیے اپنا وزن کبھی ایک تو کبھی دوسرے پیر پر دھرتی تھی۔

خبر واقعی بری تھی۔

جس قیدی کو موت کی سزا ہو چکی ہو اس کے پاس آپ کون سی بری خبر لا سکتے ہیں؟ اسے رحم کی اس اپیل کے بارے میں کوئی خوش امیدی نہیں تھی جو اس کی وکیل نے اس کی طرف سے دائر کی تھی۔ اس کی کوٹھڑی کے دوسرے قیدیوں نے اس اپیل پر بحث کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگرچہ جنرل نے کئی معاملات پر کئی مرتبہ اپنا فیصلہ تبدیل کیا ہے لیکن ایک کام اس نے کبھی نہیں کیا اور وہ ہے موت کی سزا کے معاملے میں رحم کی اپیل کو قبول کرنا۔ اس سارے معاملے کا تعلّق کسی بھٹو سے تھا جو ضیا سے پہلے حکم ران تھا۔ زینب جانتی تھی کہ بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی، سنگ سار نہیں کیا گیا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بھٹو کا جرم کیا تھا۔ زینب کو توقّع نہیں تھی کہ اس کے جرم میں کٹوتی ہو جائے گی، اس لیے شاید جیلر کو اس کے بلیک وارنٹ مل گئے ہوں اور اب وہ اس بارے میں پریشان ہو کہ سنگ ساری کا بندوبست کیسے کرے۔ زینب کو جیلر پر ترس آیا؛ ایسی اچھی اور لائق عورت کو ایسے امتحان میں کیوں پڑنا پڑا؟

اس نے کوے کو اپنے پر بے چینی سے پھڑپھڑاتے سنا، لیکن اڑنے کے بجائے وہ پھر سے وہیں بیٹھ گیا۔ شاید اس نے آخری چڑیا کا پیچھا کر کے اسے بھی بھگا دیا تھا۔

'زینب، تمھاری تصویر ایک اخبار میں چھپی ہے۔' جیلر نے کہا۔ زینب جانتی تھی کہ جیلر اس کے بلیک وارنٹ کے بارے میں خبر دینے کے بجائے اخبار کے بارے میں بتا کر اصل موضوع سے گریز کر رہی ہے۔ 'تصویر میں تم دھوپ کے چشمے میں اچھی لگتی ہو۔'

زینب نے روٹی کا آخری بھورا پھینکا اور امید کی کہ وہ بھورا کوے کے سر پر جا لگے گا۔ نہیں لگا۔

'وہ لوگ تمھیں ایک اور قید خانے میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس تصویر اور اس انٹرویو کی وجہ سے۔'

زینب کو انٹرویو یاد تھا۔ اس کی وکیل نے اسے کچھ سوال پڑھ کر سنائے تھے اور اس نے وہی کہانی دُہرا دی تھی جو اس نے ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ اور سزائے موت کے خلاف اپنی اپیل میں سنائی تھی۔ وہی کہانی جو اس نے اپنے ساتھی قیدیوں کو سنائی تھی، بار بار، اور اپنی وکیل کی کوشش کے باوجود کسی قسم کی قطع و برید کے بغیر۔

'تمھاری تصویر امریکا میں چھپی ہے۔ بظاہر آرڈر ٹاپ سے کہیں سے آئے ہیں کہ تمھیں کسی ایسی جگہ لے جایا جائے جہاں تم انٹرویو نہ دے سکو۔'

زینب نہ انٹرویو کے چکروں کو جانتی تھی، نہ اسے یہ پتا تھا کہ کون سی جگہ سے انٹرویو دیا یا نہیں دیا جا سکتا، اس نے تو صرف وہی کچھ بتایا تھا جو ہوا تھا۔

'وہاں اندھیرا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس ٹارچیں تھیں۔ وہ تین آدمی تھے۔ شاید ایک اور آدمی باہر دروازے پر تھا۔ ان سے کار کے پٹرول جیسی بو آ رہی تھی، ان کے ہاتھ

نرم تھے اس لیے وہ کسان تو ہو نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے میرے ہاتھ باندھے، اور جب میں نے انھیں ان کی ماؤں، بہنوں کے واسطے دے کر کہا کہ مجھے جانے دیں تو انھوں نے مجھے مارا پیٹا۔ وہ جانور تھے بالکل۔'

'لیکن مجھے تو یہاں آرام ہے۔' اس نے جیلر کو بتایا۔ 'کوٹھڑی میں میری ساتھی قیدی کا دو ہفتے میں بچہ ہونے والا ہے۔ میری یہاں اور بھی سہیلیاں ہیں۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔'

پھر اس نے سوچا کہ اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔

'میں یہیں مرنا چاہتی ہوں۔'

'یہ آرڈر صدر کی طرف سے آئے ہیں۔' جیلر نے اس لہجے میں کہا جس لہجے میں اُس نے اِس سے پہلے زینب سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس لہجے کے ذریعے اس نے یہ واضح کر دیا کہ فیصلہ حتمی ہے، اس کی سزائے موت کے فیصلے سے بھی زیادہ حتمی۔ زینب نے اس کی آواز میں خوف بھی محسوس کیا اور سوچا کہ پتا نہیں کہیں جیلر کو بھی سزا نہ ہونے والی ہو۔

اور یہ سوچ، کہ وہ اپنی سہیلیوں کو پیچھے چھوڑ کر جانے والی ہے، اور یہ خیال کہ وہ جیلر جس نے اسے دھوپ کا چشمہ دیا اسے شاید سزا دے دی جائے زینب پر غالب آیا اور اس نے وہ کچھ کیا جو اُس نے اِس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اندھی زینب جس نے ایک ہوس ناک جج کو خود کو سزائے موت سناتے ہوئے خاموشی سے سنا تھا، جس نے اپنے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والوں کو ایک چیخ کی خوشی بھی نہیں دی تھی، جس نے اپنی ساری زندگی خدا کا شکر ادا کرنے اور اس کے بندے جو کچھ خود اس کے ساتھ کرتے تھے اس پر انھیں معاف کرنے میں گزاری تھی، اسی زینب نے چیخ ماری اور اسی زینب نے بد دعا دی۔

'جو بندہ مجھے میرے گھر سے دور لے جا رہا ہے، شالا اس کی آنتوں کو کیڑے کھائیں۔ شالا اس کے بچے اُس کا مرا ہوا مُنھ بھی نہ دیکھ سکیں۔'

جیلر کو سکون کا احساس ہوا۔ اسے زینب کے بے کار کے صبر پر غصہ آتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زینب یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی جائے۔

یہ ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ بد دعا غصے میں آئی ہوئی ماؤں اور ان لوگوں کا ایک فضول سا ہتھیار ہوتی ہے جن میں اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے مناسب جرأت یا الفاظ نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ زیادہ تر بد دعائیں اثر نہیں کرتیں۔ ان کے اثر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کوئی کوا کسی ایسے شخص سے یہ بد دعا لے جس نے اسے پیٹ بھر کر کھلایا پلایا ہو اور پھر اُس بد دعا کو بدوائے ہوئے شخص تک لے جائے۔ کوے بھی سیدھے راستوں پر چلنے والی مخلوق نہیں ہوتے، ان کی آمد و رفت کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ انھیں کوئی بھی چیز کہیں بھی لے جانے کی پروا نہیں ہوتی۔ زینب نے نوٹ بھی نہیں کیا کہ کوا کب زمین پر کسی بچے کھچے بھورے کو ڈھونڈنے کے بعد سستی سے پروں کو پھڑ پھڑا کر وہاں سے دور اُڑ گیا۔ جب وہ جیل کے اوپر پہنچ گیا، جہاں سے وہ چڑیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو قیدیوں کے سامنے اپنا بے وقوفانہ رقص کرتے دیکھ سکتا تھا، تو اس نے اپنے اوپر پچھم کی ہوا محسوس کی۔ وہ اور اوپر اُڑا، اپنے پر پھڑ پھڑانا بند کیے اور دو روز بعد سرحد پار کر کے بھارت چلا گیا جہاں گندم کا موسم پہلے شروع ہوتا ہے اور جہاں بجلی کے کھمبے زیادہ محفوظ ہیں۔

زینب نے اپنے کپڑوں کے دو جوڑے پیک کیے اور اپنے سفر کے آغاز کا انتظار کرنے لگی۔ اسے ہتھکڑی لگا کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس نے نوٹ کیا کہ اس کے ساتھ کوئی گارڈ نہیں تھے۔ ہتھکڑی لگی ہوئی ایک اندھی عورت کہاں جانے والی تھی؟ اس نے دعا کی کہ کوٹھڑی میں اس کی ساتھی آسانی سے بچہ جنے اور پھر یہ بھی بھول گئی کہ اس نے کس کو اور کیوں بد دعا دی تھی۔

کوے نے اپنے پَر اپنے جسم کے ساتھ دبائے اور پچھم کی ہوا کو خود کو اُڑا لے جانے دیا۔

ہو سکتا ہے کہ کوّوں کا ضمیر نہ ہوتا ہو، لیکن ان کی یادداشت نوّے سال تک برقرار رہتی ہے۔

جب اسے لے جانے والی جیپ رُک گئی اور پھر نہ چلی اور کوئی اسے نیچے اترنے کے لیے کہنے نہ آیا تو زینب نے سوچا کہ وہ اس جگہ پہنچ گئی ہے جہاں اسے لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی سنبھالی، کینوس کے بنے ہوئے پردے کو ہٹایا اور جیپ سے نیچے اتر گئی۔ اس نے بہت سے دھوئیں اور بہت سے مردوں کی بو سونگھی اور ایک لمحے کے لیے سوچا کہ شاید اسے کسی مردوں کی جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ اس نے پاس سے ایک سائرن کی آواز سنی اور اس امید میں چلتی گئی کہ اب اسے اس کوٹھڑی تک لے جایا جائے گا جہاں اسے باقی زندگی گزارنی تھی۔ اس کے اردگرد جو لوگ تھے وہ بے چین ہو رہے تھے۔ جیلوں میں لوگوں کو پتا چل جاتا ہے کہ چپ چاپ کیسے رہنا ہے۔ کچھ گز تک چلنے اور کسی کے پیر پر پیر نہ رکھ دینے سے بچنے کی کوشش کے بعد اس نے ایک شخص کا بازو پکڑا جو چپ چاپ اور صبر سے کھڑا تھا اور پوچھا: 'مجھے کہاں رہنا ہے؟'

اس شخص نے دو روپے کا ایک میلا کچیلا نوٹ اس کی ہتھیلی میں دبایا اور اسے کہا کہ وہ بھی دوسرے سب لوگوں کی طرح انتظار کرے۔

'میں فقیرنی نہیں ہوں۔' اس نے کہا لیکن وہ شخص پہلے ہی کہیں اور جا چکا تھا۔

ایک ہاتھ نے اس کے بازو کو سختی سے پکڑ لیا۔ 'کدھر جا رہی ہے مائی؟ ہم تجھے قلعے لے جا رہے ہیں۔ وہاں میڈیا والے تجھے تنگ کرنے نہیں آ سکیں گے۔'

۱۹

اپنے پڑوسی کی بے چین سرگوشیوں سے میری آنکھ کھلتی ہے جو میرے تہ خانے میں گونج رہی ہیں۔ 'کامریڈ۔ کامریڈ۔' میری مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں اور پسینے سے گیلی میری ہتھیلیوں سے ریت چپکی ہوئی ہے۔ 'کامریڈ۔'

مجھے اس ماحول سے شناسائی میں کچھ لمحے لگتے ہیں، اور پھر ان سرگوشیوں کے منبع کی شناخت میں ایک اور لمحہ۔ جب میں اپنی ہتھیلیاں اپنی پتلون سے جھاڑ کر دیوار میں موجود سوراخ کی جانب بڑھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ لگتا ہے مجھے اس نے اپنی جدوجہد میں پھر سے قبول کر لیا ہے۔

'جی، کامریڈ۔' میں ایک پرانے کمیونسٹ کے سے جذبے کے ساتھ کہتا ہوں۔

اس کی آواز بھدی اور جوش و خروش سے پُر ہے۔

'کیا تمھیں کسی عورت کی خوش بو آ رہی ہے؟' وہ کہتا ہے۔

'میں تو انھیں ایک میل دور سے سونگھ لیتا ہوں، کامریڈ سیکرٹری جنرل۔ خصوصاً اس وقت جب ان کی خوش بو اچھی ہو۔'

'تو کیا تم نے سونگھا؟ وہ بہت قریب ہے، بہت قریب۔'

'اتنی قریب جتنا تمھارا انقلاب ہے؟'

'یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے وہ

تمھارے بتہ خانے کے برابر والے سیل میں ہے۔'

'یہ شاہی قلعہ ہے۔ کوئی عورت ایسا کیا کرسکتی ہے کہ اسے یہاں بند کر دیا جائے؟'

'تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ یقیناً تمھارے برابر والے سیل میں ہے۔ بات کرو اُس سے۔'

'خواتین سے قربت کا اس وقت میرا کوئی موڈ نہیں، سیکرٹری جنرل۔ جب میرا پیٹ خالی ہو تو میں عورتوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ تم ہی کرلو بات اس سے۔'

'بورژوا لوگ اپنے آدمیوں کا جیلوں میں بھی تحفظ کرتے ہیں۔ انھوں نے اسے میرے سیل کے برابر کیوں نہیں بند کیا؟ تمھیں کھانے کے لیے چکن دیا جاتا ہے اور پڑوس کے لیے ایک عورت اور مجھے کیا ملتا ہے؟ ایک فوجی بھگوڑا پڑوسی اور بد بودار کھانا۔'

'میں بھگوڑا نہیں۔' میں وضاحت کرتا ہوں۔ 'میں اب بھی وردی میں ہوں۔' تاریکی میں دو بھوکے آدمیوں کی خاموشی باقی رہ جاتی ہے۔

'تم جانتے ہو کہ تم کیا کر سکتے ہو، کامریڈ۔۔۔' اچانک اس کی سرگوشی حقیقی تڑپ سے بھر جاتی ہے اور اس کی سانسیں تیز ہونے لگتی ہیں۔

'میں تمھارے ساتھ ہوں، کامریڈ۔' میں کہتا ہوں۔

'تم اُس کے سیل والی دیوار میں ایک اینٹ ڈھونڈ سکتے ہو۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔ تم اُسے اس کی چھاتی سوراخ میں رکھنے کے لیے کہہ سکتے ہو اور پھر تم اُسے چھو بھی سکتے ہو۔'

'اور کیا خیال ہے تمھارا وہ ایسا کیوں کرے گی؟'

'اسے بتاؤ کہ تم آرمی میں ہو۔'

میں راہ داری میں قدموں کی آواز سنتا ہوں؛ یہ آواز میرے بتہ خانے کے سامنے رُک جاتی ہے۔ میں اینٹ سوراخ میں رکھ کر پھر سے اپنی کمر دیوار سے لگا کر نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ قیدی کے دروازے پر دستک کون دے سکتا ہے؟

شاید وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں۔ میں بغیر کوئی آواز پیدا کیے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے گھٹنے کپکپاتے ہیں، میں سہارے کے لیے ایک ہاتھ دیوار پر رکھتا ہوں، اپنے خشک ہونٹوں کو اپنی زبان سے گیلا کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور ایک نحیف لیکن درشت آواز میں کہتا ہوں: 'جی۔'

دروازہ آواز کے ساتھ کھلتا ہے، روشنی پھیکی اور مرجھائی ہوئی ہے اور گھر کے بنے ہوئے یاسمین کے عطر کی تیز خوش بو مجھے آلیتی ہے۔ ہتھکڑی لگانے والا شخص وردی نہیں پہنے ہوا، لیکن میں اس کے سویلین اسٹائل سے بتا سکتا ہوں کہ وہ میجر کیانی کا آدمی ہے۔ اس سے یہ پوچھنے کی کوئی تک نہیں کہ کیانی کے احکامات کیا ہیں۔ اس سیاہ سوراخ میں مجھے ابد تک کے لیے بھوکا رکھنے کے بعد اب انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے باقاعدہ طور پر حراست میں لے لیں۔ زندگی پہلے سے بہتر نہیں ہونے والی۔ میری خواہش ہے کہ سیکرٹری جنرل مجھے ہتھکڑیوں میں دیکھ سکے۔ اسے مجھ پر فخر ہوگا۔ سپاہی میری آنکھوں پر پٹی باندھنے میں کچھ وقت لیتا ہے، اسے میرے ابروؤں اور ناک کے اوپر ایسے درست انداز میں باندھتا ہے کہ روشنی کی کوئی شعاع اندر نہ جا سکے، لیکن ساتھ ہی اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ میں سانس لے سکوں۔ اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کے باوجود جب مجھے سیڑھیوں پر اور پھر دیوانِ عام اور شیش محل کے درمیان ایک مسقف راہ داری پر لے جایا جاتا ہے تو میں سورج کی تیز سفید روشنی کی لہریں اپنی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ قلعے کی فضا تازہ کٹی ہوئی اور پانی دی ہوئی گھاس کی خوش بو دے رہی ہے۔ میں خواہش کرتا ہوں کہ میں اپنی گردن کی پشت پر خارش کرسکوں۔

جیپ ایک پُرہجوم بازار سے گزرتی ہے۔ مجھے کیک، گائے کے گوبر اور کچے آموں کی مہک آتی ہے۔ میں ہاکروں کو اخبار بیچتے اور ٹریفک پولیس کے کانسٹیبلوں کو بسوں کی طرف سیٹیاں بجاتے اور بسوں کو جواب میں ہارن بجاتے سنتا ہوں، جن کا دوگانا بتہ خانے کی خاموشی میں دنوں اور راتوں کے بعد میرے ان کانوں کے لیے میلوڈی کی حیثیت رکھتا

ہے۔ جیپ کسی پتوں بھری سڑک پر آ نکلتی ہے، جہاں فضا ہوا میں اڑتے ہوئے زرگل سے بھری ہوئی ہے، ٹریفک متوازن ہے، کاریں نئی سنائی دیتی ہے اور ٹریفک سگنل پر رک بھی جاتی ہیں۔ سڑک کے کنارے لگے درخت سورج سے جھلسے ہوئے یوکلپٹس جیسی بو دیتے ہیں۔ جیپ ایک ایسی جگہ جا کر رک جاتی ہے جو میٹل پالش اور فوجی بوٹوں کی خوش بو دیتی ہے۔ ایک گیٹ کھلتا ہے اور جیپ آہستگی سے آگے بڑھنے لگتی ہے۔ کچھ فاصلے پر میں اڑان کی تیاری کرتے ایک ہوائی جہاز کا شور سن سکتا ہوں۔ اور پھر مجھے ائرکرافٹ فیول کی مانوس خوش بو محسوس ہوتی ہے اور پروپیلر کے گھومنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

لگتا ہے وہ مجھے اعزاز کے ساتھ واپس اکیڈمی لے جانا چاہتے ہیں کیوں کہ انھیں میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔

یا پھر وہ مجھے جہاز میں سے باہر پھینک دینا چاہتے ہیں کیوں کہ انھیں میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا اور انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔

میں نے ریڈرز ڈائجسٹ میں پڑھا تھا کہ لاطینی امریکا کے کسی ملک میں فوج یہ کر رہی تھی کہ قیدیوں کو کسی جہاز میں لے جاتی اور پھر انھیں بیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے سمندر میں پھینک دیتی۔ ہاتھ باندھ کر۔

ایک ہاتھ میرے کاندھے پکڑتا ہے اور مجھے ایک سیڑھی پر سے اوپر چڑھاتا ہے تو میں اپنے بازو تیار کر لیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے جہاز سے نیچے پھینکنے کی کوشش کرے گا تو وہ خود بھی میرے ساتھ جائے گا۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔

جیسے ہی میں سیڑھی سے چڑھ کر جہاز میں داخل ہوتا ہوں مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ میں ہرکولیس سی ون تھرٹی جہاز میں ہوں۔ انھیں ایک اکیلے قیدی کو لے جانے کے لیے پورے ایک سی ون تھرٹی جہاز کی ضرورت کیوں پڑی؟ سی ون تھرٹی جہاز ایک بڑے سے اُڑنے والے ٹرک جیسا ہوتا ہے، یہ بیس ہزار کلوگرام تک وزن لے جا سکتا ہے، جو ایک بکتر بند جیپ اور ایک ٹینک کو ملا کر بنتا ہے، اور پھر بھی اس میں اپنے عملے کے لیے

جگہ باقی رہتی ہے۔ اس کا پچھلا دروازہ گاؤں کی کسی حویلی کے دروازے جیسا ہوتا ہے، جس میں سے ایک گاڑی گزر سکتی ہے اور درجنوں چھاتا بردار جس سے چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ یا کسی کو نیچے بھی پھینکا جا سکتا ہے۔ میرا کاندھا پکڑنے والا شخص مجھے ایک جال جیسی سیٹ پر بیٹھنے کو کہتا ہے، میری نائلون کی سیٹ بیلٹ باندھ دیتا ہے، مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ اپنے سامنے بندھوانا پسند کروں گا یا پیچھے۔ ظاہر ہے اپنے سامنے، احمق۔ میرے ہاتھ ایک لمحے کے لیے آزاد رہتے ہیں۔ یہ ہیرو بننے کا کوئی موقع نہیں۔

مجھے جانوروں کی بو آتی ہے جس کے بعد میں ان کے ممیانے کی دبی دبی آوازیں اور کیبن کے دھاتی فرش پر ان کے ننھے ننھے غیر یقینی قدموں کی آواز سنتا ہوں۔ ان کی بو ابھی ابھی نہائی ہوئی بکریوں جیسی ہے لیکن ان کے ممیانے کی آوازیں حلق میں پھنسی ہوئی لگتی ہیں۔ میں اپنی نشست پر پہلو بدلتا ہوں اور یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے غلط پرواز پر بٹھا دیا گیا ہے۔ پچھلا دروازہ ایک آواز کے ساتھ بند ہو جاتا ہے، پروپیلر کی رفتار بڑھتی ہے اور اچانک کیبن جانوروں کے پیشاب کی تلخ بو سے بھر جاتا ہے۔ جہاز کی ناک رن وے سے ٹیک آف کرتی ہے تو یہ بو اور بھی طاقت ور ہو جاتی ہے۔ جانور ظاہر ہے کہ پرواز کے عادی نہیں۔

ائرکرافٹ کے شور اور جانوروں کی بو نے میری توجہ بٹا رکھی تھی، اس لیے میں چونک گیا جب ایک ہاتھ نے میرے بالوں کو چھو کر خشک ہوتی ہوئی آواز میں کہا، 'آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، سر۔'

'کیا؟' میں نے کہا، اور مجھے واقعی میں کچھ پتا نہیں تھا۔

'جو کچھ بھی آپ نے کیا۔ اگر آپ نے کچھ نہ کیا ہوتا تو یہ لوگ آپ کے ہاتھ تو نہ باندھتے۔'

دفع ہو جاؤ، میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں خاموش رہتا ہوں۔

'کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دوں؟'

'ہٹا دو گے کیا؟' میں کہتا ہوں اور اچانک بہت تمیز سے بات کرنے لگتا ہوں۔

'انھوں نے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اور ہم ہوا میں ہوں گے، ایسے میں بندہ دیکھ ہی کیا سکتا ہے؟'

وہ میری پٹی کو آنکھوں کے اوپر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی موٹی انگلیاں کپڑے کو ہٹانے سے زیادہ میرے گالوں پر پھرتی رہتی ہیں۔ میں اپنا سر جھکا کر اپنے سر کی پشت پر موجود گانٹھ اس کے سامنے کرتا ہوں۔ گانٹھ کو کھولنے کے لیے اس کی کوششیں غلو پر مبنی ہیں۔ اس کی انگلیاں میری گردن پر اور میرے کاندھوں پر بھٹک رہی ہیں۔ پھر وہ گانٹھ پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں اس کے تھوک سے بھرے ہوئے ہونٹ اپنی گردن کی پشت پر محسوس کرتا ہوں جو اس جگہ سے کئی انچ نیچے ہے جہاں اسے اپنی کوششوں کو مرکوز کرنا چاہیے تھا۔ وہ اور قریب آتا ہے اور میں اس کا عضو اپنے کاندھے سے چھوتا ہوا محسوس کر سکتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچتا ہوں کہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر اُٹھاؤں اور ان کے درمیان موجود زنجیر سے اس کے لٹکتے ہوئے عضو کو گھونٹ دوں۔

آپ اپنی موت کے سفر پر بھی جا رہے ہوں تو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور آن موجود ہوتا ہے جو اپنے ایجنڈے کی پیروی کر رہا ہو۔

میں اپنے ہاتھوں کو حملے کے درست زاویے کے لیے تیار کر رہا ہوں جب اس کے دانت گانٹھ میں درست جگہ پڑتے ہیں؛ اس کا عضو میری بغل میں ایک شدید سا گھستا لگاتا ہے اور میری آنکھوں کی پٹی اتر جاتی ہے۔

اس قدر محنت کے کام کے بعد وہ پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ اس نے لوڈ ماسٹر کا اوورآل پہن رکھا ہے جو زیتونی سبز رنگ کا ہے اور جس پر تیل کے دھبے ہیں اور اس کا لباس اس کے عضو کی جگہ پر ایک چھوٹا سا خیمہ بنائے کھڑا ہے۔ فیاض، اس کی نیم پلیٹ بے شرمی سے اعلان کرتی ہے۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اس کے چہرے کو گھورتا ہوں جیسے میں اس کے افسوس ناک نقوش کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ کیبن میں اپنی نشست کی طرف ہو جاتا ہے۔

فرش پر ہمارے درمیان قابلِ رحم حالت کے مختلف درجوں میں نو پہاڑی دنبے

موجود ہیں جو اپنے ٹائٹ گھنگریالے اونی بالوں کے تلے کپکپا رہے ہیں۔ ان کی پیچھے کی ٹانگیں رسی سے باندھ دی گئی ہیں تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں۔ کچھ دنبے کیبن کے فرش پر لیٹے ہوئے ہیں اور کچھ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہیں۔ اُن میں سے ایک کی ٹانگیں اوپر ہو گئی ہیں اور اب وہ اپنا چہرہ فرش سے لگائے سانس لینے کی جدوجہد کر رہا ہے، جب کہ باقی دنبے ایک دوسرے کے پاس جمع ہو رہے ہیں۔ ان کی نزلے بھری ناکوں کے نیچے ان کے چہرے مخمصے میں مبتلا سوالیہ نشانات بن چکے ہیں۔

یہ پاک فضائیہ نے لائیو اسٹاک کا کام کب سے شروع کر دیا؟ میں فیاض سے پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن وہ تو بس ایک موٹا جنسی قسم کا لوڈ ماسٹر ہے۔

'کہاں جا رہے ہیں یہ؟' میں پوچھتا ہوں۔

'جہاں ہم جا رہے ہیں۔' وہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے۔

'جو کہاں ہے؟'

'مجھے آپ کو بتانے کی اجازت نہیں ہے۔' وہ دنبوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہتا ہے جیسے وہ منزل کے بارے میں سن لیں گے اور اسے پسند نہیں کریں گے۔

'کیا تم کبھی قلعہ لاہور گئے ہو؟' میں بس یوں ہی اس سے پوچھتا ہوں۔

'نہیں۔ لیکن میں نے اسے ٹی وی پر دیکھا ہے۔' وہ مخمصے میں پڑ جاتا ہے۔

'نہیں، لوڈ ماسٹر فیاض۔' میں اس کا نام تھوکنے سے پہلے چباتا ہوں۔ 'جو قلعہ وہ ٹی وی پر دکھاتے ہیں، اس کے نیچے ایک اور قلعہ ہے۔ یہ قلعہ تمھارے جیسے غداروں کے لیے ہے۔' میں ایک بار پھر دنبوں کی جانب دیکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

'وہ پارٹی کے لیے جا رہے ہیں۔' وہ اپنے ہاتھ اپنی گود میں تہ کر کے رکھے ہوئے کہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنی بھگوڑی شہوت کو ہینڈل میں لے رکھا ہے۔ 'انھیں اسلام آباد میں بکرے کا اچھے سے اچھا گوشت مل سکتا ہے، لیکن وہ افغانی دنبے چاہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ یہ چار جولائی تک زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔'

'پارٹی کر رہے ہیں امریکی؟'

'یہ ان کا یومِ آزادی ہے۔ ہم پچھلے ایک ہفتے سے پورے پاکستان سے خوراک لا رہے ہیں۔ بہت بڑی پارٹی ہوگی یہ ضرور۔'

میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا بینن اس پارٹی میں جا رہا ہوگا۔

دنبے اب جہاز کے شور اور اس کے بدلتے ہوئے اُتار چڑھاؤ کے عادی ہو ہی رہے تھے کہ جہاز نے تیزی سے نیچے کا رخ کیا۔ وہ اپنی ناکوں کے نیچے تے آور آوازیں نکالتے اور ممیاتے ہیں۔ وہ دنبا جس کا منھ فرش پر لگا تھا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور گھوڑے کی طرح سامنے کی دونوں ٹانگیں اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن لڑکھڑاتا ہے اور اپنے ہی پیشاب میں جا گرتا ہے۔

'مجھے آپ کی آنکھوں کی پٹی پھر سے باندھنا پڑے گی۔' لوڈ ماسٹر ایک ایسی آواز میں کہتا ہے جو توقُّعات سے معمور ہے۔ میں اسے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کرتا ہوں اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ وہ ایک دنیا دار آدمی ہے۔ میرا پیغام سمجھ جاتا ہے اور میرے جسم پر کسی بال کو بھی چھوئے بغیر آنکھوں پر پٹی پھر سے باندھ دیتا ہے۔

جیسے ہی جہاز رکتا ہے اس کا پچھلا دروازہ کھل جاتا ہے۔ میں دنبوں کو ریمپ سے نیچے پھسلتا ہوا سن سکتا ہوں، ان کی پہلی اور غالباً آخری پرواز ابھی سے ماضی کا ایک ڈراؤنا خواب بن چکی ہے۔ میرے کاندھے پر ایک اور ہاتھ پڑتا ہے اور مجھے سیڑھی سے نیچے لے جایا جاتا ہے۔ باہر موجود فضا سے گرم کنکریٹ، جلتے ہوئے لینڈنگ گیئر اور ہوا میں تحلیل ہوتے ائر فیول کی بو محسوس ہوتی ہے۔ کیبن کے اندر موجود بو کے مقابلے میں یہ بو بہشت جیسی لگتی ہے۔ ہم تھوڑا سا چلتے ہیں، پھر مجھے سورج کی شعاعوں تلے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مجھے جس جیپ میں پھینک دیا جاتا ہے اس سے گلاب کے ائر فریشنر اور ڈن ہل سگریٹ کی بو آتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہاں مجھے کسی پارٹی کے لیے لایا گیا ہے۔

۲۰

جنرل اختر کی اپنے باس جنرل ضیا سے عقیدت وہ معمول کی عقیدت نہیں تھی جو کسی تین ستارہ جرنیل کو کسی چار ستارہ جرنیل سے ہو جاتی ہو۔ ایک دوسرے پر ان کا انحصار بھی ایسا نہیں تھا جیسا ان دو سپاہیوں کا ہوتا ہے جو جنگ میں زخمی ہونے کے بعد دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہو کر بیس تک پہنچنے کی امید کرتے ہیں۔ ان کے درمیان تعلُّق گلیشئر پر پھنسے دو کتوں جیسا تھا، جو دونوں ایک دوسرے کو تول رہے ہوں اور اس فیصلے کے لیے سوچ بچار کر رہے ہوں کہ کیا اسے اپنے ساتھی کو کھانے کے لیے اس کی موت کا انتظار کرنا چاہیے یا سارے ادب آداب بھلا دینے چاہئیں اور فوری طور پر اسے چٹ کر جانا چاہیے۔

لیکن دونوں میں ایک فرق بھی تھا: جنرل ضیا اپنے پانچ عہدوں، اقوامِ متحدہ میں تقاریر اور نوبیل انعام کی امیدوں کے ساتھ سرشکم تھا۔ جنرل اختر جس نے ہمیشہ اپنے باس کے نائب کا کردار ادا کیا تھا بھوکوں مر رہا تھا اور جب وہ اپنے منجمد پیش منظر پر نگاہ دوڑاتا تو اسے صرف جنرل ضیا ہی نظر آتا، پیٹو، پھولے ہوئے گالوں والا اور اپنے ہی جنون کو نمک مرچ لگا کر دعوت اڑانے والا۔ لوگوں کے سامنے جنرل اختر ہمیشہ اختیارات کی مزید خواہش سے انکار کرتا؛ وہ صحافیوں کی حوصلہ افزائی کرتا کہ اسے خاموش سپاہی کہہ کر بیان کریں جو خفیہ جنگوں میں اپنی غیر مرئی فوجوں کی کمان کرنے پر ہی خوش ہے۔ لیکن جب وہ اپنے دفتر میں لگے آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اور اپنے کاندھے پر لگے تین ستارے

دیکھتا تو روز بہ روز اسے اس بات کا انکار کرنا مشکل سے مشکل تر لگنے لگتا کہ وہ جنرل ضیا کا سایہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا اپنا کیریئر جنرل ضیا کی خواہشات کے پیچھے پیچھے ایک وفادار کتے کی طرح چلتا گیا تھا۔

اگر جنرل ضیا نے خود کو ایک منتخب صدر بنوانا چاہا تو جنرل اختر نے نہ صرف ہر بیلٹ باکس کو بر وقت بھر دینا یقینی بنایا بلکہ اس سے یہ توقع بھی رکھی گئی کہ ووٹوں کی گنتی کے بعد ملک بھر میں ہر طرف بہ یک وقت جشن بھی شروع کرا دے۔ اگر جنرل ضیا ملک گیر ہفتۂ صفائی کا اعلان کرتا تو جنرل اختر کو یہ بات یقینی بنانا ہوتی کہ صدر صاحب کے باہر آ کر تصویر کھنچوانے سے پہلے پہلے تمام گٹر صاف کیے جا چکے ہوں اور ان کی سیکیورٹی چیک کی جا چکی ہو۔ اپنے اچھے دنوں میں جنرل اختر دن کے وقت خود کو شاہی جلاد اور شام کے وقت ایسا خانساماں محسوس کرتا جسے بادشاہ کا کھانا چکھنے کی ذمے داری سونپی گئی ہو۔ اپنے بُرے دنوں میں وہ خود کو مدتوں کی دکھیاری ایسی بیوی کی طرح محسوس کرتا جسے اپنے شوہر کی جانب سے گھر میں کی جانے والی اتھل پتھل کو ہمیشہ درست کرنا پڑتا ہو۔ وہ اب بے صبرا ہونے لگا تھا۔ 'ملک کے دوسرے طاقت ور ترین آدمی' کا عہدہ، جس سے اس نے شروع میں حظ بھی اُٹھایا تھا، اب اسے کسی طعنے کی طرح لگتا تھا۔ اگر آپ کا باس طاقتِ مطلق ہو تو آپ دوسرے طاقت ور ترین آدمی ہو ہی کیسے سکتے ہیں؟

ننھا کتا اب بڑا ہو گیا تھا اور اس کی اشتہا بڑھ گئی تھی۔

جنرل اختر نے اس ننھے کتے کو پٹا ڈال کر رکھنا سیکھ لیا تھا اور اسے وہ تھوڑی بہت چہل قدمی کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے وحشیانہ طور پر دوڑنے بھاگنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی نہیں۔

آرمی ہاؤس سے اپنی کیمرا فیڈ اچانک غائب ہو جانے کے کچھ منٹ بعد وہ اپنے کتے کو پٹا ڈال کر کی جانے والی چہل قدمیوں میں سے ایک کے دوران اپنے ہیڈکوارٹر کی راہ داری میں چل رہا تھا۔ وہ اپنے آپریشن ایک چار منزلہ، خفیہ آفس بلاک سے چلاتا تھا۔

عمارت کے باہر اس کی شناخت کے لیے کوئی سائن بورڈ نہیں لگا ہوا تھا، نہ ہی اس کا کوئی ڈاک کا پتا تھا۔ عمارت کی کار پارکنگ میں داخل ہونے اور وہاں سے باہر نکلنے والی گاڑیوں پر بھی کوئی نمبر درج نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی شہر کا ہر ٹیکسی ڈرائیور کسی نہ کسی طریقے سے اس عمارت کے مکینوں اور ان کے کام کی نوعیت سے متعلق جانتا تھا۔ جنرل اختر ایک گھسے ہوئے سرمئی قالین پر چل رہا تھا، اس کے کانوں میں رات کی شفٹ کی مانوس آوازیں آ رہی تھیں؛ زیادہ تر اسٹاف ڈیوٹی پوری ہونے کے بعد جا چکا تھا لیکن وہ بند کمروں کے پیچھے دھیمی آوازیں سُن سکتا تھا۔ اس کے رات کی شفٹ کے کارکن دور دراز اور ایسے ملکوں میں اپنے آپریٹروں سے بات کر رہے تھے جن پر کسی کا شک ہی نہ پڑے: ایتھوپیا، نیپال، کولوبیا۔ جنرل اختر کے لیے کم از کم ایک دلاسا تو موجود تھا: وہ تیسری دنیا کا دوسرا طاقت ور ترین آدمی تو تھا ہی لیکن جو خفیہ ایجنسی وہ چلا رہا تھا وہ کسی سپر پاور کے شایانِ شان تھی۔

چوں کہ آفس بلاک میں کوئی خاتون کام نہیں کرتی تھی اس لیے ٹوائلٹ پر 'افسران اور مرد حضرات' ہی لکھا تھا۔ جنرل اختر ٹوائلٹ کے سامنے سے گزرا اور راہ داری کے اختتام پر ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا جس پر کوئی نشان نہیں لگا ہوا تھا۔ یہاں ایک درجن سے زیادہ ٹیلی فون آپریٹر دیواروں پر آویزاں آڈیو ٹیپیں ملاحظہ کر رہے تھے جو ٹیلی فون مانیٹروں سے جڑی ہوئی تھیں؛ جیسے ہی زیرِ نگرانی شخص نے فون اُٹھایا ٹیپ رول ہونا شروع ہو گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ یہاں روایتی انداز میں صرف سیاست دانوں، سفارت کاروں اور صحافیوں ہی کے فون ٹیپ ہوتے ہوں؛ جنرل اختر کے بہت سے قریبی ساتھی یہ جان کر حیران ہو جاتے کہ ان کی ہر فون کال اور زبان سے نکلی ہوئی ہر غیر مہذب بات یہاں ریکارڈ ہو چکی تھی۔

مانیٹرنگ روم میں کام کرنے والے آپریٹروں کو سختی سے ہدایت تھی کہ کمرے میں کسی بھی رینک کا افسر آ جائے، وہ اپنے معمول کا کام جاری رکھیں۔ جنرل اختر کمرے

میں داخل ہوا تو ہیڈ فون پہنے ایک درجن سربس خاموشی سے اثبات میں ہلے۔

اس نے قطار میں سب سے پہلے آپریٹر کے کندھے کو تھپتھپایا جو خود کو دیے جانے والے کام میں مکمل طور پر مستغرق تھا۔ آپریٹر نے اپنا ہیڈ فون اتار دیا اور احترام اور مسرت کے ملے جلے جذبے سے جنرل اختر کو دیکھنے لگا۔ ایجنسی میں گیارہ ماہ کام کے دوران جنرل اختر اس سے کبھی مخاطب نہیں ہوا تھا۔ آپریٹر نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی اب تبدیل ہونے والی ہے۔

جنرل اختر نے ہیڈ فون اس کے ہاتھ سے لیا اور خود اپنے کانوں پر لگا لیا۔ اس نے ایک ایسے مرد کی کراہیں سنیں جو ظاہر ہے اپنی مستی کے درمیان میں تھا جبکہ دوسری جانب ایک عورت مادرانہ آواز میں اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ جنرل اختر نے آپریٹر پر بیزاری سے نگاہ ڈالی؛ آپریٹر نے اس سے آنکھ ملانے سے گریز کیا اور کہا، 'وزیرِ اطلاعات ہیں، سر۔' آپریٹر نے خود کو معافی کا طلب گار محسوس کیا، حالانکہ وہ تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔

'مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔' جنرل اختر نے ہیڈ فون اتارتے ہوئے کہا۔ 'میرے دفتر آ جاؤ۔ اسی طرح کے کسی کے ساتھ۔' اس نے ایک چھوٹے سے بلیک باکس کی طرف اشارہ کیا جس نے فون لائن کو ٹیپ ریکارڈر سے جوڑ رکھا تھا۔ 'کوئی نیا والا لانا۔ وہ جو چک کوگن نے ہمیں بھیجے تھے نا، ان میں سے۔' جنرل اختر اثبات میں ہلتے ہوئے سروں کے کورس میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

آپریٹر نے اپنے ساتھیوں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا، وزیرِ اطلاعات کی کراہوں کا گلا گھونٹ دیا اور جنرل اختر کے دفتر پہلی مرتبہ جانے کے لیے اپنے اوزاروں کا ڈبا تیار کرنے لگا۔ اس نے خود کو ایک ایسا آدمی محسوس کیا جسے ملک کے دوسرے طاقت ور ترین شخص نے اپنے ذاتی دفتر میں ایک نہایت اہم کام کے لیے بہ ذاتِ خود منتخب کیا تھا۔ اپنے اوزاروں کا ڈبا تیار کرتے اور اپنی شرٹ سیدھی کرتے ہوئے آپریٹر نے خود کو ملک کا تیسرا

طاقت ور ترین شخص محسوس کیا۔

جنرل اختر کا دفتر اقتدار کی کرسی پر بیٹھے کسی بھی سینئر بیوروکریٹ کے دفتر جیسا تھا: ایک بڑا سا ڈیسک جس پر پانچ ٹیلے فون اور ایک قومی جھنڈا رکھا تھا؛ ایک فریم میں جڑی تصویر بھی تھی جس میں وہ سی آئی اے کے سربراہ بل کیسی کو روسی ہائنڈ مار گرانے والے اسٹنگر میزائل کی کیسنگ تحفے میں دے رہا تھا جبکہ وہ دونوں قہقہہ لگا رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا ٹیلے وژن اور ایک وڈیو پلیئر رکھے تھے۔ اس کی کرسی کے پیچھے دیوار پر جنرل ضیا کا ایک سرکاری پورٹریٹ آویزاں تھا جو اس وقت کا تھا جب اس کی مونچھ کوئی خاص شکل اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھی اور اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ جنرل اختر نے تصویر کو احتیاط سے اتارا اور اس کے پیچھے بنے ہوئے ایک سیف کو کھولنے کے لیے اسے کہیں سے دبایا، ایک ٹیپ باہر نکالی اور اسے وڈیو پلیئر میں لگا دیا۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ اور دھندلی نظر آ رہی تھی اور وہ جنرل ضیا کا چہرا نہیں دیکھ پا رہا تھا، لیکن وہ اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات خوب جانتا تھا اور اس کی آواز کی شناخت میں تو کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ دوسری آواز کچھ دھیمی سی تھی اور وہ آواز نکالنے والا فریم میں بھی نہیں تھا۔

'بیٹے، تم اس ملک کے واحد آدمی ہو جس پر میں اعتماد کر سکتا ہوں۔'

جنرل اختر نے منھ بنایا۔ اس نے پچھلے دو ماہ میں یہ بات کئی کئی بار سنی تھی، بس اس میں 'بیٹا' کا لفظ نہیں ہوتا تھا۔

'سر، آپ کی سکیورٹی میرا فرض ہے اور یہ ایک ایسا فرض ہے جسے ادا کرنے میں مَیں آپ کے سوا کسی اور کے آرڈر کا پابند نہیں ہو سکتا۔ جنرل اختر کا بھی نہیں، خاتونِ اول کا بھی نہیں اور کبھی کبھی تو آپ کا بھی نہیں۔'

اچانک بریگیڈیئر ٹی ایم کا سر اسکرین پر چھا گیا۔ 'سر، یہ ساری تبدیلیاں، میری سکیورٹی کلیئرنس کے بغیر۔'

تصویر میں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس نے جنرل ضیا کو کاغذ کا ایک ٹکڑا تھمایا۔ جنرل ضیا نے کاغذ کو اپنی عینک کے پیچھے سے دیکھا، اپنی جیب میں ڈالا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اور شخص فریم میں داخل ہوا، وہ دونوں اسکرین کے وسط میں ملے اور جنرل ضیا نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ جنرل اختر کرسی پر آگے ہو کر بیٹھ گیا اور ان کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا، جو ان کے معانقے کی وجہ سے اور بھی دھیمی ہو گئی تھیں۔ اس نے سسکیوں کی آواز سنی۔ جنرل ضیا کا جسم کپکپا رہا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اپنے دونوں ہاتھ بریگیڈیئر ٹی ایم کے ہاتھوں میں رکھ دیے، 'بیٹے، تمھیں کسی سے آرڈر وصول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھ سے بھی نہیں۔'

دروازے پر دستک ہوئی۔ جنرل اختر نے ویڈیو ریکارڈر پر اسٹاپ کا بٹن دبایا اور آپریٹر سے کہا کہ وہ اندر آ جائے۔ پھر جنرل کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا جبکہ آپریٹر میز پر رکھے اس کے پانچ ٹیلیفونوں میں سے ایک کے ساتھ جُت گیا۔

جنرل اختر آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اور اس نے اپنے چہرے پر اور جسم کے بالائی حصے پر نظر ڈالی۔ وہ جنرل ضیا سے تین سال بڑا تھا لیکن جسمانی طور پر اس سے زیادہ بہتر ہیئت کا مالک تھا۔ جنرل ضیا کے برخلاف، جو باہر نکلنے سے نفرت کرتا تھا اور جس کے رخسار پھول گئے تھے، جنرل اختر گولف کے ہفتہ وار کھیل کا انتظام کرتا تھا اور کبھی کبھار سرحد پر تعینات فوجی ڈویژنوں کا فیلڈ ٹرپ بھی کر لیتا تھا۔ گولف کا کھیل اسے کچھ ورزش کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی سفیر سے قومی سلامتی کے معاملات پر بات چیت کا بھی موقع دیتا تھا۔

جنرل اختر کے بال اطراف سے کم ہو رہے تھے لیکن اس کے نائی نے اس کی کریوکٹ سے اس کے بڑھتے ہوئے گنج کو ہوش یاری سے کیموفلاج کرنے کا کام خوب کیا تھا۔ وہ یہاں اس آئینے کے سامنے کئی بار کھڑا ہو چکا تھا، جہاں وہ اپنے کندھے پر چوتھا اسٹار لگاتا اور نیوز ویک کے سرورق کے لیے پوز بناتا۔ اس نے نوبیل امن انعام قبول

کرنے کے لیے تقریر کی بھی ریہرسل کر رکھی تھی۔ 'میں نے جتنی بھی جنگیں لڑیں، اور اب خطے کے عوام جس آزادی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اور یہ جو سرد جنگ ایک گرم جوش اور چمک دار امن میں تبدیل ہو گئی ہے۔۔۔'

'کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا مانیٹر چلا دوں، سر؟' آپریٹر نے اس سے پوچھا۔ آپریٹر نے کسی تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اِدھر اُدھر کن سوئیاں لینے کی ترغیب سے باز رہ کر اس نے ایک پیشہ ور جاسوس جیسا رویہ اپنایا تھا۔ کبھی یہ نہ پوچھو کہ کیوں، بس یہ پوچھو کہ کون، کہاں اور کب۔ آپریٹر اپنے آپ پر بہت مسرور ہوا۔

جنرل اختر نے آئینے سے ہٹے بغیر اسے ایک فون نمبر دیا اور آپریٹر کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ جب آپریٹر نے نمبر درج کر لیا تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ اس کے ہاتھ جو اس سے پہلے بڑے پیشہ ورانہ ارتکاز کے ساتھ حرکت کرتے رہے تھے، چھوٹے سے بلیک باکس میں نمبر فیڈ کرتے ہوئے کپکپائے۔ جنرل اختر نے حیرت سے سوچا کہ آپریٹر کیا سمجھ رہا ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کہے گا تو کچھ نہیں، اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ کوئی ٹیلیفون آپریٹر کی بات پر دھیان نہیں دے گا، لیکن پھر بھی اس نے آئینے میں آپریٹر کے عکس کو بہت غور سے دیکھا۔ آپریٹر ایک مرتبہ پھر اپنی پیشہ ورانہ جون میں واپس آ گیا تھا اور اپنے اوزاروں کے ڈبے میں آلات رکھنے میں مصروف تھا۔

وہ اس دفتر سے نکلنے کا سوچ رہا تھا تاکہ اپنی شفٹ کے باقی دو گھنٹے پورے کرے اور اس کے بعد ایک سینما کے سائن بورڈ پینٹر کی حیثیت سے اپنی پارٹ ٹائم جاب شروع کرے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے ایجنسی میں کل وقتی ملازمت مل بھی جائے تو پھر بھی وہ چھٹی پر پینٹنگ کا کام کرتا رہے گا۔ آپریٹر اس حقیقت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا کہ ملک کے دوسرے طاقت ور ترین آدمی نے ابھی ابھی اسے ملک کے طاقت ور ترین آدمی کا ٹیلیفون ٹیپ کرنے کا حکم دیا تھا۔

جنرل اختر کے بہت سے ساتھی جرنیل اسے ایک سرد مُہر، دیکھ بھال کر قدم اُٹھانے والا، بلکہ ایک سفاک آدمی تک بیان کرتے تھے۔ لیکن درحقیقت، جنرل اختر کی سفاکی ہمیشہ اس کی سوچ بچار کا نتیجہ اور اس کی جاب کے عین مطابق ہی ہوتی۔ اسے اپنی جاب پسند نہیں تھی کیوں کہ اسے لوگوں کی بہت ہی نجی بات چیت سننا پڑتی تھی اور لوگوں کو قتل کرانا پڑتا تھا۔ جب وہ اپنا فون اُٹھا کر اپنے ایجنٹوں کو ان لوگوں کی فہرست فراہم کرتا جو قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن رہے ہوتے تو اسے طاقت کا کوئی حقیقی احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب اُسے فون اٹھانا ہی پڑتا تو وہ چاہتا کہ اُس کی ایجنسی کے اہل کار کسی تیار ہتھیار کی طرح جواب دیں۔ وہ چاہتا تو یہی تھا کہ ایسی صورتِ حال پیدا نہ ہو لیکن جب ان عناصر سے نمٹنا پڑ ہی جاتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ یہ کام مستعدی سے کیا جائے۔ اسے گولی کے چیمبر میں پھنسے رہ جانے اور آخری لمحے پر ہدف کے غائب ہو جانے کی کہانیاں پسند نہیں آتی تھیں۔

جب آپریٹر دروازے تک پہنچا اور اس نے اپنا ہاتھ ہینڈل پر رکھا تو جنرل اختر نے کہا: 'تھینک یو۔'

آپریٹر ایک لمحے کے لیے جھجکا، پیچھے مڑا اور مسکرا دیا، اور تبھی جنرل اختر کو احساس ہوا کہ وہ تو اُس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

'تمھارا نام کیا ہے، آپریٹر؟'

آپریٹر نے، جس نے اس سوال کے جواب کی اپنے ذہن میں گیارہ ماہ تک ریہرسل کی تھی، بہت چہک کر جواب دیا، اور ایسا کرتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قدم آگے بڑھا رہا ہے؛ اسے امید تھی کہ اسے سینئر آپریٹر تعینات کر دیا جائے گا، اسے امید تھی کہ اسے اس تنظیم میں لے لیا جائے گا، افسر کے رینک میں اس کی ترقی کر دی جائے گی، شاید اسے ان پرانی کرولا گاڑیوں میں سے کوئی ایک بھی مل جائے جو افسران ہر سال پھینک دیتے تھے جب ان کے نئے ماڈل آجاتے تھے۔

'آپ کا ہم نام ہوں، اختر سر۔ لیکن میرے نام میں E آتا ہے۔ اختر مسیح۔'

جنرل اختر متاثر نہ ہوا۔ اس ملک میں شاید دس لاکھ اختر ہیں، اس نے سوچا، اور بیس لاکھ مسیح۔ اگر وہ ایسے معمولی سے اتفاق کے بارے میں اپنا مُنھ بند نہیں رکھ سکتا تو کیا اس سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دن بھر میں سامنے آنے والے سارے نمبر، سارے نام اور ساری فون کالوں کی تحریری صورت کو بھول جائے گا؟ کیا کسی کرسچن کی خدمات حاصل کرنا عقل مندانہ کام ہے جب کہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ چغلی کرنے کے شوقین ہوتے ہیں؟ جنرل اختر کی ایجنسی میں جو بھی اور کرسچن کام کرتے تھے وہ خاکروب تھے۔ کوئی تو وجہ ہوگی، اس نے سوچا۔

'کیا تمھیں پتا ہے کہ اختر کا کیا مطلب ہے؟'

'یس، سر، ایک ستارہ۔ بہت چمک دار ستارہ۔'

'ایک آپریٹر ہوتے ہوئے بھی تم بہت ذہین ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ رات میں تم جو ستارے دیکھتے ہو ان میں سے کچھ ستارے زندہ نہیں ہوتے۔ وہ لاکھوں سال پہلے مر چکے ہیں لیکن وہ اتنے دور ہیں کہ ان کی روشنی بس اب کہیں آ کر ہم تک پہنچی ہے۔'

آپریٹر اختر اس روز کام ختم کر کے بس اسٹاپ کی طرف چلا تو اس کے قدموں میں ایک نیا ولولہ تھا۔ اسے زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ دھوئیں سے بھری ہوئی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں خوش بو دار محسوس ہو رہی تھی، اس کے کان پرندوں کی چہچہاہٹ سن سکتے تھے، بس کے ہارن ہوا میں گونجتی ہوئی محبت کے سُر تھے جو منتظر تھے کہ کوئی انھیں ہوا سے توڑ کر لفظوں میں ڈھال لے۔ نہ صرف اپنے باس سے اس کا نام ملتا تھا، بلکہ اس کی موروثی ذہانت کو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا: 'ایک آپریٹر ہوتے ہوئے بھی تم بہت ذہین ہو۔' 'ایک آپریٹر ہوتے ہوئے بھی۔ تم بہت ذہین ہو۔' جنرل اختر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جو لوگ سوچتے تھے کہ جنرل بہت مغرور ہے وہ صاف ظاہر ہے کہ اس کی توجہ کے قابل ہی نہیں تھے، آپریٹر اختر نے سوچا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپریٹر اختر کچھ بے احتیاط سا تھا، ان لوگوں کی طرح بے احتیاط جنھوں نے ابھی ابھی وہ خوش خبری سنی ہو جس کا وہ ساری زندگی انتظار کرتے رہے تھے۔ یہ کہا جانا بھی ضروری ہے کہ آپریٹر اختر نشے میں نہیں تھا، نہ ہی وہ اندھا دھند چلا کرتا تھا۔ اس نے سڑک پر ایک ایسے آدمی کی طرح قدم رکھا جس کی قسمت ابھی ابھی بدل گئی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دائیں دیکھا نہ بائیں؛ تقریباً ایسا تھا کہ اسے توقع تھی کہ ٹریفک اس کے خود دائیں بائیں ہو جائے گی۔ یہ حقائق ہیں اور جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ لیکن جو کار آپریٹر اختر کی جانب بڑھی اس کا ارادہ پختہ تھا اور جب وہ اپنے ہدف سے ٹکرائی تو وہ ذرا بھی نہیں جھجکی؛ وہ اسے پیڈسٹرین کراسنگ پر چلنے کی تمیز نہ ہونے پر سبق سکھانا نہیں چاہتی تھی، وہ اس کی ٹانگیں توڑنا اور اس کی خوش فہمی کی سزا کے طور پر اسے معذور کر دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نہیں، اس کار کے ڈرائیور کا ذہن بہت واضح تھا اور کسی عام سڑک کے حادثے سے کہیں زیادہ پختہ عزم کا مالک۔ اپنی ٹوٹی ہوئی پسلیوں کی جانب سے اپنے پھیپھڑوں میں سوراخ کر دینے اور اپنے دل کی جانب سے اسے زندہ رکھنے کی آخری بے سود کوشش کے طور پر جنونی انداز میں خون پمپ کرنے کے بعد اور اپنی آنکھوں سے زندگی کے رخصت ہو جانے سے پہلے آپریٹر اختر کو ایک حیرت، اپنی زندگی کی آخری حیرت کا سامنا کرنا پڑا، کہ جس سفید کرولا نے اسے کچل دیا تھا، اس پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں لگی ہوئی تھی۔

جنرل اختر نے اپنے نئے فون کا ریسیور اُٹھایا جسے آپریٹر اختر نے لگایا تھا، جنرل ضیا کو کال ملائی اور انٹیلی جینس چیف کی حیثیت سے مستعفی ہونے کی پیش کش کی۔

'اس کرسچن پر مجھے اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا، سر۔'

'وہ کون تھا؟'

'وہ پینٹر سر، جس نے یہ پورٹریٹ بنائی۔ اختر مسیح۔'

'کیا اس نے آپ کو بتایا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟'

'نہیں، سر۔ اس کا ایک کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔'

جنرل ضیا نے آہ بھری۔

'تم اس ملک کے واحد آدمی ہو جس پر میں اب بھی اعتماد کر سکتا ہوں۔'

'یہ ایک اعزاز ہے، سر۔'

'شگری کے بیٹے کی طرف سے ایک پیغام آیا تھا کہ۔۔۔'

'اسے جوابی کال کرنے کی ضرورت نہیں، سر۔ وہ پہلے ہی ہماری تحویل میں ہے۔ میں اس کا بیان خود آپ کے پاس لاؤں گا، سر۔ وہ ایک چھوٹا سا کارندہ تھا اور ہمیں اس سے بہت زیادہ کچھ مل گیا ہے جس کی ہمیں توقع تھی۔ وہ تو ایک بڑی سازش کی صرف ایک چھوٹی سی کڑی ہے، سر۔۔۔'

'اس سے خود جا کر بات کرو۔ میرا سلام دینا اسے۔'

'ایک اور فوری نوعیت کا معاملہ ہے، سر۔ قومی دن کی پریڈ۔'

'میں کوڈ ریڈ کے ہوتے ہوئے پریڈ میں کیسے جا سکتا ہوں۔'

'سر، دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جس کا قومی دن نہ ہوتا ہو۔'

'کیا ہم قومی دن کی پریڈ کے بغیر قومی دن نہیں منا سکتے؟' جنرل ضیا اپنے خیال پر بہت پر جوش ہو گیا۔ 'ہم یہاں آرمی ہاؤس میں قومی دن منا لیں گے۔ چلو کچھ بیواؤں کو بلوا لیتے ہیں۔ نہیں، چلو ایسا کرتے ہیں کہ اس قومی دن کو ہم یتیموں کا قومی دن قرار دے دیتے ہیں۔ کچھ بچے لے آتے ہیں اور کچھ جھولے وغیرہ لگا لیتے ہیں۔'

'سر، لوگ قومی دن پر فوجی پریڈ چاہتے ہیں۔ وہ ٹینک دیکھنا چاہتے ہیں اور پاس سے گزرتے ہوئے جنگی طیاروں کو دیکھ کر ان کی طرف ہاتھ ہلانا چاہتے ہیں۔'

'لیکن وہ سیکیورٹی پروٹوکول...'

'سر، ہم قومی دن کی پریڈ جس دن آپ چاہیں رکھ لیتے ہیں۔ ہم اسے ریکارڈ کر لیں گے اور پھر قومی دن پر نشر کر دیں گے۔'

اسی لمحے جنرل ضیا کو احساس ہو گیا کہ وہ اب تک اختر سے چھٹکارا حاصل کیوں نہیں کر پایا تھا۔ وہ ہمیشہ دشمن سے ایک قدم آگے رہا کرتا تھا، چاہے دشمن نظر نہ بھی آ رہا ہوتا۔

جنرل اختر نے خاموشی کے اس وقفے کو قومی دن کی پریڈ کے انتظامات کرنے کے لیے اس کی رضامندی جانا، اور یہ تھا بھی درست۔

'بریگیڈیئر ٹی ایم تک میرا شکریہ پہنچا دیجیے گا، سر، کہ انھوں نے یہ کیمرا ڈھونڈ نکالا۔ میں ان کی ترقی کی سفارش کرتا لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ملک کے پاس بس وہی تو ایک حقیقی ہیرو ہیں۔'

۲۱

'کیا تم تیار ہو؟' فرنٹ سیٹ سے میجر کیانی کی آواز پوچھتی ہے۔ میں کچھ کہے بغیر سر ہلا دیتا ہوں۔ وہ جیپ کے پچھلے حصے کی طرف آتا ہے، دروازہ کھلتا ہے۔ میں ایک گہری سانس لیتا ہوں اور دروازے کی طرف بڑھتا ہوں؛ اس کوشش میں میرا سر چکرا جاتا ہے لیکن میں اپنا دوسرا قدم آگے بڑھا دیتا ہوں اور اپنے پیروں کے نیچے زمین کو ٹھوس اور پر تپاک پاتا ہوں۔ میجر کیانی میری پٹی کی گرہ کھولتا ہے۔ ہم ایک ایسی کار پارکنگ میں ہیں جو سفید رنگ کی کرولا کاروں سے بھری ہوئی ہے، جن میں سے زیادہ تر بغیر نمبر پلیٹ کے ہیں۔ واحد استثنیٰ ایک سیاہ مرسیڈیز ہے جس کی بغیر نمبروں والی پلیٹ پر تین کانسی کے ستارے ہیں اور جس پر پلاسٹک کی چھوٹی سی میان میں ڈھکا ہوا ایک جھنڈا ہے۔ ہر جانب دفتری عمارت ہمیں گھیرے ہوئے ہیں جن کا پیلا رنگ دھندلا رہا ہے اور جن میں لوہے کی سلاخوں والے ایسے گیٹ ہیں جو سیڑھیوں کی جانب لے جاتے ہیں۔ ان عمارتوں کی چھتوں سے اگنے والے انٹینوں اور سیٹلائٹ ڈشوں سے پرے میں اسلام آباد کی دھند سے ڈھکی پہاڑیوں کو دیکھ سکتا ہوں۔

ہم جنرل ضیا سے ملاقات نہیں کر رہے۔

میجر کیانی پیچھے دیکھے بغیر میرے آگے آگے چلتا ہے اور ایک گیٹ میں سے داخل ہو جاتا ہے۔ میں بند دروازوں کے پیچھے سے الیکٹرانک مشینوں کی ہم م م م جیسی آواز سنتا

ہوں۔ وردی میں ملبوس ایک سپاہی میجر کیانی کو سلیوٹ کرتا ہے، دروازہ کھولتا ہے اور ایک بار پھر سلیوٹ کرتا ہے۔ میجر کیانی جواب دینے کا تکلف نہیں کرتا۔ میں سپاہی کی طرف دیکھتا ہوں اور اپنا سر ہلاتا ہوں۔ میجر کیانی چلتا ہوا دائیں ہاتھ پر پہلے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک سیاہ جم بیگ کے ساتھ باہر نکلتا ہے جو وہ میرے حوالے کر دیتا ہے۔
ہم ایک سفید دروازے کے سامنے رکتے ہیں جس پر لکھا ہے 'صرف افسران کے لیے'۔
میں اندر داخل ہوتا ہوں اور جراثیم کش اسپرے کی میٹھی خوش بو سونگھتا اور بہتے ہوئے پانی کی آواز سنتا ہوں۔ میجر کیانی دہلیز پر ہی کھڑا رہتا ہے اور کہتا ہے: 'نہا دھو لو، تم ایک وی آئی پی کے ساتھ لنچ کرنے والے ہو۔' میں اسے واپس جاتے ہوئے سنتا ہوں۔ میں جم بیگ کے اندر جھانکتا ہوں اور مجھے وہاں صابن کی ایک ٹکیا، ایک ریزر، ٹوتھ برش، ایک نئی وردی اور پرفیوم کی ایک شیشی ملتی ہے: پوائزن۔

میں کس کے ساتھ لنچ کرنے والا ہوں کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں پرفیوم لگا کر جاؤں؟ کیا ابا کا کوئی مہربان مجھے مصیبت سے نکالنے آ رہا ہے؟

میں غسل خانے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہوں اور مجھے ایک بھوت نظر آتا ہے۔ میری آنکھیں دو کھوکھلے سرخ تالاب بن چکی ہیں، میرا چہرہ خشک کیکٹس کی طرح ہے، میری وردی کی شرٹ پر سالن کے داغ ہیں۔

خود پر ترس آنے کی ایک لہر میرے دل کی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے۔ میں یہ کہہ کر اسے دبانے کی کوشش کرتا ہوں: ٹھیک ہے، میں ایک ایسے آدمی کی طرح لگ رہا ہوں جو گندے غسل خانوں اور مغل بچہ خانوں میں رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار مجھے لنچ کی دعوت بھی تو مل جایا کرتی ہے نا۔

میری حرکات ست رَو ہیں۔ میں ٹونٹی کھولتا ہوں اور اپنی شہادت کی انگلی کا پوٹا پانی میں ڈالتا ہوں۔ میں آئینے میں دیکھتا ہوں۔ جو شخص مجھے گھور رہا ہے وہ میرے لیے اب بھی اجنبی ہے۔ انھوں نے غالباً عُبید کی الماری صاف کر دی ہوگی، اس کی کتابوں اور

کپڑوں کو ایک صندوق میں بند کر دیا ہوگا اور اس صندوق کو کسی اسٹور میں رکھ دیا ہوگا۔ انھوں نے مجھے یہ پرفیوم کی شیشی اس لیے بھیجی ہے تاکہ میں یہ جان سکوں کہ میں یہاں آیا کیوں ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ انھوں نے عُبید کے والد کے لیے اس سب کی وضاحت کیسے کی ہوگی۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کا بیٹا کوئی شہید ہے۔ میری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔

میں جلدی سے پہلے اپنی آنکھوں اور پھر اپنے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارتا ہوں۔ میں اپنی شرٹ اپنی پتلون سے باہر نکالتا ہوں، اپنے جوتے اتارتا ہوں اور اپنی کمر تک برہنہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ میں کسی کھڑکی کو دیکھنے کے لیے ارد گرد نظر دوڑاتا ہوں۔ وہاں ایک چھوٹا سا پنکھا دیوار میں نصب ہے لیکن اس کا خلا بہت چھوٹا ہے اور غالباً کسی ایسے کمرے میں کھلتا ہے جو مسلح محافظوں سے بھرا ہوا ہے۔

تو ہم لنچ کریں گے پھر۔

میجر کیانی باہر سے چلّا کر آواز لگاتا ہے: 'تم جنرل صاحب کو انتظار کرانے کے خواہش مند تو نہیں ہو گے، یا تم ہو خواہش مند؟'

میں ایک ڈائننگ روم میں ہوں، ایک باقاعدہ قسم کا ڈائننگ روم جس میں سفید میز پوش، سفید چائنا اور اورنج جوس کا ایک جگ رکھا ہے۔ چاندی کے چمکتے ہوئے ڈش کور کمرے میں اِدھر اُدھر بہتی پھرتی خوش بوؤں کو روک نہیں پا رہے۔ لگتا ہے کہ قیدی مر گیا اور اب سیدھا جنت کو گیا ہے۔

میجر کیانی دہلیز پر کھڑا رہتا ہے، اپنے ڈن ہل سگریٹ کے کش لیتا ہوا، اپنی درمیانی انگلی پر چڑھی سونے کی انگوٹھی سے کھیلتا ہوا۔ لگتا ہے اسے میز پر منتظر پڑے کھانے کی کوئی فکر نہیں۔ میں ان سرپوشوں کو ہٹائے جانے کا انتظار نہیں کر پا رہا۔ سلاد کی پلیٹ میں رکھے پیاز کے حلقے بھی میرے دل کی رفتار تیز تر کر رہے ہیں۔ میجر کیانی باہر راہ داری میں جھانکتا ہے اور اور کچھ قدم باہر کو جاتا ہے۔ میں اورنج جوس کے جگ پر حملہ کر دیتا ہوں

اور اپنے لیے ایک گلاس میں جوس ڈالتا ہوں۔ میرا منھ جو پچھلی کئی راتوں کے ہول ناک ذائقوں کے سبب چھلا ہوا ہے، جوس اسے کاٹتا ہے، لیکن میرا حلق اسے خوش آمدید کہتا ہے اور میں ایک بڑی سی ڈیک لگا کر گلاس خالی کر دیتا ہوں۔ راہ داری میں قدموں کی آواز قریب آتی ہے۔ ایڑھیاں چٹختی ہیں۔ میجر کیانی کا قہقہہ تابع دارانہ اور نروس ہو جاتا ہے۔

جنرل اختر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے میجر کیانی اور سفید وردی میں ملبوس ایک پگڑی والا ویٹر۔ میں کھڑا ہو جاتا ہوں اور اپنی ایڑھیاں جوڑتا ہوں، اور اچانک خود کو اس لنچ کا میزبان تصور کرتا ہوں۔ جنرل اختر میز کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ میجر کیانی اپنی کرسی کے کنارے پر پیٹھ ٹکا دیتا ہے۔ مجھے ٹھیک سے نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ 'بیٹھ جاؤ، بیٹے۔' جنرل اختر ایک شفیق مسکراہٹ مجھ پر نچھاور کرتا ہے جیسے دنیا میں وہ واحد آدمی ہو جو مجھے سمجھتا ہو۔ اس کے اعمال اس کے بالکل برعکس ہیں۔ میں کھانا چاہتا ہوں۔ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔

'میں نے تمھاری فائل دیکھی ہے۔' وہ اپنی پلیٹ میں چھری کانٹے کو از سرِ نو ترتیب دیتے ہوئے کہتا ہے۔ 'تم نے اپنے والد کا سا تیز ذہن پایا ہے لیکن یہ بات بہت واضح ہے کہ وہ لڑکا، وہ تمھارا دوست ۔۔۔' وہ میجر کیانی کی جانب دیکھتا ہے جو کہتا ہے، 'عُبید، سر۔ عُبید اللہ ۔۔۔'

'ہاں، وہ لڑکا عُبید زیادہ ہوش یار نہیں تھا۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ وہ جہاز اڑا کر کہاں جانا چاہ رہا تھا کیوں کہ تم نے میجر کیانی کو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ تم نہیں جانتے۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ اس لڑکے عُبید نے غالباً کچھ زیادہ ہی کتابیں پڑھی ہیں اور یقیناً ان میں سے زیادہ تر کو سمجھا بھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بجائے تم نے کوئی زیادہ بہتر آئیڈیا سوچا ہوتا۔'

میں پہلی مرتبہ سر اُٹھا کر اس کی جانب دیکھتا ہوں اور میری بھوک ختم ہونے لگتی ہے۔ جنرل اختر اپنی سنہری پٹیوں اور چمک دار تمغوں کے ساتھ یوں سجا ہوا ہے جیسے قربانی کے لیے تیار کی جانے والی کوئی گائے۔ مجھے یقین ہے کہ اتنا تکلف اس نے محض مجھ سے ملاقات کی خاطر نہیں کیا۔ اس نے یہ تیاری پارٹی پر جانے کے لیے کی ہے۔ وردی میں ملبوس دو افراد کی لنچ پر ملاقات: ایک چار جولائی کی پارٹی کے لیے تیار، دوسرا ایک مغل بچہ خانے سے مختصر رخصت پر آیا ہوا۔

پارٹی پر جانے سے پہلے کھا کیوں رہا ہے یہ؟ میں سوچتا ہوں۔ اور وہ میرے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ وہ خفیہ ایجنسی کا سربراہ یوں ہی تو نہیں بنایا گیا۔

'میں ہمیشہ پارٹی پر جانے سے پہلے کھانا کھا لیتا ہوں، کیوں کہ آپ کو نہیں پتا ہوتا کہ وہاں آپ کو کیا ملے گا۔ اور آج تو دو دو پارٹیاں ہیں۔ ہم آج ہی قومی دن کی پریڈ بھی منعقد کر رہے ہیں۔' وہ پیتل کی ایک ڈش اُٹھاتے ہوئے کہتا ہے۔ وہ روسٹ کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ڈھیر پر سے ایک بٹیر اُٹھاتا ہے اور پلیٹ میری جانب بڑھا دیتا ہے۔

میں ایک چھوٹا سا پرندہ اپنی پلیٹ میں رکھتا ہوں اور بڑی دیر تک اسے گھورتا رہتا ہوں جیسے مجھے امید ہو کہ وہ اپنے پر دوبارہ اُگا لے گا اور کہیں دور پرواز کر جائے گا، لیکن وہ اپنی کُرکُری بھوری جلد کے ساتھ، جو اس کے ہر جوڑ کی جگہ پر سیاہ پڑ گئی ہے، وہیں پڑا رہتا ہے۔

'جب میں تم سے بات کر رہا ہوں تو میری طرف دیکھا کرو۔' جنرل اختر اپنی پلیٹ میں گھورتے ہوئے کہتا ہے۔ پھر وہ اپنا سر اُٹھاتا ہے اور مجھے ایک پدرانہ مسکراہٹ پیش کرتا ہے جیسے کھانے کی میز کے آداب وہ واحد معاملہ ہو جس کی اسے پروا ہو۔

میں سر اُٹھاتا ہوں اور ایک گنجا ہوتا ہوا سر اور پتلے زرد ہونٹ دیکھتا ہوں جنھوں نے غالباً کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں بولا جو اس کے دل سے نکلا ہو۔

میں ایک ہاتھ سے اپنا کانٹا سنبھالتا ہوں اور اپنا دوسرا ہاتھ چپکے سے میز کے نیچے لے جا کر اپنے خصیے مروڑتا ہوں۔ روسٹ کیے ہوئے پرندوں کی اس دعوت کا پس منظر خود

کو یاد دلانے کے لیے مجھے کسی درد کی ضرورت ہے۔

اس کے ایک ریٹائرڈ باکسر والے ہاتھ کے کنارے پر رکھا پرندہ اور بھی چھوٹا نظر آتا ہے۔ سینے کا ایک پورا حصہ اس کے منھ میں چلا جاتا ہے اور وہ اپنے پتلے ہونٹوں سے چوڑی ہوئی ہڈیوں کا ایک ڈھانچا باہر نکالتا ہے۔ وہ ایک پیلی مسکراہٹ مسکراتا ہے اور ایک خشک سفید نیپکن سے اپنے پتلے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتا ہے۔

'یہ میرے لیے آسان نہیں ہے۔' وہ ایک اور سرپوش اُٹھاتا ہے اور کھیرے کی ایک قاش چبانا شروع کر دیتا ہے۔ 'میری دوستی بھی ہے اور پھر ملک سے وفاداری کا سلسلہ بھی ہے۔ اگر آپ اپنے باپ کے وفادار نہ ہوں تو کیا آپ ایک دوست سے وفادار ہو سکتے ہیں؟ دیکھو، ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'

یہ بھائی چارہ جس رفتار سے بڑھ رہا ہے اس پر میں حیران ہوں۔

میں اس بات پر بھی حیران ہوں کہ ابا اسے جنرل چمپ کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ شخص بالکل ایک خزندہ لگتا ہے۔ ارتقا ایک غلط موڑ مُڑا اور یہ شخص چانے اور پنجے بڑھانے کے بجائے ایک ممالیا بن گیا۔

'مجھے امید ہے کہ تم نے اسے جس جگہ رکھا ہے وہاں اسے آرام ہوگا۔' وہ میجر کیانی سے کہتا ہے، جو اپنا چھری کانٹا نیچے رکھ کر اپنے نیپکن میں کچھ بڑبڑاتا ہے۔ شاید قلعہ میں کمروں کی دست یابی کے بارے میں۔

'تم نے اسے اُس گٹر میں بند کر رکھا ہے؟' وہ شکایتی نظروں سے میجر کیانی کی جانب دیکھتا ہے۔ 'کیا تمھیں پتا بھی ہے کہ یہ ہے کون؟' میجر کیانی اپنا نیپکن واپس رکھ دیتا ہے اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سر اوپر اُٹھاتا ہے۔

'کیا تم نے کبھی کرنل شگری کے ساتھ کام کیا ہے؟'

'نو، سر، مجھے اس عزت افزائی کا موقع نہیں ملا۔ میں نے کرنل صاحب کی اندوہ ناک موت کے حالات کی تحقیقات کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کاغذی کارروائی میں اس

نوجوان کی مدد بھی کی تھی۔'

'وہ ایک با اصول شخص تھا۔ اس نے زندگی اپنے اصولوں کے تحت گزاری اور وہ اپنے اصولوں پر ہی مرا۔'

جنرل کی حسِ مزاح میری بھوک میں بالکل بھی معاون ثابت نہیں ہو رہی۔ 'لیکن، میرے بیٹے۔' وہ میری جانب مُڑتا ہے، 'یہاں یہ بات واضح ہے کہ تم نے اپنا وقار برقرار رکھا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں بھی تم نے اپنا سر بلند ہی رکھا۔' وہ اپنی گود سے ایک نہ نظر آنے والا روئی کا بھورا اُٹھاتا ہے۔ 'اور یہ چیز، میرے پیارے بیٹے، خون سے، ایک اچھے خاندان سے آتی ہے۔ تمھارے والد کو تم پر فخر ہوتا، میرے بیٹے۔'

آخر یہ مجھے 'میرے بیٹے' کیوں کہے چلا جا رہا ہے؟ مجھے تو کبھی میرے باپ نے بھی 'میرے بیٹے' نہیں کہا۔

'جیسا کہ تمھیں اندازہ ہوگا، یہ سب میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ایک طرف میرے مرحوم دوست کا بیٹا ہے جس نے پہلے ہی اپنی زندگی میں بہت سے دکھ دیکھے ہیں۔ دوسری طرف ملک کی سلامتی ہے جو میری ذمّے داری ہے۔' وہ اپنے بازو اُٹھاتا ہے اور اپنی چھری اور کانٹے سے اپنے سینے کی جانب اشارہ کرتا ہے اور اپنے ٹاسک کے بہت بڑا ہونے کی وضاحت کرتا ہے۔

'میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟'

میں کسی اور کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے منھ کو چھوٹے چھوٹے پرندوں سے ٹھونسنا بند کر دیتا، میں کہنا چاہتا ہوں۔

'میں وہ سب نہیں جانتا جو آپ جانتے ہیں، سر۔' میں اپنے دلی جذبات سے انحراف کر کے اپنے لہجے میں ایک ٹرک کے برابر عاجزی انڈیلتے ہوئے کہتا ہوں۔ 'اور آپ جتنا تجربہ تو مجھے بالکل بھی نہیں۔' میں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ ایسی باتیں مزید سننا چاہتا ہے اس لیے میں سیکرٹری جنرل کی میرے خلاف مسلسل لعن طعن میں سے ایک فقرہ منتخب کر کے اس

کی طرف اچھالتا ہوں۔ 'اسی لیے تو آپ وہاں ہیں جہاں آپ ہیں، اور میں وہاں ہوں جہاں میں ہوں۔' میں وہ نہیں کہتا جو کامریڈ ہمیشہ اس فقرے کے بعد کہا کرتا تھا: ہم دونوں اندھے ہو جائیں گے اور ہم زندگی میں دوبارہ کسی عورت کو چھوئے بغیر مر جائیں گے۔

'میں تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں جس سے تمھیں میرا مخمصہ سمجھنے میں آسانی ہوگی،' جنرل اختر کہتا ہے، 'ایک سچی کہانی۔ میں تمھاری عمر کا تھا، انڈین آرمی میں لیفٹیننٹ تھا، یہی کوئی پارٹیشن سے کچھ مہینے پہلے کی بات ہوگی۔ مجھے ایک ٹرین کے ساتھ جانے کا حکم دیا گیا جو امرتسر جانے والے ہندوؤں سے بھری ہوئی تھی اور مجھے کہا گیا کہ یہ بات یقینی بناؤں کہ ٹرین حفاظت سے وہاں پہنچ جائے۔

'تم نے بھارتی پنجاب سے مسلمانوں کو لے کر لاہور آنے والی ٹرینوں کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔ کٹی پھٹی لاشوں سے بھری ہوئی۔ اور وہ کہانیاں بھی سچی تھیں کہ کیسے ان بچوں کو جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے ان کی ماؤں کے پیٹوں سے نکالا گیا اور ان کے سر نیزوں پر چڑھائے گئے۔ میں نے ان میں سے کوئی چیز خود نہیں دیکھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ سب سچی تھیں۔ لیکن آرڈر تو آرڈر تھا، اور میں ٹرین کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اپنی پلاٹون کو بتایا کہ ٹرین پر موجود ہر ایک مسافر میری ذمے داری ہے۔

'جیسے ہی ہم لاہور سے نکلے ہمارا سامنا چاقوؤں اور ڈنڈوں اور مٹی کے تیل کی بوتلوں سے لیس لوگوں کے جتھوں سے ہوا جو ٹرین کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنا انتقام لے سکیں۔ میں آنکھ کے اشارے سے انھیں دور بھگاتا رہا۔ میں نے انھیں بتایا کہ سیکیورٹی فوج کی ذمے داری ہے۔ ہمارے نئے ملک کو ان ریل گاڑیوں کی ضرورت پڑے گی۔ انھیں تباہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے مسافروں سے بھی بات چیت جاری رکھی، اور انھیں یقین دلایا کہ میں انھیں امرتسر پہنچا دوں گا۔ ہم ایک گھونگے کی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ میں حملہ آوروں کو دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ایک مرحلہ ایسا آیا جب میری ملٹری ٹریننگ نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ میں نے جان لیا کہ میرا نیا

ملک مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے صوبیدار میجر کو بلایا اور اسے بتایا کہ ہم عشا کی نماز کے لیے ٹرین روک دیں گے۔ میں ٹرین سے دو سو گز دور نماز پڑھنے چلا جاؤں گا۔ اور پھر میں نماز پڑھ کر واپس آؤں گا۔" کیا تم جانتے ہو کہ عشا کی نماز کتنی طویل ہوتی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ میں نے اس کا جواب نہیں سنا۔ "بس اتنا ہی وقت ہے تمھارے پاس۔" میں نے کہا۔

'دیکھا تم نے، یہ مشکل کام تھا لیکن تھا منطقی۔ مجھے جو آرڈر ملا تھا میں نے اس کی بھی حکم عدولی نہیں کی اور جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ بھی کم سے کم شور شرابے کے ساتھ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی نوزائیدہ بچے کو میری آنکھوں کے سامنے نیزے پر اچھالا جائے۔ لیکن میں یہ بہانہ بنا کر ایک طرف کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا کہ جی میں تو پروفیشنل ہوں۔ تاریخ ایسے ہی عظیم ستھراؤ اور ناخوش گوار چیزیں سامنے لاتی ہے۔ کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہے نا۔'

میں آہستگی سے اپنی پلیٹ پرے کر دیتا ہوں، جس میں پرندہ اپنی آدھی کھائی ہوئی ٹانگ کے علاوہ صحیح سلامت ہے۔

'میرے پیارے بیٹے، میں تمھیں اس سے نکالنے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو میری بس میں ہے لیکن میں ایسے کسی آدمی کے بارے میں کیا کر سکتا ہوں جو ہماری قومی سلامتی سے پنگا لے رہا ہو؟ کیا تمھیں پتا بھی ہے کہ تمھارا وہ دوست۔۔۔' وہ میجر کیانی کی جانب دیکھتا ہے جو لقمہ دیتا ہے۔ 'عبید، سر، عبید اللہ۔'

'ہاں، کیا تمھیں پتا بھی ہے کہ وہ جا کہاں رہا تھا؟'

'مجھے نہیں پتا سر، مجھے نہیں پتا۔'

'ویل، ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ کہاں جا رہا تھا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس چیز سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ بس اب مجھے مایوس مت کرنا۔ بس وہی کرو جو ضروری ہے۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انھیں پتا کیسے چلا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کتنی دور جانے میں کام یاب ہوا تھا۔ اسے انھوں نے پکڑا کیسے؟ زمین سے فضا میں مار کرنے والا میزائل؟ پیچھا کرنے والے کسی جہاز سے کوئی وار؟ کیا اس نے کنٹرول روم کو کوئی آخری کال کی تھی؟ کیا اس کے بلیک باکس سے کوئی پیغام ملا؟

بے بی او نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا، سوائے میرے لیے پرفیوم کی ایک شیشی کے۔

'تمھیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ میجر کیانی ہیں جو تمھاری طرف سے ایک بیان لکھ دیں گے۔ اس پر دست خط کر دینا اور باقی چیزیں میں سنبھال لوں گا۔ یہ تم سے جنرل اختر کا وعدہ ہے۔ تم واپس اکیڈمی جا کر اپنے والد کا مشن پورا کر سکتے ہو۔'

میرے والد کے مشن کے بارے میں وہ کیا جانتا ہے؟

میں اپنی گود سے نیپکن اُٹھاتا ہوں اور زمین پر اپنے پیر مضبوطی سے جما دیتا ہوں۔

'سر، ہو سکتا ہے کہ آپ کے لوگ آپ کو ہمیشہ صرف سچ نہ بتا رہے ہوں۔ میں آپ کے حکم پر عمل کروں گا لیکن ایک لمحے کے لیے میرا کیس بھول جائیے، میرے برابر والے سیل میں ایک آدمی ہے، خاک روبوں کا نمایندہ، جو وہاں نو سال سے پڑا ہے۔ ہر شخص اسے بھول چکا ہے، اس پر کبھی فردِ جرم بھی عائد نہیں کی گئی۔'

جنرل اختر میجر کیانی کی جانب دیکھتا ہے۔ 'یہ نا اہلی کی انتہا ہے۔ تم ابھی تک اس بے وقوف انقلابی جمعدار کو پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا خیال ہے تمھیں اسے جانے دینا چاہیے۔' وہ اپنی کیپ اُٹھاتا ہے اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو 'میرے پیارے بیٹے، میں نے وہ سب کر دیا جو تم نے مجھ سے کہا، اب جاؤ اچھا بچہ بن کر دکھاؤ' اور پھر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

میں اپنی کرسی سے اُٹھتا ہوں، میجر کیانی پر ایک فاتحانہ نظر ڈالتا ہوں اور جنرل اختر کے پیٹھ پیچھے اسے سلیوٹ کرتا ہوں۔

۲۲

فوجی بینڈ نے 'اے مردِ مجاہد جاگ ذرا، اب وقتِ شہادت ہے آیا' کی دھن چھیڑی۔ کسی اور موقع پر جنرل ضیا اس کے ساتھ ساتھ ضرور گنگناتا، لیکن اس وقت وہ بڑے تجسّس کے ساتھ ٹینکوں کی قریب ہوتی ہوئی صف کو دیکھ رہا تھا۔ وہ قومی دن کی پریڈ کو صدارتی ڈائس سے دیکھ رہا تھا اور اس کے گرد سرخ کم خواب کی بنی ہوئی رسّی اسے ایم فور ون واکر بل ڈاگ ٹینکوں کے فحش طویل دہانوں سے دفاع کے لیے اچانک ناکافی محسوس ہوئی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ مرحوم مصری صدر انور سادات کے بارے میں نہ سوچے، جو اسی طرح کی ایک پریڈ کا معائنہ کرتے ہوئے، اسی طرح کے ٹینکوں کی ایک صف کا سلیوٹ قبول کرتے ہوئے، اسی طرح کے ایک ڈائس پر کھڑا ہوا قتل کر دیا گیا تھا۔

جنرل ضیا اس ڈائس پر جنرل اختر کے ساتھ کھڑا تھا جس نے قوم کو صحیح سگنل پہنچانے کے لیے اپنی پُر زور دلیلوں کے ذریعے جنرل ضیا کو اس پریڈ میں شرکت پر آمادہ کر لیا تھا، لیکن اب جنرل اختر خود اس کی کارروائی سے بور ہو رہا تھا۔ جب سے جنرل ضیا حضرت یونس کی دعا پر لڑکھڑایا تھا، یہ آرمی ہاؤس سے باہر قدم نکالنے کا اس کا پہلا موقع تھا۔ پریڈ بھی کوڈ ریڈ کے تحت ہو رہی تھی اور اگر کوئی بن بلایا پرندہ بھی اس کے اوپر کے فضائی حصار میں گھسنے کی کوشش کرتا تو خود کو نشانہ بازوں کا ہدف بنا ہوا پاتا۔ ضیا نے مہمانوں کی فہرستوں کا خود جائزہ لیا تھا، اور تمام غیر معروف نام کاٹ دیے تھے۔ پھر بریگیڈیئر ٹی ایم

نے ان تمام لوگوں کے نام بھی کاٹ دیے جن کا ماضی بعید میں کسی ایسے شخص کے ساتھ تعلق کا امکان تھا جس نے جنرل ضیا کی مونچھ یا اس کی خارجہ پالیسی کے بارے میں شاید کوئی منفی بات کہی ہو۔ پریڈ کے بعد گھل مل جانے کے لیے ہجوم بھی نہیں تھا۔ جنرل ضیا تو اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ پریڈ سنہری پٹیوں، اکڑی ہوئی خاکی وردیوں اور آکسفورڈ کے قطار اندر قطار چمکتے ہوئے جوتوں کی ایک دھندلی سی تصویر کی طرح لگتی تھی۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کے اپنے ساتھ نہ ہونے کے باعث وہ خود کو نشانے پر محسوس کرتا تھا؛ ہجوم کو اس سے دور رکھنے کے لیے کوئی نہیں تھا، کسی قاتل کی گولی اور اس کے درمیان آجانے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ پاکستان ٹیلے وژن کے لیے پریڈ کی ریکارڈنگ کرنے والے ٹیلے وژن کیمروں نے اس کے اضطراب کو اس کی پسینے سے بھری تمام تفاصیل کے ساتھ مقید کر لیا۔ ان کے بالکل برعکس جنرل اختر کے چہرے پر کسی جذبے کے کوئی آثار نہیں، بس ایک خاموش سپاہی کا بے سخن افتخار نمایاں تھا۔

کیمروں نے ٹینکوں کی بڑھتی ہوئی صفیں دکھائیں۔ ٹیلے وژن مبصر نے، جسے وزیرِ اطلاعات نے فوجی ساز و سامان کو اردو غزلوں سے مستعار تشبیہات کے ذریعے بیان کرنے کی لیاقت کے سبب اپنے دستِ خاص سے منتخب کیا تھا، کہا، 'یہ ٹینک ہیں۔ لوہے کے رواں دواں قلعے جو ہمارے دشمنوں کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کر دیتے ہیں۔' جیسے ہی ان رواں دواں ٹینکوں نے اسے سلیوٹ کرنے کے لیے اس کی ڈائس کی جانب اپنے دہانے موڑنا شروع کیے، انور سادات کا گولیوں سے چھلنی جسم جنرل ضیا کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس نے جنرل اختر کی جانب دیکھا، جس کی آنکھیں افق پر مرکوز تھیں۔ جنرل ضیا کی سمجھ میں نہ آئی کہ جنرل اختر کیا دیکھ رہا ہے، کیوں کہ آسمان کی نیلاہٹ بے داغ تھی اور فضائی مظاہرہ ابھی کئی گھنٹے دور تھا۔ ایک لمحے کے لیے جنرل ضیا کو شک ہوا کہ اختر ٹی وی کیمروں کے سامنے پوز بنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور صاحب بصیرت نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جنرل ضیا پریڈ کی روٹین سے متعارف تھا اور جانتا تھا کہ مارچ پاسٹ کے بعد بریگیڈیئر ٹی ایم اپنے چھاتا برداروں کی ٹیم کے ساتھ ڈائس کے بالکل سامنے سفید دائرے کے اندر اترے گا۔ اس نے خواہش کی کہ وہ اس پریڈ کو فاسٹ فارورڈ کر سکتا اور بریگیڈیئر ٹی ایم کو پھر سے اپنے ساتھ رکھ لیتا۔ ٹینک اپنے دہانے جھکائے رینگتے ہوئے ڈائس کے پاس سے گزر گئے۔ جنرل ضیا نے ان کا سلیوٹ قبول کیا اور اس دوران اپنی سمت آنے والی رانی ہووٹزر توپوں کو بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہا۔ اسے آرٹلری کی توپوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ بڑے بڑے کھلونوں کی طرح لگتی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ ان میں بارود بھی موجود نہیں تھا۔ 'صدر، جو خود بھی بکتر بند کور کے پرانے سپاہی ہیں، اس سخت کوش زندگی کی تحسین کر رہے ہیں جو ٹینک کمانڈر گزارتا ہے۔' جب جنرل نے ایک چست سلیوٹ کا جواب اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھ سے دیا تو مبصر نے کہا۔ 'یہ زندگی ہے ایک ایسے تنہا عقاب کی، جو اپنا گھونسلا کبھی نہیں بناتا۔ صدر ان کے حوصلے کو سلام کر رہے ہیں۔'

جنرل ضیا نے ایک مرتبہ پھر جنرل اختر کی طرف دیکھا۔ اب اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کیوں کر رہا ہے۔

جب اٹھارہ فٹ لمبے دُور مار میزائلوں کو اُٹھائے ہوئے ٹرک پاس سے گزرنا شروع ہوئے تو جنرل ضیا نے کچھ بہتر محسوس کیا۔ وہ بڑے بڑے تو تھے لیکن موجودہ پس منظر میں بے ضرر بھی تھے۔ کوئی شخص بھی بیس فٹ دور ہدف کے لیے کوئی دُور مار میزائل نہیں چلائے گا۔ اپنے لانچروں پر سوئے ہوئے یہ میزائل ان دیو قامت ماڈلوں جیسے لگتے تھے جنھیں کسی اسکول کے ہابی کلب نے تیار کیا ہو۔ یہ جنرل ضیا ہی کا آئیڈیا تھا کہ ان میزائلوں کے نام مغل بادشاہوں اور شکاری پرندوں کے ناموں پر رکھے جائیں۔ اس نے یہ بات بڑے فخر کے ساتھ نوٹ کی کہ اُس نے اُن کے جو نام رکھے تھے وہ ان پر اردو اور انگریزی کے جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے: فالکن فائیو اور غوری ڈُوم۔ اس کا دل اچانک اچھل پڑا جب اس نے فوجی بینڈ کو پیدل دستوں کے مارچ کی دھن بجانا شروع

کرتے ہوئے سنا اور پھر سپاہی اپنے پیروں پر اس کے قریب سے مارچ کر کے جانا شروع ہو گئے، جبکہ ان کی ننگی بایونٹ بندوقوں کا رُخ آسمان کی جانب تھا۔ پیدل فوج کے اسکواڈرن کے پیچھے پیچھے نہایت شان دار کمانڈو فارمیشن آئیں؛ اپنے گھٹنوں کو سینے تک اُٹھاتے ہوئے اور اپنی ایڑیوں کو زمین پر پٹختے ہوئے یہ فارمیشن چلنے کے بجائے دوڑ رہی تھیں۔ سلیوٹ کرنے کے بجائے ان کمانڈوز نے اپنے دائیں ہاتھ باہر نکالے اور ڈائس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی بندوقوں کو لہرایا۔ 'یہ بہادر شہادت کی وہی تڑپ رکھتے ہیں جو عاشق اپنی محبوباؤں کو بانہوں میں لینے کی رکھتے ہیں۔' ٹیلے وژن مبصر نے جذبے سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

جب فوجی بینڈ نے بالآخر اپنا مُنھ بند کیا اور سویلین فلوٹ نظر آئے تو جنرل ضیا نے آسانی سے سانس لینا شروع کیا۔ پہلا فلوٹ دیہی زندگی کی نمایندگی کرتا تھا: مرد فصل کاٹ رہے تھے اور اپنے جال کھینچ رہے تھے جن میں کاغذ کی بنی ہوئی مچھلیاں بھری پڑی تھیں، عورتیں مٹی کے ایسے برتنوں میں دودھ دوہ رہی تھیں جن میں بلب لگے ہوئے تھے، جبکہ اوپر پیپسی کے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے جو ان فلوٹ کی مالی معاونت کر رہی تھی۔ ایک اور فلوٹ پاس سے گزرا جس میں سفید چُغوں اور نارنجی پگڑیوں والے ڈھولچی اور صوفی گلوکار سوار تھے۔ جنرل ضیا نے نوٹ کیا کہ ان کی حرکات وسکنات غیر فطری تھیں اور وہ ریکارڈ شدہ موسیقی پر صرف مُنھ ہلاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس شور کو استعمال کرتے ہوئے وہ جنرل اختر کی جانب جھکا اور اس سے ایک غصیلی سرگوشی میں پوچھا: 'انھیں تکلیف کیا ہے آخر؟'

جنرل اختر نے سلوموشن میں اپنا سر گھمایا، اس کی طرف ایک فاتح کی سی مُسکراہٹ سے دیکھا اور اس کے کان میں بڑی نرمی کے ساتھ جوابی سرگوشی کی: 'یہ سب سول کپڑوں میں ہمارے اپنے لڑکے ہیں۔ آخر رسک کیوں لیا جائے؟'

'اور یہ عورتیں؟'

'جنرل ہیڈکوارٹرز کی چوہڑیاں ہیں جی۔ اعلیٰ ترین سطح کی سیکیورٹی کلیئرنس کے بعد آئی ہیں۔'

جنرل ضیا مسکرایا اور فلوٹ پر بیٹھے مردوں اور عورتوں کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا جو فوجی ڈرل اور فصلوں کی کٹائی کے رقص کی کسی ملی جلی صورت میں پرفارمنس دے رہے تھے۔

پاکستان ٹیلے وژن نے دو مسکراتے ہوئے جرنیلوں کا ایک کلوز اپ دکھایا اور مبصر نے اس خوش گوار موڈ کی ترسیل کے لیے اپنی آواز بلند کر دی۔ 'صدر صاحب ہمارے کسانوں کی ثقافت کی رنگارنگ توانائی سے واضح طور پر مسرور نظر آتے ہیں۔ اس دھرتی کے بیٹوں اور بیٹیوں کو، قوم کا دفاع کرنے والوں کے ساتھ اپنی خوشیوں کی ساجھے داری کرتے دیکھ کر جنرل اختر بہت خوش ہیں۔ اور اب آتے ہیں ہمارے شیر دل اپنے اصل روپ میں۔۔۔'

کیمروں نے ڈائمنڈ کی فارمیشن میں چار ٹی برڈ جیٹ طیاروں کو پرواز کرتے ہوئے دکھایا، جو نیلے افق پر اپنے پیچھے گلابی، سبز، نارنجی اور پیلے دھوئیں کی لہریں بناتے ہوئے جا رہے تھے، جیسے کوئی بچہ اپنی زندگی کی پہلی دھنک کی تصویر بنا رہا ہو۔ جب وہ آسمان میں ایک رنگا رنگ چار رویہ شاہ راہ بناتے ہوئے ڈائس کے پاس سے پرواز کرتے ہوئے گزرے تو ان کی ناکیں غوطہ کھا گئیں۔ وہ واپس مُڑے، ایک ڈھیلا ڈھالا سا لیکن درست آٹھ کا ہندسہ اور پھر کچھ لُوپ بنائے؛ جنرل ضیا نے ان کی طرف ہاتھ ہلایا، مٹھی بھر سویلین ناظرین نے اپنے جھنڈے ہلائے اور ٹی برڈ اپنی دُمیں ہلاتے ہوئے دور اُڑ گئے۔ جنرل ضیا نے ایک ہرکولیس سی ون تھرٹی طیارے کے قریب پہنچنے کی مانوس گڑگڑاہٹ سنی، زیتونی سبز رنگ کی وھیل سے مشابہ یہ طیارہ آہستگی سے بہتا ہوا پریڈ کی جانب آ رہا تھا۔ سی ون تھرٹی کے پچھلے دروازے سے چھاتا برداروں کو قلابازیاں کھا کر نکلتے دیکھنا جنرل ضیا کے لیے ہمیشہ سے خالص لطف کا سبب رہا تھا اور وہ اس نظارے سے آنکھیں ہٹا نہیں پاتا تھا۔ طیارے کے پچھلے حصے سے چھاتا بردار ایسے گرے جیسے کسی نے

گلِ یاسمین کے غنچوں کی مٹھی بھر کر نیلے آسمان پر پھینک دی ہو؛ وہ کچھ سیکنڈوں تک گرتے چلے گئے، اور بڑے، پھر اور بڑے ہوتے گئے اور اب کسی بھی لمحے وہ کھل کر بڑی بڑی سبز اور سفید ریشمی چھتریوں میں تبدیل ہو جانے اور پھر آہستگی اور وقار کے ساتھ تیرتے ہوئے پریڈ اسکوائر کی طرف آنے والے تھے، اور ان کا قائد بریگیڈیئر ٹی ایم ڈائس کے بالکل سامنے ایک میٹر چوڑے سفید دائرے میں اترنے والا تھا۔ جنرل ضیا نے اس تجربے کو ہمیشہ بہت منزّہ کر دینے والا پایا، جو گولف سے بھی بہتر تھا، قوم سے خطاب سے بھی بہتر تھا۔

جب جنرل ضیا کی آنکھیں سی ون تھرٹی سے پھوٹنے والی ایک ایسی کلی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جو کھِل کر پھول بن ہی نہیں رہی تھی جبکہ دوسری کلیاں چیخ کر کھُل رہی تھیں اور پھر فضا میں تیرنا شروع ہو گئیں تھیں، تو اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ یہ والی کلی اب تک فری فال کر رہی تھی اور تیزی سے گرتی ہوئی پریڈ گراؤنڈ کی طرف آ رہی تھی اور بڑی سے بڑی، اور بڑی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

دوسرے گھاگ چھاتا برداروں کی طرح بریگیڈیئر ٹی ایم بھی اپنے پیراشوٹ کو کھولنے میں تاخیر کا رجحان رکھتا تھا۔ اسے اپنا رِپ کورڈ کھینچنے سے پہلے کچھ سیکنڈ انتظار کرنا پسند تھا، جس دوران وہ پیراشوٹ کی چھتری کھلنے سے پہلے کی فری فال کا لطف اُٹھایا کرتا۔ اسے اپنے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرنا، سانس باہر نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا اور اپنے بازوؤں اور ٹانگوں پر کنٹرول کا لمحاتی طور پر کھو جانا پسند تھا۔ ایک ایسے آدمی کے لیے جو انسانی کم زوریوں سے مُبرّا تھا، کوئی کہہ سکتا تھا کہ اس میں ایک برائی تو تھی: اپنے سر کو کچھ سیکنڈوں کے لیے گھُما دینے کی خاطر کششِ ثقل کے سامنے سپر انداز ہو جانا۔ لیکن بریگیڈیئر ٹی ایم ایک پیشہ ور بھی تھا جو رسک کو ناپتا تولتا تھا اور پھر اس کا خاتمہ کر ڈالتا تھا۔ اپنے مشن پر جانے سے پہلے پیراشوٹ باندھتے ہوئے اس نے نوٹ کیا تھا کہ اُس کی بیلٹ اس کے جسم کے بالائی حصے میں گوشت کے اندر چبھ رہی ہے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کو خود پر غُصّہ آیا۔

'ڈیم اِٹ، میں سارا دن آرمی ہاؤس میں فارغ بیٹھا رہتا ہوں۔ میں موٹا ہو رہا ہوں۔ مجھے اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔' چھلانگ لگانے سے کچھ لمحے پہلے سی ون تھرٹی کے پچھلے دروازے پر کھڑے ہو کر بریگیڈیئر ٹی ایم نے نیچے پریڈ اسکوائر، خاکی وردی میں ملبوس چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی فارمیشنوں اور جھنڈے لہراتے ہوئے سویلین کے چھوٹے سے ہجوم کو دیکھا تھا۔ ایک اچھے پیشہ ور کی حیثیت سے بریگیڈیئر ٹی ایم نے خالص ہوا میں کچھ دیر اور سواری کرنے کی ترغیب کی مزاحمت کی، اپنے وزن کو کم کرنے کے لیے ذہن میں ایک پلان ترتیب دیا اور جلد ہی اپنے رِپ کورڈ کو کھینچ لیا۔ اس کے جسم نے خود کو تیار کیا کہ جیسے ہی اس کی چھتری کھُل کر ہوا سے بھر جائے تو وہ یک دم اوپر کی طرف اچھل جائے۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔

جنرل ضیا نے پسینے کے قطرے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چلتے ہوئے محسوس کیے، اور لگتا تھا کہ اس کی کھُجلی بھی لوٹ آئی ہو۔ اس نے اپنی مُٹھیاں بھینچ لیں اور جنرل اختر کی جانب دیکھا۔ جنرل اختر چھاتا برداروں کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں فلوٹ میں کچھ تلاش کر رہی تھیں جو توپ خانے اور پیدل دستوں کی صفوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ جنرل اختر خاموشی سے اپنے ذہن میں بریگیڈیئر ٹی ایم کے لیے تحسین کے کلمات کی ریہرسل کر رہا تھا؛ وہ 'کسی جہاز سے کودنے والا عمدہ ترین آدمی' اور 'اس مُقدّس سرزمین پر چلنے والا بہادر ترین آدمی' میں سے کسی فقرے کو منتخب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنے رِپ کورڈ کو مضبوطی سے پکڑا اور اسے پھر سے کھینچا۔ ایسا لگتا تھا کہ رِپ کورڈ نے پیراشوٹ کے ساتھ اپنے تمام رابطے منقطع کر دیے تھے، یا اس کی یادداشت چلی گئی تھی۔ بریگیڈیئر ٹی ایم نے اپنی گراوٹ کو سنبھالنے کے لیے اپنی بانہیں اور ٹانگیں باہر کی جانب پھیلا دیں تو اسے ایک ایسا احساس ہوا جو کسی اور وقت میں اس کے لیے سکون کا باعث بن سکتا تھا: اس کا وزن نہیں بڑھا تھا۔ وہ کسی اور کا پیراشوٹ باندھے ہوئے تھا۔

جنرل ضیا نے اس شخص کو آسمان سے لڑھکتے ہوئے اپنی جانب آتے دیکھا تو سوچا کہ شاید اس نے قرآن کی آیت کی تعبیر درست نہیں کی۔ ہوسکتا ہے حضرت یونس اور ان کی وھیل کا اس سے لینا دینا ہی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے اس کا اختتام اسی طرح لکھا ہو: ایک آدمی آسمان سے گرا اور نیلے وژن کیمروں کے سامنے اسے کچل کر ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔ اس نے کسی چیز کے نیچے چھپ جانے کے لیے اردگرد دیکھا۔ شامیانے کو آخری لمحات میں ہٹا دیا گیا تھا کیوں کہ وزیرِ اطلاعات ہیلی کاپٹر سے دور کے شاٹ لینا چاہتا تھا۔ 'اوپر دیکھیں۔' اس نے جنرل اختر سے غصے سے سرگوشی کی، جو نیچے اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنی تحسین کے کلمات میں 'چھلانگ' اور 'جہاز' جیسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ خوش ذوقی کی نشان دہی نہیں کریں گے یہ۔ اس نے ایسے ظاہر کیا کہ اس نے جنرل ضیا کی بڑبڑاہٹ سنی ہی نہ ہو اور اس نے ٹی وی کیمروں کو اپنے مضبوط جبڑوں والا چہرہ پیش کر دیا۔

ہجوم تیرتے ہوئے چھاتوں کے قریب ایک آدمی کو گرتے ہوئے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا، جس کی بانہیں اور ٹانگیں زمین کے بالکل متوازی پھیلی ہوئی تھیں اور جو صدارتی ڈائس کی جانب محوِ سفر تھا۔ ہجوم نے اس نظارے کو پرفارمنس کا آخری حصّہ سمجھ کر اپنے جھنڈے لہرانا اور خوش آمدیدی شور مچانا شروع کر دیا۔

اپنے پیراشوٹ کا ایمرجنسی کورڈ کھینچنے سے پہلے ہی بریگیڈیر ٹی ایم کو پتا تھا کہ وہ کام نہیں کرے گا۔ جس بات نے اسے صحیح معنوں میں حیران کر دیا وہ یہ تھی کہ وہ ہک جس سے توقع تھی کہ وہ اس کا ایمرجنسی پیراشوٹ کھول دے گا، اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ وہ اس کی پسلی کے نچلے حصّے سے کسی ضرورت مند بچّے کی طرح چپکا رہ گیا۔ اگر صورتِ حال وہ نہ ہوتی جو کہ تھی تو بریگیڈیر ٹی ایم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ بلند کرتا اور ہجوم کو طعنے سے بھری مسکراہٹ پیش کر دیتا۔ وہ ہاتھ جو ایک ضرب سے گردن توڑ سکتے تھے، وہ ہاتھ جنھوں نے کبھی ایک وحشی بکرے کو شکار کیا تھا اور کسی چاقو کو استعمال کیے بغیر اس کی

کھال اتار دی تھی، اب دو سینٹی میٹر کے ایک ضدی ہک کے سامنے ہار گئے تھے جو ایمرجنسی پیراشوٹ کو کھول کر اس کی زندگی بچا سکتا تھا۔

اس کے پھیپھڑے ہوا سے بھرے جا رہے تھے، اس کی بانہیں سُن ہونے لگی تھیں اور وہ اب پریڈ اسکوائر اور اس کے رنگا رنگ جھنڈوں اور بے وقوف شور مچاتے سویلین کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا انگوٹھا ایک مرتبہ پھر ایمرجنسی پیراشوٹ کے رپ کورڈ رنگ میں پھنسایا، اپنی پسلی کے نچلے حصّے کو باقی چار انگلیوں سے مضبوطی سے جکڑا، اپنی زندگی کی بلند ترین چیخ ماری، جس سے اس کے پھیپھڑوں سے تمام ہوا باہر نکل گئی، اور رِنگ کو کھینچا۔

جنرل ضیا نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ اسے ابھی تک اندازہ نہیں تھا کہ جو آدمی گرتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا ہے وہ بریگیڈیر ٹی ایم ہے۔ وہ جنرل اختر کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش میں پیچھے کو ہٹا، جب کہ جنرل اختر ثابت قدم رہا اور اُس نے اب بھی اوپر نہیں دیکھا۔ جنرل اختر کو اب مزید سوچنا نہیں تھا کہ وہ اپنے تحسینی کلمات میں کیا کہے۔ بریگیڈیر ٹی ایم کا جسم ڈائس کے بالکل سامنے سفید دائرے میں دھم سے گرا تو اُس کے جسم نے یہ تحسین خود ہی رقم کر دی۔

'ایک پیشہ ور جس کا نشانہ موت میں بھی نہیں چُوکا۔'

جس نیم طبّی عملے نے اس کے کچلے ہوئے جسم کو سفید دائرے سے نکالا انھوں نے نوٹ کیا کہ بریگیڈیر ٹی ایم کی بائیں پسلی کے نچلے حصے میں ایک بڑا سا زخم تھا۔ پھر انھوں نے اس کے دائیں ہاتھ کی بھنچی ہوئی مُٹھی دیکھی جس نے دھات کا ایک رنگ، اس کی شرٹ سے پھٹا ہوا خاکی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور اس کی تین پسلیاں پکڑی ہوئی تھیں۔

۲۳

ہم قلعے کے لان پر چائے پی رہے اور قومی سلامتی کے امور پر بحث کر رہے تھے جب زیرِ زمین قید خانوں کو جانے والے راستے پر قیدی نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ مُنڈے ہوئے سروں، بندھے ہوئے ہاتھوں، جکڑے ہوئے اور ایک ہی زنجیر سے بندھے ہوئے تباہ حال مردوں کی ایک طویل قطار زیرِ زمین سیڑھیوں سے باہر نکلتی ہے جب کہ میجر کیانی قوم کو لاحق بیرونی اور اندرونی سیکیورٹی خطرات کا تجزیہ کر رہا ہوتا ہے۔ وہ ایک پیالے سے مٹھی بھر بھنے ہوئے بادام نکالتا ہے اور اسٹریٹیجک چیلنجوں کو ٹک مارک کرنے کے دوران انھیں ایک ایک کر کے اپنے کھلے مُنھ میں پھینکتا ہے۔ میں اپنی آنکھ کے کونے سے قیدیوں کی طرف نگاہ دوڑاتا ہوں کیوں کہ سر گھما کر ان کی طرف دیکھنا غیر مہذّبانہ ہوتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میجر کیانی یہ سوچے کہ مجھے قومی سلامتی کا کوئی خیال نہیں ہے۔

جب سے میں جنرل اختر سے ملاقات کر کے آیا ہوں قلعہ کی فوجی انتظامیہ میری خدمت پر مامور ہے۔ میں آنکھوں پر پٹی باندھنے والے اُس قیدی کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ میں ایک معافی یافتہ شہزادے کی طرح واپس آیا ہوں: میرا بیان دست خط کیے جانے کے بعد جمع کرایا جا چکا ہے، میرا نام کلیئر ہو چکا ہے، عزّت بحال ہو چکی ہے اور شان و شوکت کا وعدہ کیا جا چکا ہے۔ اگر میں میجر کیانی کی بات پر یقین کروں تو اب صرف کچھ کاغذی کارروائی باقی رہ گئی ہے جس کے بعد مجھے اکیڈمی میں واپس بھیج دیا جانے والا ہے۔ میرا

تجربہ بتاتا ہے کہ مجھے اس پر یقین نہیں کرنا چاہیے لیکن اسے خود پر توجہ دیتے ہوئے دیکھنا، اس کا یہ بات یقینی بنانا کہ مجھے اچھی طرح کھانا کھلایا جا رہا ہے، کہ مجھے قلعے کے بہترین کمرے میں ٹھہرایا جا رہا ہے، میرے لیے مسرت کا سبب ہے۔ وہ ایک بدلا ہوا آدمی ہے۔ ہم اس نئے تعلّق کی شروعات کا جشن منا رہے ہیں۔ نرم لہجہ اور باہمی احترام کا دَور دورہ ہے۔

'ہندو فطری طور پر بزدل ہوتے ہیں اور یہ بات قابلِ فہم ہے کہ وہ ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپیں گے، لیکن ہم نے ان دال خوروں کی قوم سے نبٹنا سیکھ لیا ہے۔ کراچی میں کچھ لوگوں کے مرنے کا سبب بننے والے ہر بم دھماکے کے جواب میں ہم دہلی، بمبئی، بنگلور اور کوئی بھی نام لے لو، ان تمام شہروں میں درجنوں دھماکے کر کے جواب دیں گے۔ اگر وہ تائیوان کے ٹائم بم استعمال کریں گے تو ہم انھیں ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے خوب صورت آر ڈی ایکس بھیجیں گے۔' میجر کیانی اگلا بادام اپنے مُنھ میں پھینکنے سے قبل پہلے والے بادام کو ٹھیک طرح سے چباتا ہے۔ اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ 'تو وہ خطرہ نہیں ہیں۔ خطرہ اندر کے دشمن سے ہے، ہمارے اپنے مسلمان بھائیوں سے جو خود کو کہتے تو پاکستانی ہیں لیکن زبان اُن کی بولتے ہیں: وہ ہیں اصل خطرہ۔ ہمیں ان سے نبٹنا سیکھنا ہے۔'

سہ پہر کے بعد کے سورج میں قلعہ کسی بہت بوڑھے بادشاہ کی طرح لگتا ہے جو قیلولہ کر رہا ہو۔ دیوانِ عام کے تڑختے ہوئے ستونوں کے سائے لان کے گرد پھیلے ہوئے ہیں، سورج مکھی کے پھول پورے جوبن پر ہیں اور اپنے ترچھے سروں کو ایسے تانے کھڑے ہیں جیسے پگڑی والے درباری دربار میں اپنی باری کے منتظر ہوں۔ زیرِ زمین تفتیشی مرکز میں کسی کو ایسی فراخ دلی سے پیٹا جا رہا ہے کہ اس کی چھت خون کی نئی چھینٹیں وصول کر رہی ہے۔ ہم لان کی کرسیوں پر ایک میز کے سامنے بیٹھے ہیں جو چائنا کی کراکری اور لاہور میں ملنے والے سہ پہر کے بہترین اسنیکس سے سجا ہوا ہے۔

اگر آپ کسی اچھے خاندان سے ہیں اور آپ کی جنرل اختر سے ملاقات اچھی رہی

ہے تو زندگی ایک خوب صورت موڑ لے بھی سکتی ہے۔

'کسی چور یا قاتل یا غدار کو کوئی بھی شخص پکڑ سکتا ہے۔' میجر کیانی ایک چکن پیٹی چباتے ہوئے کہتا ہے۔ 'مگر میری جاب کے بارے میں اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مجھے اُن سے ایک قدم آگے رہنا پڑتا ہے۔' میں بڑی تمیز سے سر ہلاتا ہوں اور اپنے دانتوں سے اپنے نائس بسکٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑتا ہوں۔

ایک ڈن ہِل سگریٹ پیش اور پھر ایک افسروں جیسے محتاط مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

قیدی شیش محل کے باہر سنگِ مرمر کے فوارے کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں، منی کیور کی جانے والی باڑ، جو بوگن ویلیا کی گلابی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے، کے پیچھے ان کے منڈے ہوئے سر اوپر نیچے اچھل رہے ہیں۔

انھیں ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے باہر نہیں بلایا گیا۔

وہ پورے نہ ہونے والے وعدوں کی طرح لگتے ہیں؛ ٹوٹے ہوئے اور پھر یادداشت سے کام لے کر پھر سے جوڑے گئے، مبہم نام جنھیں حبسِ بے جا کی درخواستوں سے کاٹا جا چکا، بھولے ہوئے چہرے جو کبھی ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ہال آف فیم میں جگہ نہیں بنا سکیں گے، تہ خانوں کے باسی جنھیں سورج میں اپنا یومیہ آدھا گھنٹا گزارنے کے لیے باہر نکالا گیا ہے۔ قیدی اپنی پیٹھیں ہماری جانب کیے ایک قطار بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، ان کے جسم پر کام چلاؤ قسم کی پٹیوں اور خراب ہو چکے ہوئے زخموں سے استر کیا گیا ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ 'اس کے جسم پر کوئی نشان نہ بننے پائے' کا اصول قلعے میں صرف منتخب لوگوں پر ہی لاگو ہوتا ہے۔

میرے سامنے پڑی ٹی کوزی پر پاک فضائیہ کا نشان بنا ہے، ایک سادہ و پرکار ڈیزائن: ایک اُڑتا ہوا عقاب جس کے نیچے ایک فارسی شعر لکھا ہے: صحراست کہ دریاست، تہِ بال و پرِ ماست۔

'اپنے ملک کی خدمت کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔' میجر کیانی فلسفہ طرازی کرتا ہے، 'لیکن اس کی حفاظت کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ صرف ایک۔' میں پیالی پرچ پر رکھ دیتا ہوں، اپنی کرسی آگے کو بڑھاتا ہوں اور سنتا ہوں۔ میں اس کا توجہ دینے والا شاگرد ہوں۔

'رسک کا خاتمہ کر دو۔ دشمن کو اُس کے حملے سے پہلے قابو کرو۔ وہ جس آکسیجن سے سانس لیتا ہے اُسے اسی کی پیاس سے مار دو۔' وہ اپنے ڈن ہل کا ایک بہت گہرا کش لیتا ہے۔

میں اپنی پیالی اُٹھا کر پھر سے پیتا ہوں۔ میجر کیانی ٹی پارٹی کا ایک اچھا میزبان ہوگا مگر وہ کوئی سُن زُو نہیں۔

'فرض کریں آپ ایک ایسے شخص کو پکڑ لیتے ہیں جو قومی سلامتی کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ ہم سب انسان ہیں، ہم سب سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ فرض کریں ہم کوئی ایسا آدمی پکڑ لیتے ہیں جس کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ آرمی ہاؤس کو اُڑانے والا تھا۔ اب اگر تفتیش کے بعد یہ نکلتا ہے کہ نہیں، وہ درحقیقت ایسا نہیں کرنے والا تھا، کہ ہم غلط تھے، تو پھر تم کیا کرو گے؟ ظاہر ہے تم اُسے جانے دو گے۔ لیکن پوری دیانت داری سے بتاؤ کہ کیا تم اسے ایک غلطی کہو گے؟ نہیں۔ یہ رسک ختم کرنا ہوتا ہے، جن حرامیوں کے بارے میں ہمیں تشویش رہتی ہے ان میں سے ایک کم ہو جاتا ہے۔'

میری آنکھیں بہ دستور قیدیوں کی جانب دیکھتی رہتی ہیں جو یونانی المیے کے ایک ایسے کورس کی طرح اپنے پیر اِدھر اُدھر کر رہے اور ہل جُل رہے ہیں جسے اپنی لائنیں بھول گئی ہوں۔ ان کی بیڑیاں ایسے بجتی ہیں جیسے شام کو گھر لوٹنے والی گایوں کی گھنٹیاں۔

میجر کیانی کا ہاتھ اس کی قمیص کے نیچے غائب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا پستول نکالتا ہے اور وہ اسے بسکٹوں کی پلیٹ اور کاجو کے پیالے کے درمیان رکھ دیتا ہے۔ پستول کا ہاتھی دانت کا بنا ہوا دستہ مرے ہوئے چوہے جیسا دکھائی دیتا ہے۔

'کیا تم کبھی شیش محل کے اندر گئے ہو؟'

'نہیں۔' میں کہتا ہوں۔ 'لیکن میں نے اسے ٹی وی پر دیکھا ہے۔'

'یہ وہاں ہے۔' وہ ایک ایسے ہال کی جانب اشارہ کرتا ہے جس میں محرابیں ہیں اور جس کے اوپر ایک قبہ ہے۔ 'جانے سے پہلے تمھیں ایک نظر دیکھنا تو چاہیے۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس محل میں کتنے آئینے ہیں؟'

میں نیم گرم چائے میں اپنا نائس بسکٹ ڈبوتا ہوں اور اپنا سر نفی میں ہلا دیتا ہوں۔

'ہزاروں۔ تم نظریں اُٹھاؤ تو تمھیں اپنا چہرہ ہزاروں آئینوں سے تمھیں گھورتا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن یہ آئینے تمھارے چہرے کا عکس نہیں دکھا رہے ہوتے۔ وہ تمھارے عکسوں کا عکس دکھا رہے ہوتے ہیں۔ تو تمھارا دشمن ایک ہو سکتا ہے لیکن اس کے چہرے ہزاروں ہو سکتے ہیں۔ تم میری بات سمجھے؟'

میں سمجھا تو خاک نہیں۔ میں وہاں سے جانا اور قیدیوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ سیکرٹری جنرل کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ 'دلچسپ خیال ہے یہ۔' میں کہتا ہوں۔

'انٹیلی جینس کا کام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ عکس میں سے چہروں کو ڈھونڈ نکالنا۔ اور پھر عکسوں کے عکس میں سے۔'

'اور یہ لوگ۔' میں قیدیوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں اور پہلی مرتبہ ان کی جانب ٹھیک طریقے سے دیکھتا ہوں۔ 'کیا آپ نے ان میں سے کسی کو تلاش کر لیا ہے؟'

'یہ سب لوگ سیکیورٹی رسک تھے، یہ سب۔ اب انھیں نیوٹرلائز کر دیا گیا ہے لیکن ان کی درجہ بندی اب بھی رسک ہی کی ذیل میں کی جاتی ہے۔' قیدی ایک سیدھی قطار میں کھڑے ہیں اور ان کی پشت ہماری جانب ہے۔

اپنے چیتھڑوں جیسے لباس میں وہ سوائے اپنی صحت اور صفائی کے کسی اور کے لیے خطرہ نہیں لگتے۔

لیکن میں یہ نہیں کہتا۔ میں تعریفی انداز میں میجر کیانی کو دیکھ کر سر ہلاتا ہوں۔ جب

آپ ایک سرسبز لان پر بیٹھے ہوں، سورج اتر رہا ہو اور آپ ایک صدی بعد اپنا پہلا سگریٹ پی رہے ہوں تو کسی سے بحث کیوں کی جائے؟

'یہ بہت دلچسپ کیس تھا۔' چکن پیٹی کے ذرّات میجر کیانی کی مونچھوں پر چمکنے لگتے ہیں۔ وہ مجھے اس طرح تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کوئی سائنس دان بندر کے دماغ میں الیکٹروڈ داخل کرنے کے بعد اسے دیکھتا ہو۔ 'میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'

باہمی احترام کی وہ فضا جس کا یہاں دور دورہ ہے مجھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ میں بھی اس کے نیک جذبات کا جواب دوں۔ میں ایک ایسے بندر کی طرح سر ہلاتا ہوں جس کے دماغ میں الیکٹروڈ لگے ہوئے ہوں۔

'تم اپنے دوستوں کو اُس وقت بھی نہیں بھولے جب تم ---' میجر کیانی کا ہاتھ ہوا میں لہراتا ہے۔ اتنی تمیز اس میں موجود ہے کہ وہ ان جگہوں کے نام نہ لے جہاں اس نے مجھے رکھا۔ 'لیکن اس کے ساتھ ساتھ تم جذباتی بھی نہیں ہوئے۔ جو چلا گیا وہ چلا گیا، اب نقصان کم کرنے کی فکر کرنی چاہیے، آگے بڑھنا چاہیے۔ میرا خیال ہے جنرل اختر بھی متاثر ہوئے۔ تم نے اپنے پتے ٹھیک کھیلے۔ ایک دوست گنواؤ، دوسرا بچاؤ۔ سادہ حساب کتاب۔ جنرل اختر ایسی صورتِ حال پسند کرتے ہیں جہاں آخر میں سب حساب برابر نکلے۔'

قیدی اب لگتا ہے کہ کوئی نہ سنائی دینے والی کمانڈ بجا لا رہے ہیں یا شاید انھیں اپنے معمول کا علم ہے۔ وہ کبھی دائیں ہوتے ہیں کبھی بائیں، پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے ہیں۔ میں کراہنے کی آوازیں سنتا ہوں۔

اگر انھیں ورزش کرنے کے لیے باہر لایا گیا ہے تو ورزش وہ کچھ زیادہ نہیں کر رہے۔ اگر ان سے میرے لیے کوئی تماشا کرنے کی توقّع ہے تو میں بالکل محظوظ نہیں ہو رہا۔

'آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں،' میجر کیانی جیم ٹارٹ پر سے شیرے میں ڈوبی چیری چاٹتا ہے۔ 'میرے والے کام میں آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ جس دن آپ سیکھنا چھوڑ دیں، آپ ختم ہو جاتے ہیں۔' لان میں ہمارے اور قیدیوں کے درمیان سے ایک

پرندے کا سایہ گزرتا ہے۔

کیا ان میں سیکرٹری جنرل بھی موجود ہے؟ شاید اس نے سامان باندھ لیا ہے اور وہ گھر جا کر اپنی جدوجہد دوبارہ سے شروع کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ اسے خدا حافظ کہنا بہت اچھا رہے گا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں اس کی رہائی سے پہلے میں اس کا چہرہ دیکھنا پسند کروں گا۔

'پیچھے مڑ،' میجر کیانی چلّاتا ہے۔ پھر وہ میری جانب دیکھتا ہے، اس کی بھوری آنکھیں کسی ایسے لطیفے سے بھری پڑی ہیں جو وہ مجھے نہیں سنانا چاہتا۔ 'چلو دیکھتے ہیں کہ تم ان میں سے کسی کو شناخت کر سکتے ہو یا نہیں۔'

مجھے اطمینان ہوتا ہے کہ میجر کیانی نے اس موضوع سے گریز نہیں کیا۔ اس کے لیے میرے نیک جذبات سورج مکھی کے پھول کی طرح کھِل جاتے ہیں۔ میں ایک اور نائس بسکٹ اُٹھاتا ہوں۔ میں نے جنرل اختر سے ڈیل کی تھی: میں بیان پر دستخط کرتا ہوں تاکہ وہ سیکرٹری جنرل کو آزاد کر دیں۔ اور وہ ڈیل اب پوری کی جا رہی ہے۔ وردی والوں میں یہی اچھی بات ہے۔ وہ اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔

میں ماؤ کیپ میں ایک شخص کو دیکھنے کی توقّع کر رہا ہوں۔ یہ ٹوپی اس کے موجودہ سیاسی خیالات کے نظام کے خلاف ہے، مگر میری ایک حال ہی میں رہا کیے جانے والے قیدی کی جبلّت مجھے بتاتی ہے کہ مجھے ماؤ کیپ دیکھنے کے لیے نظر دوڑانی چاہیے۔

میں چہروں کو دیکھتا جاتا ہوں: چُندھی آنکھیں اور بھیڑوں کی طرح مونڈ دیے جانے والے سر۔ ان میں کوئی ماؤ کیپ نہیں۔ بلکہ کسی کے سر پر ٹوپی ہے ہی نہیں۔ قطار کے ایک سِرے پر سفید دوپٹے میں ایک عورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم ان لوگوں نے اُس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس کی آنکھیں بالکل سفید ہیں۔ ان میں قرنیہ تک نہیں۔

میری آنکھیں ایک ایسے سر پر ٹک جاتی ہیں جس پر مثلث شکل کا ایک چمک دار سُرخ دھبا موجود ہے۔ کوئی عجیب و غریب قسم کی جلد کی انفیکشن ہے، میں سوچتا ہوں۔

ارے نہیں، حرامیوں نے اس کے سر پر استری پھیری تھی۔

وہ سر اوپر اُٹھاتا ہے، آنکھیں اجنبیت سے میری طرف دیکھتی ہیں، ایک زبان نکل کر سوکھے ہوئے، تڑخے ہوئے ہونٹوں کو چھوتی ہے۔ اس کی بھنویں بھی استری کر دی گئی ہیں لیکن ان کے نیچے اس کی گھنی پلکیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

بے بی او اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

میجر کیانی پیٹیز سے بھری ایک پلیٹ میری جانب بڑھاتا ہے۔ میں اسے پرے کر دیتا ہوں اور اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میجر کیانی مجھے کاندھے سے پکڑ لیتا ہے اور مجھے پھر سے میری کرسی پر پیوست کر دیتا ہے، اب اس کی آنکھیں تحکمانہ ہو چکی ہیں۔

'مجھے ایک چیز کے بارے میں بڑا تجسس ہے جس کا ذکر تم نے اپنے بیان میں نہیں کیا۔' وہ کہتا ہے۔ 'اُس نے تمھارا کال سائن استعمال کرنے کی کوشش کیوں کی؟'

جب کوئی مر جاتا ہے تو آپ اس کے بارے میں کوئی بھی کہانی بنانے کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ آپ کسی مردے سے بد دیانتی نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر مُردوں میں سے اُٹھ کر آ جائے اور تمھیں خود کو دھوکا دیتے ہوئے پکڑ لے، تب آپ پھنس جاتے ہیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عُبید نے زندہ رہ کر مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں نے تو اس حرام کے بیان پر دست خط اس لیے کیے تھے کیوں کہ تم مر چکے تھے۔ میں نے حرام کی ڈیل اس لیے کی کیوں کہ میرا خیال تھا کہ تم اپنی ہی بے وقوفی کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہو۔ اب تم وہاں کھڑے مجھ سے وضاحتیں مانگ رہے ہو۔ یار تم مرے ہی نہیں رہ سکتے تھے؟

اچانک مجھے خواہش ہوتی ہے کہ بے بی او کا گلا اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ دوں۔ میں میجر کیانی کے کاندھے پر تھپکی دیتا ہوں۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ٹی پارٹی کے دوران ہم دونوں نے آپس میں جو یاری گانٹھ لی تھی اس کا جذبہ خود میں پھر سے بیدار کروں۔

'میجر کیانی، یہ بات کوئی آپ جیسا پروفیشنل ہی بھانپ سکتا تھا۔' میں کہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری آواز بھرّا نہ جائے، اور میری وہ حیرانی ظاہر نہ ہو پائے جو کسی ایسے شخص کو دیکھنے پر پیدا ہوتی ہے جس کے بارے میں آپ نے سوچ رکھا ہو کہ اسے کوئی زمین سے فضا میں مار کرنے والا میزائل لگ چکا ہے۔ پھر اس سے بڑی ایک حیرانی بھی: اسے پھر سے مردہ دیکھنے کی آپ کی اپنی خواہش۔ 'ہو سکتا ہے اُس نے پیشہ ورانہ رقابت کے سبب ایسا کیا ہو۔'

بے بی او اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور سورج کی شعاعوں کو روکنے کے لیے، جو اس کی آنکھوں کو ضرور چھید رہی ہوں گی، اپنا ہاتھ اپنے غائب شدہ ابروؤں پر پھیرتا ہے۔ اس کا ہاتھ ایک خون آلود پٹی میں چھپا ہوا ہے۔

'تم میں سے کرنل شگری کا بیٹا کون ہے؟'

اگر یہ سیکرٹری جنرل کی آواز نہ ہوتی تو میں اسے نظر انداز کر دیتا۔ اگر وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ ہوا میں ایسے نہ لہراتا جیسے وہ اپنی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں کوئی پوائنٹ آف آرڈر اُٹھا رہا ہو، تو میں اسے شناخت نہ کر پاتا۔ میں نے ہمیشہ اسے بوڑھا، سوکھا سڑا اور گنجا سا شخص سمجھا تھا جسے موٹا سا چشمہ لگا ہوا ہو۔ اپنے طویل تاب ناک کیریئر کے برخلاف وہ بہت جوان ہے۔ ایک باریک، لیکن دودھ جیسی سفید مانگ اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کے درمیان سے نکلی ہوئی، اس کے بے بال سینے کے بائیں جانب کسی نقش گودنے والے دیہاتی کا بنایا ہوا ایک سیب نما دل جس کے درمیان سے ایک تیر پار ہو رہا ہے۔ اس کا جثہ کسی کسان جیسا ہے اور چہرہ کھلا ہوا اور چمک دار، جیسے سیاہ تہ خانوں میں اتنے برس رہنے نے اسے ایک حیران کن نور بخش دیا ہو۔ اس کی آنکھیں باری باری مجھے اور میجر کیانی کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ سیکرٹری جنرل ہی ہو سکتا ہے جو مجھ میں اور میجر کیانی میں فرق نہ کر سکے۔ اس کی آنکھیں خوراک سے بھری میز چھانتی ہیں اور پھر ہمارے چہرے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ طے کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اُن میں سے کون سی کیتلی ہے اور

کون سا کپ۔ لان پر سے ایک بادل کا سایہ گزرتا ہے۔ میری آنکھیں ترچھی ہوتی ہیں۔ میجر کیانی اپنا پستول نکالتا ہے۔ گولی چلنے کی آواز سے پہلے میں میجر کیانی کی گونجتی ہوئی آواز سنتا ہوں۔

'میں ہوں، کامریڈ۔ میں ہوں کرنل شگری کا بیٹا۔'

۲۴

سفیر کی قیام گاہ کے گیٹ پر کھڑی امریکی میرینز کی تین رکنی ٹیم کو مہمانوں کی فہرست میں ہر آنے والے کے نام کو ڈھونڈ کر جانچنے میں بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ ضیافت کے حسب معمول لباسوں میں ڈپلومیٹک کور کے لوگوں اور سنہری دھاریوں والی خاکی وردیوں میں پاک فوج کے افسروں کی آمد کی توقع کر رہے تھے، لیکن اس کے بجائے وہ سر پر بڑی پگڑیوں، قبائلی چغوں اور کڑھائی دار شلوار قمیص میں ملبوس افراد کے ایک متواتر ریلے کو گیٹ سے اندر داخل کیے جا رہے تھے۔ اگر یہ کوئی فینسی ڈریس پارٹی تھی تو سفیر صاحب اپنے مرکزی گیٹ کی حفاظت پر تعینات افراد کو یہ بتانا بھول گئے تھے۔ دعوت نامے میں کاہل ٹیکساس قسم کے باربی کیو کا کچھ تذکرہ تو تھا، لیکن لگتا یہ تھا کہ مہمان اس میں سے ٹیکساس والا حصّہ نظرانداز کر کے اس شام کے لیے بالکل مقامی رنگ میں رنگے گئے تھے۔

میرینز کا گارڈ ہاؤس ایک لکڑی کا کاٹیج تھا جو آج کی شام کے لیے سرخ، سفید اور نیلی جھنڈیوں سے سجا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے اوپر ایک درخت میں لگی فلڈ لائٹ اتنی طاقت ور تھی کہ گھروں پر عموماً شور مچاتی چڑیوں نے، جو شاموں میں اردگرد کے درختوں پر قبضہ جمائے رہتی تھیں، چپ سادھ رکھی تھی یا وہ اُڑ کر کہیں اور چلی گئی تھیں۔ مون سون نے اس سال اسلام آباد کو بائی پاس کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہلکی سی ہوا صرف دھول اور پولن

اُٹھائے پھرتی تھی۔

اپنے بائیس سالہ کمانڈر کارپورل باب لیسارڈ کے تحت اور بیئر اور ہاٹ ڈاگ کی متواتر سپلائی کی مدد سے، جو کیٹرنگ سروس پر مامور ان کے ساتھی اُڑا کر لائے تھے، میرین فوجی مہمانوں کے بے حد و شمار ریلے کے باوجود اپنا موڈ خوش گوار رکھنے میں کام یاب رہے۔ اور مہمان بھی ایسے جو مہمانوں کی فہرست میں درج ناموں جیسے تو بالکل نہیں لگتے تھے۔

سی آئی اے کا مقامی سربراہ چک کوگن، جو سب سے پہلے آنے والے مہمانوں میں شامل تھا، سر پر قراقلی ٹوپی سجائے اور بائیں کاندھے سے چمڑے کا ایک کڑھائی دار ہولسٹر لٹکائے آیا۔ امریکا کی ثقافتی اتاشی ایک افغان برقع اوڑھے آئی۔ ان گھیرے دار شٹل کاک برقعوں میں سے ایک، جسے اس نے اپنے سر کے نصف حصّے تک پیچھے کیا ہوا تھا تا کہ اس کے لشکتے ہوئے فیروزی ملبوس کا گریبان منکشف ہو سکے۔

میرین فوجیوں نے اپنی دعوت پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ جب کارپورل لیسارڈ اپنے کلپ بورڈ پر ایک اور نام کو کاٹ کر سفیر صاحب کے مہمان کو زبردستی کی ایک مسکراہٹ سے خوش آمدید کہہ رہا ہوتا تو اس دوران وہ باری باری کورز کمپنی کی بیئر کی بوتلوں سے گھونٹ بھرنے نکل جاتے جو گارڈ ہاؤس کے ایک کولر میں برف میں لگی تھیں۔ کارپورل نے ایک ہپّی جوڑے کو خوش آمدید کہا جنھوں نے ایک ہی طرح کی افغان غالیچوں سے خود کو اوڑھ رکھا تھا اور جس سے ایسی بو آتی تھی جیسے اس میں خام حشیش باندھ کر رکھی گئی ہو۔

'یہ کیا ہے؟ آزادی کی دوا؟' اس نے پوچھا۔

'افغان مہاجرین کی بنیادی صحت مرکز کے لیے آئی تھی۔' سر میں ست رنگی چوٹیاں باندھے سنہرے بالوں والی لڑکی نے کہا۔ 'گوریلا جنگ میں زخمی ہونے والے مجاہدین کے لیے آئی تھی۔' سنہری گوٹی داڑھی والے لڑکے نے ہلکی سی آواز میں کہا، جیسے وہ کارپورل

لیسارڈ سے کسی بہت چھپا کر رکھے جانے والے راز کی ساجھے داری کر رہا ہو۔ اس نے اپنی ناک کو کلپ بورڈ کے پیچھے چھپاتے ہوئے انھیں اندر آنے دیا۔ اس نے نیکساس کی نرسوں کو خوش آمدید کہا جنھوں نے اپنی کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں اور اوہائیو کے ایک ملٹری اکاؤنٹنٹ کو جو لوگوں کو سرخ فوج کا ایک میڈل دکھاتا پھرتا تھا، جو غالباً کسی مجاہد نے کسی مرے ہوئے سوویت سپاہی کی وردی سے اتارا تھا اور کباڑی کی دکان پر بیچ دیا تھا۔

جب یونی ورسٹی آف نبراسکا کا ایک پروفیسر میرین یونی فارم پہن کر وہاں چلا آیا تو کارپورل لیسارڈ کا صبر جواب دے گیا۔ 'تمھارا کیا خیال ہے بڈی، کہاں جا رہے ہو؟' کارپورل لیسارڈ نے جواب مانگا۔ پروفیسر نے اسے سرگوشی کرتی ہوئی آواز میں بتایا کہ اس نے تعلیمِ بالغان کے لیے جو ادارہ کھول رکھا ہے وہ درحقیقت افغان مجاہدین کو اپنے گوریلا حملوں کی وڈیو فوٹیج شوٹ کرنا اور انھیں ایڈٹ کرنا سکھاتا ہے۔ 'ان لڑکوں میں سے کچھ کے پاس بڑا ٹیلنٹ ہے۔'

'اور یہ؟' کارپورل لیسارڈ نے پروفیسر کے کڑک کیموفلاج یونی فارم کے کاندھے پر لگے پھندنے میں انگلیاں ڈالیں۔

'بھئی ہم جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟' پروفیسر نے کاندھے اُچکائے اور اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اپنی بیلٹ کے اندر اُڑس لیے۔

کارپورل کے پاس سول لوگوں کی طرح کا رویّہ اپنانے والے سپاہیوں کے لیے صبر نہیں تھا اور سپاہی کی اداکاری کرنے والے سول لوگوں کے لیے تو بالکل بھی نہیں، لیکن اس صورتِ حال میں اس نے خود کو بے اختیار پایا۔ اس شام وہ ایک عالی شان دربان سے زیادہ کچھ نہیں تھا جس کا کام مہمانوں کو ان کی نشستوں تک پہنچانا ہو۔ مہمانوں کی فہرست بنانے میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا، چہ جائے کہ ڈریس کوڈ بنانے میں ہوتا۔ لیکن وہ اس جوکر کو اس حلیے میں اندر جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

'تو پھر محاذ پر خوش آمدید۔' اس نے اپنا کلپ بورڈ پروفیسر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

'چلو بھئی چلو۔ اب خود کو ایکٹو ڈیوٹی پر سمجھو۔' کارپورل لیسارڈ گارڈ ہاؤس کی طرف چلا گیا اور وہاں ایک اسٹول پر اس طرح بیٹھ گیا جہاں سے وہ پروفیسر پر نگاہ رکھ سکتا تھا اور اپنے اسٹاف کے ساتھ بیئر پینے کے مقابلے میں شریک ہو گیا۔

* * *

گارڈ ہاؤس سے اُدھر، مہمان دو بڑے بڑے خیموں میں سے کسی ایک کے نیچے سے اشیائے خور و نوش منتخب کر سکتے تھے۔ پہلے شامیانے کے نیچے ایک چھوٹے سے فارم جتنا سلاد پھیلا کر سجایا گیا تھا جس میں کتری ہوئی لال بند گوبھی، بلیو بیریاں اور خنزیر کے گوشت کے قتلوں سے بھرے سینڈوچ، جن پر بلیو بیری کی چٹنی لگی ہوئی تھی، امریکی پرچم کی شکل میں بچھائے گئے تھے۔ گیس سے چلنے والی باربی کیو گرِلز کی قطار کے آگے میرین فوجی کچھے پہنے اور سر پر بیس بال والی ٹوپیاں رکھے ہاٹ ڈاگ، کوارٹر پاؤنڈر اور مکئی کے بھٹے باربی کیو کر رہے تھے۔ بولو ٹائی اور کاؤ بوائے ہیٹ پہنے پاکستانی ویٹر پنچ کے جگ اور بیپر گلاس لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور ان بچوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے جنھوں نے ہاٹ ڈاگ ایک دوسرے پر پھینک کر لڑائی ابھی سے شروع کر دی تھی۔ وہ ان چند لوگوں کو مشروبات پیش کر رہے تھے جنھوں نے دوسرے شامیانے کے نیچے آنے کی زحمت گوارا کی تھی۔ اس سے ملحقہ شامیانے کے نیچے ایک بڑی سی قطار بننے لگی تھی، جہاں آگ پر آٹھ سالم دنبے لوہے کی بڑی بڑی سیخوں پر بھونے جا رہے تھے۔ وہاں ایک افغان شیف بھی دست یاب تھا جو ہر شخص کو یہ یقین دلا سکتا تھا کہ دنبے اسی نے ذبح کیے تھے اور اس شامیانے میں موجود ہر شے حلال تھی۔

سفیر کی بیوی نے اس صبح جب سے افغان شیف کو آٹھ کم عمر دنبوں میں سے پہلے کے اندر لوہے کی ایک انچ موٹی سیخ گھساتے دیکھا تھا، اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ

نینسی رافیل خود ہی تھی جس نے پارٹی کے لیے کابل نیکساس کی تھیم سوچی تھی، لیکن وہ ابھی سے اس خیال پر افسوس کر رہی تھی کیوں کہ زیادہ تر مہمان روایتی افغان ملبوسات کی ہر قسم کی ڈیری ایشن پہنے وہاں آ رہے تھے اور اچانک خود اس کی اپنی ہلکے سرسوں کے رنگ کی شلوار قمیص مضحکہ خیز لگنے لگی تھی۔ اتنے زیادہ امریکیوں کو افغان وار لارڈز کی طرح سجا سنورا دیکھ کر اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کے اپنے شوہر نے اپنے معمول کے شام کے لباس، ڈبل بریسٹیڈ نیلے بلیزر اور ٹین ٹراؤزرز، پر ہی گزارا کیا تھا۔

اس نے ایک ایسے باربی کیو کا منصوبہ بنایا تھا جس میں مختلف ثقافتوں کا خیال رکھا جائے؛ لیکن انجامِ کار اسے لوہے کی سیخوں پر چھوٹے چھوٹے مردہ جثے الٹائے پلٹائے جاتے ہوئے ملے تھے، اور اس کے مہمان امریکی پرچم جیسی ستاروں اور پٹیوں والی کاغذی پلیٹوں کے ساتھ ان کے حصول کے لیے قطار لگائے ہوئے تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ کسی قبائلی دعوت کے مہمان تھے۔ ایسی تناؤ والی صورتِ حال میں جب اس کے شوہر نے آرمی ہاؤس سے ایک کال وصول کی اور اسے بتایا کہ جنرل ضیاالحق تشریف نہیں لا رہے تو سکون کے احساس سے نینسی تقریباً بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس نے فرانسیسی سفیر کی بیوی سے معذرت چاہی، جو ایک اُزبک دلہن کے لباس میں تھی، اور اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے اپنی خواب گاہ میں پناہ ڈھونڈی۔

گارڈ ہاؤس پر کھڑے میرین فوجی اپنی ڈیوٹی کے دوران بھی پارٹی اڑا سکتے تھے، صرف اس لیے نہیں کیوں کہ یہ جولائی کی چار تاریخ تھی بلکہ اس لیے بھی کیوں کہ اس سارے احاطے کی سیکیورٹی پاکستانی فوج کے ایک دستے نے سنبھالی ہوئی تھی۔ گارڈ ہاؤس سے پانچ سو میٹر پہلے، سفیر کی قیام گاہ کی طرف آنے والی سڑک پر، جس کے گرد درختوں کی دو رویہ قطار تھی، مہمانوں کو ایک ہنگامی طور پر تیار کیے جانے والے بیریئر پر رکنا پڑتا تھا، جسے بریگیڈ ایک سو ایک نے کھڑا کیا تھا۔ ایک ہوش یار صوبے دار میجر کی زیرِ کمان یہ سپاہی بم کی نشان دہی کرنے والے اسکینر اور میٹل ڈیٹیکٹر کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے۔ وہ

اپنے اسکینز گاڑیوں کے نیچے پھیرتے، اور اپنے غیر سفید مہمانوں سے ان کی گاڑیوں کی ڈگیاں کھولنے کو کہتے اور بالآخر ہاتھ ہلا کر انھیں گارڈ ہاؤس کی طرف روانہ کر دیتے جہاں میرین فوجیوں کا ایک گروپ انھیں خوش آمدید کہتا جو لحہ بہ لحہ اور بھی زیادہ خوش باش ہوا جاتا تھا۔ سڑک کو روشن کرنے کے لیے فوجی دستے نے اپنی سرچ لائٹس بھی لگا رکھی تھیں۔ یہاں بھی درخت ایسی تیز روشنی میں نہائے ہوئے تھے کہ سڑک کے کنارے کھڑے ان درختوں پر موجود پرندوں کے گھونسلے خالی پڑے تھے۔ ضلعی انتظامیہ کی جانب سے بھیجی جانے والی ایک کیٹرنگ وین نے رات کا کھانا جلدی بھیج دیا تھا اور صوبے دار میجر یہ دیکھ کر بہت برہم ہوا تھا کہ وین میں لایا جانے والا سماوار خالی تھا۔ 'میرے آدمی چائے کے بغیر جاگ کیسے سکیں گے؟' اس نے سویلین وین ڈرائیور سے چلّا کر پوچھا، جو کاندھے اُچکائے اور جواب دیے بغیر وین ڈرائیو کر کے چل دیا تھا۔

سفیر کے ہاں ہونے والی تقریبات میں منتخب اور مخصوص لوگ ہی آتے تھے، لیکن گارڈ ہاؤس سے مہمانوں کو آتا دیکھ کر کارپورل لیسارڈ نے سوچا کہ سفیر صاحب نے اس مرتبہ شاید ہر اُس شخص کو بلا لیا ہے جس نے کسی زخمی افغان مجاہد کو پٹی بھی باندھی ہو اور ہر اُس افغان کمانڈر کو بھی جس نے کسی روسی سپاہی پر دور سے بھی کوئی گولی چلائی ہو۔ کارپورل لیسارڈ نے جب پہلی مرتبہ سوٹ میں ملبوس، دبلے پتلے اور لمبی داڑھی والے ایک شخص کو آتے دیکھا تو پروفیسر کو اس کی ڈیوٹی سے رخصت دے دی۔ 'او بی ایل۔' داڑھی والے آدمی نے کہا اور اپنا ہاتھ ایسے بلند کیا جیسے وہ کسی پارٹی کے دربان کو اپنی شناخت کرانے کے بجائے کسی غیر مرئی ہجوم کو ہاتھ ہلا کر جواب دے رہا ہو۔

کارپورل لیسارڈ نے فہرست کا جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر اس شخص پر نگاہ دوڑائی۔

'لادن اینڈ لادن کمپنی کنسٹرکشنز سے۔' اس شخص نے بے صبری سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کارپورل لیسارڈ نے اپنی مسکراہٹ اور اپنے ہاتھ کی ضرورت سے زیادہ جنبش

کے ساتھ اُسے اندر جانے کا راستہ دیا۔ بیئر کے ڈالے سے اپنی باری لیتے ہوئے کارپورل لیسارڈ نے ایک لطیفہ سنایا۔ 'تولیہ سر پر دھرا عربی بہروپ بھرنا چاہے تو کیا کرے گا؟' پھر اپنی بیئر کو بہ مشکل حلق سے اُتارتے ہوئے بولا: 'سوٹ پہنے گا۔'

سب کو شریکِ طعام کرنے کے لیے سفیر کے پاس خود اپنی وجوہات ہیں۔ اپنی تازہ ذمے داریوں پر فائز ہوئے آرنلڈ رافیل کو ایک برس ہوا تھا اور وہ خود کو روز بروز تنہا ہوتا ہوا محسوس کرتا تھا کیوں کہ درجنوں امریکی ایجنسیاں پاک افغان سرحد پر سوویت فوج کے خلاف اپنے اپنے جہاد شروع کیے بیٹھی تھیں۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو سوویت یونین سے ویت نام کا بدلہ لے رہے تھے، کچھ اللہ میاں کا کام سرانجام دے رہے تھے اور پھر کچھ خیراتی ادارے بھی تھے جن کے نام اتنے مبہم اور مقاصد اتنے دور از کار تھے کہ سفیر کے لیے انھیں یاد رکھنا بھی بہت مشکل ثابت ہوتا تھا۔ اب جب کہ آخری سوویت فوجی افغانستان سے نکلنے والے تھے اور مجاہدین نے کابل کا محاصرہ کر رکھا تھا، کچھ امریکی فتح کا کریڈٹ خود حاصل کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے گریباں گیر تھے، جب کہ کچھ ایسے بھی تھے جو گھر واپس جانے میں ہچکچا رہے تھے، گھسٹتے ہوئے واپس آ رہے تھے اور کسی اور محاذ کے کھل جانے کی امید لگائے ہوئے تھے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے اسے یونی ورسٹی آف منی سوٹا کے اساتذہ کے ایک گروپ سے متعلق ایک مراسلہ موصول ہوا تھا جو افغانستان سے متعلق نئی اسلامی کتابیں تحریر کر رہے تھے اور انھیں وسط ایشیا بھیج رہے تھے۔ اس نے اس معاملے کی تفتیش کی تو اسے بتایا گیا کہ وہ اس معاملے سے دور رہے کیوں کہ یہ ایک اور خفیہ پروگرام کی ایک اور شاخ تھی۔ اسلام آباد میں وہ جس امریکی سے ملتا وہ اس سے یہی کہتا کہ اس کا تعلق 'دوسری والی ایجنسی' سے ہے۔

اسے یقین تھا کہ اگر وہ اس انتشار کو کنٹرول میں لانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اُسے ان سب کو ایک چھت کے نیچے لانا اور ایک علامتی اشارہ دینا ہوگا تاکہ یہ بات واضح

ہو جائے کہ وہاں صرف ایک باس ہے اور وہ باس وہ خود ہے۔ اور اس کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ ان سب کو ایک پارٹی دی جائے؟ اور پارٹی دینے کا وقت چار جولائی سے بہتر کون سا ہوسکتا تھا؟ اسے امید تھی کہ یہ ایک ایسی الوداعی پارٹی ثابت ہوگی جس میں فاترالعقل امریکی ان افغان کمانڈروں سے ملاقات کرسکیں گے جنھوں نے حقیقی لڑائی لڑی تھی، اپنی تصویریں کھنچوائیں گے اور پھر ان میں سے ہر ایک واپس گھر جائے گا تاکہ وہ امریکا کی خارجہ پالیسی کو نافذ کرنے کا نازک کام سرانجام دے سکے۔ آرنی نے کوئی تقریر تو تیار نہیں کی تھی لیکن اس کے پاس کچھ فقرے ضرور تیار تھے جن کے ٹانکے اسے اپنے امریکی مہمانوں کے ساتھ ہونے والی اہم ترین گفتگو میں لگانے تھے: 'کام یابی، شکست سے کہیں بڑا چیلنج ہوتی ہے۔' 'جو دعائیں مقبول ہو جاتی ہیں وہ قبول نہ ہونے والی دعاؤں کی بازگشت سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوسکتی ہیں۔'

وہ اسے 'جاب ویل ڈن، اب تم سب جہاں سے آئے ہو وہیں نکل لو' قسم کا پیغام دینے والی پارٹی بنانا چاہتا تھا۔

سفیر کے ساتھ جنرل اختر کھڑا تھا جو معزز شخصیات کو ہڈیاں چھوڑتے دیکھ کر کراہت محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود کو اس جگہ اجنبی اور ضرورت سے زیادہ سجا بنا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے مکمل سرکاری یونی فارم میں وہاں آ گیا تھا، جس پر سونے کی زردوزی والی پٹی اور پیتل کے چمک دار میڈل تھے، اور اب وہ خود کو ان سفید فاموں کے چھوٹے چھوٹے گروپوں کے درمیان دیکھ رہا تھا جنھوں نے ڈھیلی ڈھالی شلواریں قمیصیں اور سروں پر نہایت عجیب و غریب قسم کی پگڑیاں پہن رکھی تھیں جو اس نے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں دیکھنے کے بعد کہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ کسی بھی اور شخص سے پہلے جنرل اختر یہ بات جانتا تھا کہ جنرل ضیا پارٹی میں نہیں آئے گا۔ 'آپ جانتے ہیں، ان کی طبیعت بھی زیادہ بہتر نہیں۔' اس نے کسی ردِعمل کا باریکی سے جائزہ لیتے ہوئے آرنلڈ رافیل کو بتایا۔ 'بریگیڈیئر ٹی ایم کا نقصان ان کے لیے بڑا سیٹ بیک ہے۔ وہ جنرل ضیا کے لیے بیٹے کی

حیثیت رکھتے تھے۔ میرے بہترین افسران میں سے ایک۔' جب آرنلڈ رافیل نے لاتعلقی سے تعزیت کی تو جنرل اختر کا یہ عزم اور بھی پختہ ہوگیا کہ امریکیوں کے ساتھ معاملہ ایک مرتبہ طے کر ہی لینا چاہیے۔ اس نے انھیں اشتراکیت کے خلاف جنگ جیت کر دی تھی۔ اب وہ مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ چاہتا تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ میں رکھے ایک چھوٹے کیک پر سے اسٹرابیری اُٹھائی اور آرنلڈ رافیل سے کہا، 'مسز رافیل نے اس تقریب کے انتظامات شان دار طریقے سے کیے ہیں۔ ہر کام یاب مرد کے پیچھے ایک۔۔۔'

او بی ایل ایک ایسے صحافی سے بات چیت کر رہا تھا جس نے ایک کاغذی کپ میں بیئر تھام رکھی تھی اور سوچ رہا تھا کہ اب جب کہ جنرل ضیا تقریب میں نہیں آیا تھا تو وہ اپنے اخبار میں کون سی اسٹوری فائل کرے گا۔ 'میں او بی ایل ہوں۔' اس نے صحافی کو بتایا اور منتظر رہا کہ اس کے چہرے پر اسے شناخت کر لینے کے کوئی آثار نمودار ہو جائیں۔ صحافی نے، جو ڈپلومیٹک پارٹیوں کا پرانا چاول تھا اور دور دراز ملکوں سے تعلق رکھنے والے اور عجیب و غریب مقاصد کے حامل غیر معروف سرکاری اہل کاروں سے ملنے کا عادی تھا، اپنا نوٹ پیڈ نکالا اور کہا، 'تو اسٹوری کیا ہے؟'

باہر گارڈ ہاؤس میں یونی ورسٹی آف نبراسکا کے پروفیسر نے، جسے اس شام کے لیے اعزازی میرین فوجی مان لیا گیا تھا، اپنی بوتل بلند کی اور افغانوں کے جنگی میلان کے لیے جامِ صحت تجویز کیا، پھر وہ ایک منٹ کے لیے رکا۔

'ہمارے پاکستانی میزبانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'

'اُن کے بارے میں خیال کا کیا مطلب؟' کارپورل لیسارڈ نے پوچھا۔

'وہاں جو لوگ ٹرکوں پر سوار ہیں۔ ہماری پہلی دفاعی لائن۔ کیا کر رہے ہیں وہ؟'

'اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ جیسے ہم۔'

'نہیں، وہ ہماری ڈیوٹی کر رہے ہیں۔' پروفیسر نے کہا۔ 'وہ دشمن کو فاصلے پر رکھ رہے ہیں۔ اس دوران جب ہم یہ دعوت اُڑا رہے ہیں، اپنی آزادی کو منانے والی یہ دعوت، تو وہ ہمارے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے من وسلویٰ میں انھیں بھی شریک کرنا چاہیے۔'

کارپورل لیسارڈ نے اپنے گارڈ ہاؤس کو دیکھا جو پہلے ہی لوگوں سے ٹھساٹھس بھرا ہوا تھا۔ 'وہ دوسو کے قریب ہیں۔ یہاں تو پورے نہیں آئیں گے۔'

'پھر ہمیں اپنا من وسلویٰ اُن تک لے جانا چاہیے۔'

کارپورل لیسارڈ نے، جو گورز کی بوتلوں اور حُبّ الوطنی اور اس محبت سے بھرا ہوا تھا جو ایسے دن بندہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے محسوس کرتا ہے، خوراک سے بھری ایک ٹرے پاکستانی دستے تک پہنچانے کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔ اس نے ٹرے میں کچھ بیئر کی بوتلیں رکھنے کا بھی سوچا، لیکن اسے اس کے ثقافتی حساسیت کے کورس میں بتادیا گیا تھا کہ وہ کسی مقامی شخص کو الکوحل کی پیش کش نہیں کرے گا، جب تک کہ اس کا کوئی مذموم عزم نہ ہو یا کوئی مقامی شخص بہت اصرار نہ کر رہا ہو۔ کارپورل لیسارڈ نے اسٹین لیس اسٹیل کی ٹرے کو چاندی کے ورَق سے ڈھک دیا، اسے اپنے سر پر بلند کیا اور پاکستانی دستے کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ وہ سڑک کے درمیان میں چل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب موجود درختوں کی شاخیں، اس کی مخمور آنکھوں میں، سانپوں کی طرح شِشکار رہی تھیں۔ سڑک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

او بی ایل اور صحافی دونوں نے ایک دوسرے کو یک ساں طور پر بے کیف پایا۔ جب او بی ایل نے دعویٰ کیا کہ افغانستان میں سوویت فوج کی شکست میں اس کے بلڈوزروں اور کنکریٹ مکسروں نے اہم کردار ادا کیا تو صحافی نے اس کی بات اپنے چہرے پر تمسخر اُڑانے والے تاثرات کے ساتھ سنی۔ 'ہمارا ایڈیٹر سمجھتا ہے کہ سرخ فوج کو پسپائی پر

اُس کے قلم نے مجبور کیا، اور وہ ایک جملہ سیدھا نہیں لکھ سکتا۔' صحافی نے اس مرتبہ بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔ او بی ایل نے صحافی سے کہا کہ وہ چاہے تو اُس کے ساتھ تصویر کھنچوا سکتا ہے۔ لیکن جب صحافی نے کہا کہ 'میرے پاس کیمرا نہیں، اور اگر ہوتا بھی تو مجھے ایک ڈپلومیٹک پارٹی میں اُسے لانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔' تو او بی ایل نے صحافی کا پیچھا چھوڑ دیا۔

'یہ تو بہت غیر پیشہ ورانہ روّیہ ہے۔' او بی ایل خوش باش گھومتے مہمانوں کے مختلف گروپوں پر نظر دوڑاتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس نے لان کے وسط میں جنرل اختر کو دیکھا جو بہت سے افغان ٹوپیاں پہنے امریکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اُس طرف چلتا ہوا گیا اور اس امید میں ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا کہ ان کا گھیرا اسے خوش آمدید کہنے کے لیے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے کچھ منٹوں تک وہیں سے جنرل اختر سے آنکھ ملانے کی کوشش کی۔ اُس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جنرل اختر نے اسے دیکھ لیا، لیکن اسے شناخت کرنے کا کوئی تاثر نہ دیا۔ لیکن سی آئی اے کے مقامی سربراہ نے جنرل اختر کی نگاہ کا تعاقب کیا، دائیں مُڑا اور گھیرے میں اس کے داخلے کی جگہ بنا دی، 'سوٹ اچھا ہے او بی ایل۔'

جنرل اختر کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ 'ہم اپنے سعودی دوستوں کے بغیر یہ جنگ نہیں جیت سکتے تھے۔ بزنس کیسا چل رہا ہے، یا اخی؟' جنرل اختر نے اسے اُس کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔ او بی ایل مُسکرایا اور کہا، 'اللہ بڑا کریم ہے۔ جنگ کے دنوں میں کنسٹرکشن کے بزنس سے بہتر کوئی بزنس نہیں۔'

آرنلڈ رافیل افغان زعما کے ایک گروپ سے بات چیت کر رہا تھا اور اس دوران کن اکھیوں سے اپنی بیوی کو بھی دیکھتا جاتا تھا جو اب پارٹی کے شروع میں پہنے جانے والے اپنے ڈھیلے ڈھالے قبائلی لباس کے بجائے خاکی پتلون اور سادہ سیاہ ٹی شرٹ میں دوبارہ وہاں آ گئی تھی۔ ایک جانب اسے سکون تھا کہ جنرل ضیا وہاں نہیں آیا تھا، لیکن

دوسری جانب ایک سفیر کی حیثیت سے، اور ایک پیشہ ور کی حیثیت سے، اس نے محسوس کیا کہ اسے اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ریاست کی کوئی سرکاری تقریب نہیں تھی، لیکن جنرل ضیا اس کے دفتر کی جانب سے دی گئی کسی دعوت سے غیر حاضر نہیں رہا تھا۔ آرنلڈ رافیل جانتا تھا کہ اپنے سیکیورٹی چیف کی موت کے بعد سے جنرل ضیا سٹھیا گیا ہے لیکن یقیناً جنرل ضیا جانتا ہوگا کہ امریکی سفیر کی قیام گاہ پر چار جولائی کی پارٹی سے زیادہ محفوظ مقام اس انتہائی خطرناک ملک میں اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ 'برادر ضیا نہیں آ رہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔' اس نے دھنک کے تمام رنگوں سے بجی شال اوڑھنے والے ایک افغان زعیم سے کہا۔ افغان زعیم نے ایسے ظاہر کیا جیسے اسے پہلے ہی سے اس کا علم تھا، لیکن اسے اس کی پروانہیں تھی۔ 'جب سے جنگ شروع ہوئی ہے میں نے اس سے بہترین دنبہ نہیں کھایا۔ اتنا نرم۔ ایسے لگتا ہے تم نے اسے اس کی ماں کی کوکھ سے کھینچ نکالا ہے۔'

نینسی کے معدے کی تہوں میں متلی کی ایک لہر سی اُمڈی اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ اس نے اپنے مُنھ پر ایک ہاتھ رکھا، کچھ بڑبڑائی اور اپنی خواب گاہ کی طرف بھاگ گئی۔

او بی ایل امریکیوں اور جنرل اختر کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک پر احتراماً ہنستے ہوئے اس ماحول کو پوری طرح جذب کر رہا تھا۔ وہ اپنے گرد ایسا نور کا ہالہ محسوس کر رہا تھا جو پارٹی میں مرکزِ نگاہ بننے سے محسوس ہوتا ہے۔ پھر اچانک سی آئی اے کے سربراہ نے اپنا ہاتھ جنرل اختر کے کاندھے پر رکھا، او بی ایل کی جانب مُڑا اور کہا، 'آپ سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی، او بی ایل۔ گڈ ورک، کیپ اٹ اپ۔' دوسروں نے اس کی تقلید کی اور کچھ ہی لمحوں میں ساری پارٹی نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اس نے نیوی بلیو بلیزر پہنے ایک شخص کو اپنے کچھ افغان جاننے والوں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ آدمی اہم شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ او بی ایل نے آہستگی سے اُس کے والے گھیرے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔

پارٹی تہ خانے کی طرف چلی، ایک بڑے سے بیس منٹ ہال کی سمت جس میں چمڑے کے صوفے لگے تھے، ایک چوالیس انچ کی ٹیلے وژن اسکرین لگی تھی اور ایک بار بھی موجود تھا؛ امریکی مضافاتی یادوں کی باز آوری کی ایک دلیرانہ مشق۔ آرنلڈ نے اپنے امریکی اسٹاف کے کچھ ارکان کے لیے امریکی فٹ بال لیگ میں ریڈ سکنز اور ٹامپا بے بوکینیئرز کے مقابلے کی ریکارڈنگ دکھانے کا اہتمام کر رکھا تھا، جو پچھلے ہفتے ہوا تھا۔ تہ خانہ سگار کے دھوئیں اور شور مچاتے امریکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ بیئر کے بجائے، جو سیڑھیوں سے اوپر لوگوں کا انتخاب رہی تھی، یہاں لوگ اپنے گلاسوں میں وِسکی ڈال رہے تھے۔ سعودی سفیر پچاس پچاس ڈالر کے نوٹوں کے ساتھ ایک دیوان پر بیٹھا اس کھیل پر شرطیں لگا رہا تھا۔ کسی نے اسے یہ نہیں سمجھایا تھا کہ یہ کھیل آٹھ روز پرانا ہے اور ریڈ سکنز پہلے ہی بوکینیئرز کو پچھاڑ چکے ہیں۔

کفتان پہنے اور فلائر کا نارنجی مفلر گلے میں ڈالے ایک طویل قامت امریکی نے جنرل اختر کو بوربون کی شراب سے آدھا گلاس بھر کر دیا۔ جنرل اختر کا جی تو یہ چاہا کہ وہ وِسکی کو اُس اجنبی کے مُنھ پر پھینک دے لیکن پھر اس نے اردگرد دیکھا، اسے امریکیوں اور سعودی سفیر کے علاوہ کوئی جاننے والا نظر نہ آیا۔ سعودی سفیر خود اس قدر ڈگمگا رہا تھا کہ اسے کسی چیز کی پروانہیں ہو سکتی تھی۔ جنرل اختر نے اپنی شراب پکڑے رہنے کا فیصلہ کیا۔ تہ خانے کا شور، جنرل اختر میں چھپے پرانے جاسوس نے طے کیا، گوگن سے کچھ پوچھنے کے لیے بہترین پس منظر ہو سکتا ہے۔ بڑھتے ہوئے اس شور میں کوئی آواز سمجھ نہیں آ رہی تھی اور اس میں سے کسی آواز کو جاسوسی کا کوئی حساس ترین آلہ بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا: 'اسے پکڑو جیک، پکڑو اسے۔ دھول چٹا دو انھیں جیک، دھول چٹا دو انھیں۔' جنرل اختر نے دوسروں کی طرح اپنا گلاس بھی بلند کیا لیکن اپنی شراب کو صرف سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اس سے کسی پرانے زخم جیسی بُو آ رہی تھی۔

کارپورل لیسارڈ کو اس ٹرک کے پیچھے صوبیدار میجر نے للکارا جہاں پاکستانی سپاہی آخری مہمانوں کو سیکیورٹی چیک سے گزارنے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ صوبیدار میجر نے اپنی کلاشنکوف کا نشانہ کارپورل لیسارڈ کے ماتھے پر باندھا اور اسے رک جانے کا حکم دیا۔

میرین فوجی نے اپنی ٹرے اپنے سر پر بلند کر لی، اسے ڈھانپنے والا چاندی کا ورق ٹرک پر چڑھے ایک سپاہی کی سرچ لائٹ کی روشنی منعکس کرنے لگا۔ 'میں کچھ خوراک لایا ہوں۔ آپ بہادر لوگوں کے لیے۔'

صوبیدار میجر نے اپنی رائفل نیچے کی اور ٹرک سے نیچے اُتر آیا۔ سپاہیوں کی دو قطاروں نے ڈگمگاتے ہوئے اس امریکی کو دیکھا جو اپنے سر پر ٹرے کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صوبیدار میجر اور میرین فوجی سرچ لائٹ سے بننے والے روشنی کے ایک دائرے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

'ہاٹ ڈاگ ہیں۔' کارپورل لیسارڈ نے ٹرے صوبیدار میجر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

جنرل اختر نے اپنا گلاس دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں دیا اور اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنے ہاتھ اوپر کیے اور جنرل ضیا کی مونچھوں کی نقل اُتاری۔ اسلام آباد کے ڈرائنگ رومز میں جب لوگ ڈرا دینے والے اس نام کو نہیں لینا چاہتے تھے تو یہی عالم گیر علامت استعمال کرتے تھے۔ جنرل اختر کے دائیں انگوٹھے اور انگشتِ شہادت نے اس کے بالائی ہونٹ کے اوپر موجود نظر نہ آنے والے بالوں کو مروڑی دی: '۔۔۔ آج کل خواب دیکھ رہا ہے۔' جنرل اختر نے گوگن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

گوگن، جس کا دل اس کوارٹر بیک کے ساتھ دوڑ رہا تھا جس نے اُسی وقت چھپّن گز کے میدان میں دوڑ لگانی شروع کی تھی، مسکرایا اور اس نے کہا، 'وہ وژنری ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ ایسے لوگ تبدیل نہیں ہوتے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹی ایم کی فری فال سے فائدہ نہیں ہوا ہوگا۔ بائی دے وے فقرہ اچھا گھڑا تم نے اختر: ایک پیشہ ور سپاہی جس نے مرتے ہوئے بھی اپنا ہدف مس نہیں کیا۔ اگر تمھارے پاس میں تمھاری حسِ مزاح کا نصف بھی ہوتا تو تمھارا یہ پاکستان کہیں زیادہ خوش گوار جگہ ہوتی۔' گوگن نے آنکھ ماری اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جنرل اختر نے خود کو کچھ نروس محسوس کیا۔ وہ ایسے کھیل لمبے عرصے سے کھیل رہا تھا اس لیے جانتا تھا کہ اسے جنرل ضیا کا تختہ اُلٹنے کے لیے تحریری کانٹریکٹ تو ملے گا نہیں۔ دھت تیرے کی، اسے تو زبانی یقین دہانی حاصل کرنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ لیکن یقینی طور پر وہ لوگ اسے اتنا تو جانتے اور اُس پر اعتماد کرتے تھے کہ اس کے کیے پر اثبات میں سر ہلا دیتے۔ 'جب تک آپ اُسے امن انعام نہیں دیں گے وہ جنگ بند نہیں کرنے کا۔' جنرل اختر نے اپنے مقدمے پر زور دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے اردگرد دیکھا اور اُسے احساس ہوا کہ کسی کو ان کی بات چیت سے دور کی بھی دلچسپی نہیں تھی۔

'کون سا انعام؟' گوگن اُس شور سے زیادہ بلند آواز میں بولا۔ 'پکڑ اُسے جیک، پکڑ اُسے۔'

'نوبیل امن انعام۔ افغانستان کو آزادی دلانے پر۔'

'وہ تو سویڈن والے دیتے ہیں۔ ہم ایسے کاموں میں نہیں پڑتے۔ اور تم ان مغرور سویڈز کو نہیں جانتے۔ وہ یہ انعام ایسے کسی آدمی کو نہیں دینے کے جس کے۔۔۔' گوگن نے جنرل ضیا کی مونچھوں کی نقل اُتاری اور قہقہہ لگاتے ہوئے ایک بار پھر ٹیلے وژن کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جنرل اختر زیرِ نظر معاملے میں گوگن کی جانب سے دلچسپی کے انتہائی فقدان کو ملاحظہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی جنگ جیت لی تھی اور وہ اس کا جشن منانا چاہتا تھا۔ جنرل اختر جانتا تھا کہ امریکیوں کی توجہ کا دورانیہ کتنا مختصر ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جاسوسی کے نازک فن میں اتنی سی آمادگی بھی آمادگی ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جنرل اختر اس سے زیادہ واضح علامت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک کمرے میں حشیش کی تیز بو سونگھی اور گھبراہٹ میں اردگرد دیکھا۔ کسی اور کو اس کی پرواہ نہیں لگتی تھی۔ وہ اب بھی جیک پر زور دینے میں مصروف تھے کہ وہ انھیں پکڑ لے اور دھول چٹا دے۔ جنرل اختر نے نوٹ کیا کہ جس آدمی نے اُسے شراب انڈیل کر دی تھی وہ گوگن کے پیچھے کھڑا کسی نشہ آور شے کے سُوٹے لگا رہا تھا۔ 'لیفٹیننٹ بینن سے ملیے۔' گوگن نے جنرل اختر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ 'یہ تمھارے لڑکوں کو خاموش ڈرل سکھا رہا ہے۔ ہمارا بنیادی آدمی ہے یہ۔'

جنرل اختر ان کی طرف مُڑا اور انھیں اپنی زرد رنگ کی کم زور سی مسکراہٹ پیش کی۔

'میں اس تمام اچھے کام سے آگاہ ہوں جو انھوں نے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے لڑکے اب اصلی کام کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔' جنرل اختر نے بینن کے ہاتھ میں پکڑے نشہ آور سگریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

او بی ایل پھینک دی گئیں کاغذی پلیٹوں، آدھ کھائے ہاٹ ڈاگ، اور چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے درمیاں خالی لان میں چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ اس شامیانے کی طرف گیا جہاں اُس نے دنبے کی جلتی ہوئی چربی سونگھی تھی۔

کابل والے شامیانے کے اندر افغان شیف نے اپنی پکوانی تخلیق کا بچا کھچا باریکی سے ملاحظہ کیا۔ باربی کیو آگ کی انگارا سی جلتی راکھ پر آٹھ ڈھانچے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ ان کی کچھ بوٹیاں اپنے گھر اپنے اہلِ خانہ کے لیے لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کا چھوٹا سا چاقو بھی ہڈیوں پر سے کچھ زیادہ بوٹیاں نہ اُتار سکا۔ 'اوہ خدا،' وہ اپنے کنائی کے چاقو پیک

کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ 'یہ امریکی تو سُوّروں کی طرح کھاتے ہیں۔'

گوگن کی توجہ منقسم تھی۔ ایک طرف وہ اس خستہ حالی پر توجہ دے رہا تھا جس سے ریڈ سکنز کی ٹیم گزر رہی تھی اور دوسری جانب اس جنرل پر جو وہاں اپنے ہاتھوں میں نجانے کب سے گلاس پکڑے بیٹھا تھا، جس میں سے اُس نے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ گوگن نے جنرل اختر کو دیکھ کر اپنا گلاس بلند کیا، اور اس دوران اُس کی ایک آنکھ ریڈ سکنز کے ایک کوارٹر بیک پر رہی جو بوکینیئرز کی دفاعی لائن توڑ رہا تھا، جبکہ دوسری آنکھ جنرل کو میچ کر اشارہ کر رہی تھی۔ گوگن چلّایا، 'جاؤ جا لو اُسے۔'

جنرل اختر جانتا تھا کہ اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا گلاس بلند کیا اور اسے ایک بار پھر گوگن کے گلاس سے ٹکرایا۔ 'حتم ہے۔ جا لو اُسے۔' اُس نے اپنے گلاس سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور اچانک اُس مشروب کی بُو اُسے اُتنی ناگوار نہ لگی جتنی کچھ سیکنڈ پہلے لگی تھی۔ اس کا ذائقہ تلخ تو تھا لیکن اُتنا بھی نہیں جتنا وہ تمام عمر سمجھتا رہا تھا کہ ہوگا۔

صوبیدار میجر نے ٹرے کو دیکھا، میرین فوجی کے چہرے کو دیکھا اور سمجھ گیا۔

'ٹی؟ ہیو سم؟' صوبیدار میجر نے پوچھا۔

'ٹی؟' کارپورل لیسارڈ نے دُہرایا۔ 'میرے ساتھ زیادہ انگریز مت بنو، یہ لو کھانا کھاؤ۔'

میرین فوجی نے ٹرے پر سے چاندی کا ورق ہٹایا، ایک ہاٹ ڈاگ باہر نکالا اور واپس جانے کو ہوا۔

صوبیدار میجر کچھ کچھ سمجھتے ہوئے مسکرایا۔ 'ڈاگ؟ حلال؟'

کارپورل لیسارڈ کا صبر جواب دے رہا تھا۔ 'نہیں۔ نہیں ڈاگ کا گوشت نہیں ہے۔

بیف ہے۔' وہ گائے کی آواز میں ڈکرایا اور چاقو سے گائے کی گردن کاٹنے کی اداکاری کی۔

'حلال؟' صوبیداری میجر نے ایک بار پھر پوچھا۔

ایک چڑیا غلطی سے فلڈ لائٹ والے حصے میں آ گئی اور اس نے ایسے زور زور سے چلانا شروع کر دیا جیسے وہ اُن دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کا خلا پُر کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کارپورل لیسارڈ کو اچانک اپنے گھر کی یاد آ گئی۔

'یہ ایک بھینس کے گوشت کا ٹکڑا ہے جو بھینس کے بریڈ میں ڈالا گیا ہے۔ اگر ہم اس پر بھی متفق نہیں ہو سکتے تو میں یہاں آخر کر کیا رہا ہوں؟' اُس نے ٹرے زمین پر پھینک دی اور گارڈ ہاؤس کی طرف واپس دوڑنا شروع کر دیا۔

نینسی رافیل نے اپنا سر اپنے سرہانے میں گاڑ دیا اور اپنے شوہر کے بستر پر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ 'آیندہ ہمیں اپنے کاک ٹیل مینو پر ہی اصرار کرنا چاہیے۔' اس نے نیند کی وادی میں جانے سے پہلے کہا۔

* * *

جنرل اختر جب سفیر کی قیام گاہ سے باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک بہت مضطرب میجر نے سلام کیا۔

'جنرل ضیا گم ہو گئے ہیں۔' میجر نے اُس کے کان میں کہا۔ 'کہیں بھی اُن کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔'

۲۵

تہ خانے میں رات طویل ہے۔ میرے خواب میں ماؤ کی شکل والی ایک پوری فوج اپنی ماؤ ٹوپیوں کو گداگروں کے پیالوں کی طرح ہاتھوں میں اُٹھائے ماتمی جلوس کی صورت رواں ہے۔ ان کے ہونٹ سرخ دھاگے سے سی دیے گئے ہیں۔

دیوار میں لگی ہوئی اینٹ سرسراتی ہے۔

سیکرٹری جنرل کا بھوت پہلے ہی سے اپنا کام کر رہا ہے، میں خود کو بتاتا ہوں۔ 'کچھ آرام کر لو۔' میں چلاتا ہوں۔ اینٹ پھر سے سرکتی ہے۔ میں بھوتوں سے نہیں ڈرتا؛ میں اپنی زندگی میں کئی بھوت دیکھ چکا ہوں۔ وہ تمام یوں میری طرف لوٹتے ہیں جیسے میں نے ان کے لیے یتیم خانہ کھول رکھا ہو۔

میں اینٹ کھینچ نکالتا ہوں، اپنا منھ سوراخ پر رکھتا ہوں اور میڈیم پانچ کی آواز میں چلاتا ہوں، 'ذرا سا سو جاؤ، سیکرٹری جنرل، ذرا سا سو جاؤ۔ انقلاب صبح تک تمھارا انتظار کر لے گا۔'

ایک ہاتھ میرے چہرے کے نقوش سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگلیاں نرم ہیں، ایک عورت کی انگلیاں۔ وہ مجھے ایک مڑا تڑا لفافہ دیتی ہے۔ 'اسے میں نے اپنے سیل میں پایا۔' وہ بتاتی ہے۔ 'یہ میرا نہیں۔ میں پڑھ نہیں سکتی۔ میں نے سوچا شاید یہ تمھارے لیے ہو۔ کیا تم پڑھ سکتے ہو؟'

میں لفافے کو اپنی جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ 'یہاں کوئی بھی نہیں پڑھ سکتا۔' میں گفتگو کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ 'یہ جگہ بالکل تاریک ہے۔ یہاں ہم سب حرام کے اندھے ہیں۔'

ایک لمحے کی خاموشی۔ 'یہ مرحوم کی طرف سے کوئی پیغام لگتا ہے۔ اسے رکھ لو۔ میرا خیال ہے کسی نہ کسی کا سفر شروع ہونے والا ہے۔ وہ میں تو نہیں ہو سکتی۔ تمھیں خود کو تیار رکھنا چاہیے۔'

۲۶

جنرل ضیا نے نے محافظوں کے بغیر آرمی ہاؤس سے باہر نکلنے کے لیے اپنے مالی سے سائیکل مانگنے کا فیصلہ کیا، لیکن پہلے اسے ایک شال کی ضرورت تھی۔ اسے اس شال کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ باہر سردی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ خود کو چھپانا چاہتا تھا۔ آرمی ہاؤس سے باہر نکلنے کے اس فیصلے کا سبب قرآن کی ایک آیت بنی تھی۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے باہر نکلنا اس کے دوست چاؤشسکو کا بھی آئیڈیا تھا۔

یہ منصوبہ الوہی اور سازشی شخصیتوں کا ایک خوش گوار امتزج تھا۔

وہ بریگیڈیئر ٹی ایم کے جنازے سے لوٹا تھا اور اس نے خود کو اپنی مطالعہ گاہ میں بند کر لیا تھا اور اس چھوٹے سے چھوٹے سرکاری کام پر توجہ دینے سے بھی انکار کر دیا جو وہ کوڈ ریڈ کا حکم دینے کے بعد کرتا آ رہا تھا۔ اس نے اس حادثے کی جاریہ تحقیقات سے مُتعلق اس فائل کے صفحے الٹانے شروع کیے جو اسے جنرل اختر نے بھیجی تھی۔ فائل کی سمری میں جنرل اختر کو اس بات پر مبارک باد دی گئی تھی کہ اس نے بریگیڈیئر ٹی ایم کی افسوس ناک موت کو ٹی وی پر بہ راہِ راست نشر نہیں کر دیا۔ ورنہ یہ آرمی کی پیشہ ورانہ صلاحیت پر قوم کے اعتماد کو ایک بڑا جھٹکا ثابت ہوتا۔

جنرل ضیا ایک ناگزیر فعل کے ارتکاب سے خود کو روکنے کی کوشش میں رویا اور نان اسٹاپ دعائیں مانگیں، لیکن ایک عادی نشئی کی طرح اس نے اپنے ہاتھوں کو سبز مخمل میں

لیٹی قرآن کی ایک جلد کی جانب بڑھتے ہوئے پایا۔ اس نے قرآن کی جلد کو تین مرتبہ چوما اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اسے کھولا۔

جب کتاب میں حضرت یونس کی دعا کے بجائے، جس کا اسے ڈر تھا، ایک زیادہ عملی آیت سامنے آئی تو خوشی سے اس کے گھٹنے کپکپانے لگے۔ 'دنیا میں نکل جاؤ، اے ایمان والو۔۔۔'

اس کے آنسو سب سمجھنے والی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ اس کی مقعد میں ہونے والی کھجلی بھی دعوتِ عمل محسوس ہونے لگی؛ اس نے اپنی پیٹھ کو کرسی کے کنارے پر رگڑا۔ تسکین کے اس عالم میں اسے نکولائی چاؤشسکو کی وہ نصیحت یاد آئی جو اس نے ناوابستہ تحریک کی کانفرنس کے دوران ایک دوطرفہ ملاقات میں اسے کی تھی۔ یہ ان ملاقاتوں میں سے ایک تھی جن میں مملکت کے سربراہان کے پاس بات چیت کے لیے کچھ نہیں ہوتا اور جسے مترجمین نیک خواہشات کے لمبے چوڑے اور سجے سجائے ترجمے سے طول دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دونوں رہ نما دو ایسے ملکوں سے آئے تھے جو ایک دوسرے سے اتنے دور اور مختلف تھے کہ چاؤشسکو جنرل ضیا سے دوطرفہ تجارت بڑھانے کی بات بھی نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ رومانیہ اور پاکستان کے درمیان تجارت ہوتی ہی نہیں تھی۔ اور جنرل ضیا مسئلۂ کشمیر پر چاؤشسکو کو حمایت کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیوں کہ اس بات کی توقع نہیں تھی کہ چاؤشسکو کو کشمیر کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ ہے کہاں، چہ جائے کہ اسے اس کے مسئلے کا بھی علم ہوتا۔ لیکن اس آدمی سے مُتعلق ایک حقیقت ایسی تھی جس سے جنرل ضیا کو صحیح معنوں میں دلچسپی تھی: چاؤشسکو پچھلے چوبیس سال سے اقتدار میں تھا اور اقتدار میں اس جتنی طوالت اور شہرت رکھنے والے دیگر حکم رانوں کے برخلاف اسے سیکرٹری جنرل بریزنیف بھی خوش آمدید کہتے تھے اور صدر نکسن بھی اور اسے حال ہی میں برطانیہ عظمیٰ کی ملکہ نے سر کا خطاب بھی دیا تھا۔

اور یہاں وہ غیروابستہ ملکوں کی تنظیم میں بھی موجود تھا، جب کہ اس کا ملک اس تنظیم

کا رُکن تک نہیں تھا۔ انھوں نے اس کے ملک کو مبصر کا درجہ تو دیا تھا لیکن چاؤشسکو واضح طور پر جانتا تھا کہ وابستہ کیسے ہوا جاتا ہے۔

جنرل ضیا ہر اس آدمی سے متاثر ہوتا اور اس کے بارے میں تجسس رکھتا تھا جو اس سے زیادہ مدت تک کے لیے اقتدار میں رہنے میں کام یاب ہوا ہو۔ اس نے عالمی اسٹیج کے پرانے دھرانے حکم رانوں میں سے ان کا راز پوچھا تو تھا لیکن کسی نے اسے وہ مشورہ نہیں دیا تھا جسے وہ پاکستان میں استعمال کر سکتا۔ فیڈل کاسترو نے اسے اپنے مشن سے سچا رہنے اور رم کے ساتھ بہت سا پانی پینے کا مشورہ دیا تھا۔ کم ال سنگ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اداس کر دینے والی فلموں سے پرہیز کرے۔ ریگن نے نینسی کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا، 'اچھے برتھ ڈے کارڈ۔' سعودی عرب کا شاہ عبدالعزیز زیادہ تر سے بڑھ کر کھرا ثابت ہوا: 'مجھے کیا معلوم؟ میرے ڈاکٹر سے پتا کر لو۔'

چاؤشسکو کے ساتھ جنرل ضیا کو یہ سہولت تھی کہ وہ ایک کامل اجنبی تھا اس لیے وہ اس سے براہِ راست سوال پوچھ سکتا تھا۔

یہ ملاقات منیلا ہلٹن کی تینتالیسویں منزل کے ایک چھوٹے سے کانفرنس روم میں ہوئی۔ بھرے بھرے جسم کی مالک اور کاندھوں پر فیتے لگے سوٹ میں ملبوس چھبیس سالہ مترجم خاتون اس وقت حیران رہ گئی جب جنرل ضیا نے خوش آمدیدی کلمات کو مختصر کیا اور کہا کہ وہ ملاقات کے لیے طے دس منٹوں کو حضرتِ والا جاہ سے امورِ مملکت چلانا سیکھنے میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ چاؤشسکو کی ڈریکولا نما مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے مترجم کے زانو پر ہاتھ رکھا اور بڑبڑایا: 'Noi voi tot Learn de la each alt'

جنرل ضیا نے خیال کیا کہ چاؤشسکو یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں روزانہ تازہ خون کا ایک پنٹ پینا چاہیے۔

'ہم سب کو ایک دوسرے سے سیکھنا چاہیے۔' مترجم نے ترجمہ کیا۔

'آپ اتنے طویل عرصے تک اقتدار میں رہنے میں کیسے کام یاب ہو سکے؟'

'Cum have tu conducere la spre stay in serviciu pentru such un timp indelungat?'

مترجم نے اپنی گود میں چمڑے کا ایک فولڈر رکھتے ہوئے چاؤشسکو سے پوچھا۔

چاؤشسکو دو منٹ تک بولتا رہا، جس کے دوران وہ اپنی انگلیاں چٹخاتا اور اپنی ہتھیلیوں کو کھولتا اور بند کرتا رہا اور بالآخر انھیں مترجم کے زانو تک لے گیا۔ اس نے خود کو چمڑے کے ایک فولڈر کو تھپکی دیتے ہوئے پایا۔

'رائے عامہ کے بارے میں تمھاری خفیہ ایجنسیاں تمھیں جو کچھ بتاتی ہیں اس میں سے صرف دس فی صد پر یقین کرو۔ کنجی یہ ہے کہ عوام کو تم سے محبت کرنی چاہیے یا تم سے خوف زدہ ہونا چاہیے؛ جس روز وہ تم سے لاتعلق ہو جائیں گے تمھارا زوال شروع ہو جائے گا۔'

'فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کرو۔ انھیں حیران کرو، ریستورانوں میں جاؤ، اسپورٹس کے میچوں میں دکھائی دو۔ تمھارے ہاں فٹ بال ہوتی ہے؟ فٹ بال کے میچوں میں جاؤ، رات کو چہل قدمی کے لیے نکلا کرو۔ سنو کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور پھر وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں سے بھی صرف دس فی صد پر یقین کرو کیوں کہ جب وہ تمھارے ساتھ ہوں گے تو وہ بھی جھوٹ بولیں گے۔ لیکن جب وہ تم سے مل چکیں گے تو تم سے محبت کرنے پر مجبور ہوں گے اور وہ دوسرے لوگوں کو بتائیں گے اور پھر وہ دوسرے بھی تم سے محبت کریں گے۔'

چاؤشسکو کی گفتگو کے دوران جنرل ضیا بے تابی سے سر ہلا رہا تھا، اور پھر اس نے اسے قومی دن کی پریڈ میں مہمانِ خصوصی بننے کی دعوت دی، یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ جانے کے لیے اُٹھ ہی رہا تھا کہ چاؤشسکو نے مترجم کو چلّا کر کچھ کہا۔ جنرل ضیا مترجم کی طرف واپس مڑا جس نے اب اپنا فولڈر کھول کر اسے اپنی گود میں پھیلا لیا تھا۔

'فٹ بال کے میچ پر جانے سے پہلے یہ بات یقینی بنا لو کہ تمھاری ٹیم کو جیتنا چاہیے۔'

جنرل ضیا نے متذکرہ عوامی اجتماعات کی جگہوں میں سے کچھ پر جانے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی وہ وی آئی پی ایریا سے نکل کر عام لوگوں میں گھلتا ملتا، اسے یہ احساس ہو جاتا کہ وہ کرائے پر حاصل کیے ہوئے ہجوم کے درمیان کھڑا ہے؛ ان کا جھنڈیاں ہلانا اور نعرے لگانا ریہرسل کی ہوئی ایک مشق لگتی۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرتا تو ان میں سے بہت سے لوگ اکڑ سے جاتے اور وہ بتا سکتا تھا کہ وہ سول کپڑوں میں ملبوس فوجی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اس سے ڈرے ہوئے لگتے، لیکن پھر وہ اپنے ایک طرف بریگیڈیئر ٹی ایم کو دیکھتا، ہجوم کو دور رکھنے کے لیے اس کی کہنیاں استعمال کرتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ لوگ اس سے نہیں ڈر رہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ بریگیڈیئر ٹی ایم کی نظر میں نہ آ جائیں۔ وہ کرکٹ کے کچھ میچ بھی دیکھنے گیا اور اسے معلوم ہوا کہ لوگ زیادہ دلچسپی کھیل میں رکھتے ہیں اور انھیں اس سے محبت کرنے یا اس سے خوف زدہ ہونے کی زیادہ پروا نہیں۔

اب جب کہ بریگیڈیئر ٹی ایم اس کے ساتھ نہیں تھا، کرنے کی صرف ایک ہی چیز رہ گئی تھی؛ کامریڈ چاؤشسکو کی نصیحت آزما لی جائے۔ اپنے محافظوں کے بغیر آرمی ہاؤس سے باہر چلا جائے۔

عشا کی نماز کے بعد اپنی مطالعہ گاہ کو جانے کے بجائے وہ اپنی خواب گاہ کی طرف گیا جہاں خاتونِ اوّل ایک کرسی پر بیٹھی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو ایک کہانی پڑھ کر سنا رہی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے سر پر بوسہ دیا، بیٹھ گیا اور خاتونِ اوّل کی جانب سے کہانی ختم کر لینے کا انتظار کرنے لگا۔ آنے والی مہم کے امکانات کے سبب اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو ایسے دیکھا جیسے وہ کسی دور دراز جنگ کے لیے رخصت ہو رہا ہے جس سے شاید وہ واپس آئے یا نہ آئے۔

'کیا میں ایک شال لے سکتا ہوں؟'

'کون سی والی؟'

اسے توقع تھی کہ وہ اسے یہ کہے گی کہ اسے شال کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنے مشن پر جانے سے پہلے کم از کم ایک انسان کو بتا سکے گا، مگر اس نے فقط اتنا ہی کہا، کون سی والی؟

'جتنی پرانی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔' جنرل نے لہجے کو پُر اَسرار بناتے ہوئے کہا۔ وہ ڈریسنگ روم گئی اور اس کے لیے میرون رنگ کی ایک شال لے آئی جس کے کناروں پر مہین کڑھائی تھی۔ اس نے اس سے اب بھی نہ پوچھا کہ اسے اس کی ضرورت کیوں آ پڑی تھی۔

جنرل ضیا نے اپنی مہم شروع ہونے سے پہلے ہی خود کو ذلیل ہوتے ہوئے محسوس کیا، اپنی بیٹی کو گلے لگایا اور باہر جانے لگا۔

'شال گندی مت کر دینا۔' خاتونِ اوّل نے کہا۔ 'یہ میری ماں کی شال ہے۔'

جنرل ضیا ایک لمحے کے لیے رکا اور اس نے سوچا کہ شاید اسے اپنی بیوی کو اعتماد میں لے ہی لینا چاہیے، لیکن اس نے اپنی کتاب دوبارہ اُٹھا لی تھی اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے پوچھا۔ 'کیا وہ خلیفہ عمر تھے جو عام آدمی کا بہروپ بھر کر رات کو باہر نکلا کرتے تھے تاکہ دیکھ سکیں کہ ان کی رعایا امن چین سے رہ رہی ہے؟'

جنرل ضیا نے اپنا سر ہلایا۔ خاتونِ اوّل کو تاریخ کا واقعی پتا ہے، اس نے سوچا۔ اگر اسے خلیفہ عمر ثانی کہہ کر یاد کیا جائے تو اسے افسوس نہیں ہوگا۔

'کیا انھی نے کہا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا سوتا ہے تو ان کی نجات نہیں ہوگی؟'

'جی۔' جنرل ضیا نے کہا۔ اس کی مونچھ نے ذرا سا رقص کیا۔

'انھیں ہماری اسلامی جمہوریہ کو دیکھنا چاہیے۔ اس ملک کو ہوس ناک کتے چلا رہے ہیں۔'

جنرل ضیا کا دل ڈوب گیا، اس کی مونچھ لٹک گئی لیکن اس نے وہ آیت دُہرائی جس نے اسے آگے بڑھ کر دنیا میں نکلنے کی تلقین کی تھی اور وہ ایک تازہ عزم کے ساتھ پیر پٹختا

کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے اپنے مالی سے پوچھا کہ کیا وہ اس کی سائیکل لے سکتا ہے، اور مالی نے یہ پوچھے بغیر اسے سائیکل تھما دی کہ اسے اس کی ضرورت کیوں آن پڑی تھی۔ جب وہ عمارت کے اقامتی حصے سے باہر نکلا تو دروازے پر تعینات دو کمانڈوز نے اسے سلیوٹ کیا اور اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ اس نے انھیں کہا کہ وہ دروازے پر ہی اس کا انتظار کریں۔ وہ اپنی ٹانگوں کی ایکسرسائز کرنے جا رہا ہے۔

پھر اس نے شال اپنے سر اور چہرے کے گرد کس کر باندھ لی، اور اس کی آنکھیں اور ماتھا ہی کھلے رہ گئے۔ وہ سائیکل پر چڑھا اور پیڈل مارنے شروع کر دیے۔ پہلے کچھ میٹر تک سائیکل غیر مستحکم سی رہی، وہ بائیں گئی اور پھر دائیں، لیکن پھر اس نے توازن پا لیا اور وہ آہستہ آہستہ پیڈل مارتا اسے سڑک کی ایک جانب لے چلا۔

جب اس کی سائیکل آرمی ہاؤس کے گیٹ تک پہنچی تو اسے دوسرے خیال آنے لگے۔ شاید مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ شاید مجھے بریگیڈیئر ٹی ایم کو بتانا چاہیے اور وہ اپنے کچھ آدمیوں کو سول کپڑوں میں بھیج دے جو میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ پھر بریگیڈیئر ٹی ایم کا پرچم میں لپٹا ہوا تابوت اس کی نگاہوں کے سامنے آیا اور اس کی سائیکل لڑکھڑا کر رہ گئی۔ جنرل ضیا اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کی سائیکل آرمی ہاؤس کے گیٹ پر سنتری کی پوسٹ پر جا پہنچی اور گیٹ کھول دیا گیا۔ اس نے سائیکل آہستہ کی، بائیں اور پھر دائیں دیکھا، امید کی کہ کوئی اسے پہچان لے گا اور پوچھے گا کہ آخر وہ کرنے کیا لگا ہے۔ اس متوقع سوال پر وہ کوئی بہانا سوچ ہی رہا تھا کہ سنتری کی پوسٹ سے چلّاتی ہوئی ایک آواز آئی۔

'گھر جانے کا جی نہیں چاہ رہا، بڈّھے؟ جورو سے ڈرتا ہے کیا؟'

اس نے سنتری کی پوسٹ کی جانب دیکھا، لیکن اسے کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ اس کے پیروں نے پیڈل زور زور سے چلانے شروع کر دیے۔ اس کے پیچھے ہی گیٹ بند ہو

گیا۔ اس خیال نے اس میں نئی توانائی بھر دی کہ اس کا بہروپ کام دکھا رہا تھا۔ اس کے شکوک رفع ہو گئے، اس نے سائیکل کی گدی سے اپنی پیٹھ اُٹھائی اور زیادہ زور وشور سے پیڈل مارنے لگا اور اس کی آنکھیں اس کاوش اور اس کے جذبے کے سبب نم ہونے لگیں۔ شاہ راہِ آئین کی طرف جانے والے چوراہے پر اس نے ایک سرخ سگنل پر انتظار کیا، اگرچہ اس وقت وہاں ایک بھی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بتّی کافی وقت تک کے لیے سرخ رہی اور اس کے سبز ہونے کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس نے بائیں اور دائیں دیکھا اور ایک بار پھر بائیں اور پھر شاہ راہِ آئین کی جانب مڑ گیا۔

شاہ راہ مکمل طور پر ویران تھی، کوئی شخص، کوئی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ یہ آٹھ لین کی سڑک ٹریفک کے لیے نہیں بنائی گئی تھی جو شہر کے اس حصے میں دن کے اوقات میں بھی خال خال ہی ہوتا تھا، بلکہ یہ تو قومی دن کی سالانہ پریڈ پر بھاری توپ خانے اور ٹینکوں کو گزارنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ شاہ راہ سہ پہر کی بارش کے سبب ابھی تک گیلی تھی اور اسٹریٹ لائٹس کے نیچے پیلی پیلی چمک رہی تھی۔ اسے گھیرے میں لینے والی پہاڑیاں خاموش اور سنجیدہ کھڑی تھیں؛ جنرل ضیا آہستگی سے سائیکل چلاتا گیا۔ اس کی ٹانگیں، جو اتنی حرکت کی عادی نہیں تھیں، درد کرنے لگی تھیں۔ پہلے تو وہ سڑک کے کنارے کنارے سیدھا چلتا گیا، پھر درمیان میں ہو لیا اور سائیکل کو زگ زیگ چلانا شروع کر دیا۔ اگر پہاڑیوں پر سے کوئی آدمی اسے دیکھ لیتا تو اسے شال میں لپٹا ہوا ایک ایسا بوڑھا نظر آتا جو اپنی سائیکل پر لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ لوگ یہی سمجھتے کہ بوڑھا آرمی ہاؤس میں تمام دن سخت محنت مشقت کے بعد اب غالباً بہت تھک چکا ہے۔

جب اس نے کسی شخص کو دیکھے بغیر آدھے میل کا فاصلہ طے کر لیا تو ایک حیرت انگیز احساس اس کے اندر گھر بنانے لگا: کیا عجب کہ وہ ایک ایسے ملک پر حکومت کر رہا ہو جہاں کوئی بستا ہی نہ ہو؟ کیا عجب کہ یہ کوئی بھوتوں کا ملک ہو؟ کیا عجب کہ یہاں واقعی میں کوئی موجود ہی نہ ہو؟ کیا عجب کہ مردم شماری سے سامنے آنے والے اعداد وشمار جو یہ کہتے

تھے کہ ملک میں تیرہ کروڑ لوگ رہتے ہیں، جن میں سے باون فی صد عورتیں، اڑتالیس فی صد مرد اور ننانوے فی صد مسلمان ہیں، فقط اس کی شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار نوکر شاہی کی کارستانی ہوں۔ کیا عجب کہ سب لوگ کہیں اور کُوچ کر گئے ہوں اور وہ ایک ایسے ملک پر حکومت کر رہا ہو جہاں اس کی فوج، اس کی نوکر شاہی اور اس کے محافظوں کے علاوہ کوئی رہتا ہی نہ ہو؟ اس کی سانس پھول رہی تھی اور وہ اس بات پر مسرور تھا کہ اگر کوئی شخص سائیکل پر بیٹھا ایک عام آدمی ہو تو اس کے ذہن میں کیسی کیسی سازشی تھیوریاں آ سکتی ہیں، کہ اسی دوران سڑک کے کنارے ایک جھاڑی میں حرکت ہوئی اور ایک آواز اس پر چلّائی: 'ادھر آؤ، بوڑھے۔ سائیکل چلاتے ہو ہیڈ لائٹ کے بغیر؟ تمھارا کیا خیال ہے یہ تمھارے باپ کی سڑک ہے؟ ملک میں پہلے ہی لاقانونیت کم ہے کیا؟'

جنرل ضیا نے بریک لگانے کے بجائے اپنی ایڑیاں سڑک سے لگائیں اور اس کی سائیکل لڑکھڑاتی ہوئی رکی۔ جھاڑی کے پیچھے سے ایک شخص نمودار ہوا جو پرانی سی بھوری شال میں لپٹا ہوا تھا۔ اس شال کے نیچے جنرل ضیا کو اپنے ملک کے پولیس والوں کی ٹوپی اور گن نظر آ رہی تھی۔

'سائیکل سے نیچے اترو، چاچا جی۔ کیا خیال ہے تمھارا، ہیڈ لائٹ کے بغیر تم جا کہاں رہے ہو؟'

پولیس کانسٹیبل جنرل کی سائیکل کے ہینڈل کو ایسے پکڑ لیتا ہے جیسے وہ پیڈل مار کر اسے بھگا لے جانے والا تھا۔ جنرل ضیا اپنے گرد کس کر بندھی ہوئی شال کے باعث لڑکھڑاتے ہوئے سائیکل سے نیچے اترا۔ اس کا سر اپنی ہی رعایا میں سے ایک شخص سے اس پہلی ملاقات پر تجسس اور مسرت سے سرشار ہوا جا رہا تھا جس میں اسے اس شخص سے علاحدہ کرنے کے لیے سیکیورٹی کا کوئی حصار تھا اور نہ اس شخص کی جانب کوئی بندوق نشانہ باندھے ہوئے تھی جس سے وہ بات کر رہا تھا۔

شاہ راہِ آئین کے فٹ پاتھ پر ایک تھکے ماندے بوڑھے پولیس کانسٹیبل کی چشمِ

نگراں تلے جنرل ضیا کو اس بات کا حقیقی مطلب پتا چلا جو اسے بوڑھے ڈریکولا نے کہی تھی۔ جنرل ضیا کو احساس ہوا کہ چاؤشسکو کی نصیحت میں ایک استعارہ بھی چھپا ہوا تھا جس کا مطلب اس ایڈونچر سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ جمہوریت کیا ہے؟ اس کی روح کیا ہے؟ آپ اپنے عوام سے طاقت حاصل کرتے ہیں اور یوں مزید طاقت ور ہو جاتے ہیں اور جنرل ضیا اس لمحے یہی کر رہا تھا۔ اسلام آباد کو گھیرے میں لینے والی خاموش پہاڑیوں کی نگاہوں تلے ایک بہت قدیم رسم انجام پا رہی تھی: ایک حاکم اور اس کی رعایا میں سے ایک شخص اپنے تعلقات کو پیچیدہ بنانے والی نوکر شاہی کے بغیر، اور اپنی ملاقات کو آلودہ کرنے والے بندوق برداروں کے بغیر، آمنے سامنے کھڑے تھے۔

'کان پکڑ لو۔' پولیس والے نے کہا، اور اس دوران اس نے اپنے کان کے پیچھے سے سگریٹ نکالا اور اپنی شال کے نیچے سے لائٹر نمودار کیا۔ اس نے سگریٹ جلایا تو اچانک فضا میں مٹی کا تیل جلنے کی بو پھیل گئی۔ جنرل ضیا نے فٹ پاتھ پر سائیکل کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن پولیس والے نے اسے ایک کِک لگائی اور سائیکل فٹ پاتھ پر لڑھکتی چلی گئی اور پھر دھم سے گر گئی۔

جنرل ضیا نے شال سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور اپنے کان پکڑ لیے۔ یہ گڈ گورننس کا ایک سبق تو تھا لیکن پُرلطف بھی ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ابھی سے اپنے دماغ میں ایک تقریر تیار کر رہا تھا: اس ملک کو چلانے کے لیے مجھے جتنی بصیرت چاہیے وہ میں نے اسلام آباد میں آدھی رات کو ایک خالی سڑک پر اپنی ڈیوٹی دینے والے اکیلے پولیس کانسٹیبل سے سیکھ لی۔۔۔

'ایسے نہیں۔' پولیس والے نے مایوسی سے اپنا سر ہلایا۔ 'مرغا۔ مرغا بنو۔ ککڑو۔'

جنرل ضیا نے سوچا کہ وقت آ گیا تھا کہ اسے اپنا تعارف کرا دے لیکن کانسٹیبل نے اسے اس کا چہرہ ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے شال سے ڈھکا ہوا اس کا سر پکڑا اور شال نیچے کر دی۔

'اب یہ بہانہ مت کرنا کہ تمھیں پتا ہی نہیں کیسے بنتے ہیں مرغا۔'

جنرل ضیا جانتا تھا کہ مرغا کیسے بنتے ہیں، لیکن آخری مرتبہ نصف صدی پہلے اسکول میں مرغا بنا تھا اور اس خیال نے اسے حیران کر دیا کہ لوگ اب بھی یہ بچگانہ سزا دیتے ہیں۔ اس کی کمر جھکنے سے انکار کر رہی تھی لیکن کانسٹیبل اس کا سر نیچے کو دباتا گیا جب تک کہ وہ اس کے گھٹنوں کو نہ چھو گیا؛ جنرل ضیا نے ہچکچاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگوں کے درمیان سے گزارے اور اپنے کانوں تک ہاتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اس کی کمر کنکریٹ کا کوئی بلاک بن چکی تھی اور جھک ہی نہیں رہی تھی، اس کے جسم کے بوجھ تلے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور اسے محسوس ہوا کہ وہ گر جائے گا اور لڑھکنی کھا جائے گا۔ کانسٹیبل نے جیسے ہی اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اس نے اوپر دیکھنے کی کوشش کی۔ کانسٹیبل نے ہاتھ کی جگہ اب اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ دیا۔ جنرل ضیا اپنا سر نیچے ہی جھکائے ہوئے بولا۔

'میں جنرل ضیاالحق ہوں۔'

دھواں کانسٹیبل کے حلق سے ٹکرایا اور اسے کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا جو بعد میں ہنسی کا دورہ ثابت ہوا۔

'کیا اس غریب قوم کے لیے ایک جنرل ضیا کافی نہیں ہے؟ کیا ہمیں اب بھی تم جیسے پاگلوں کی ضرورت ہے کہ وہ آدھی رات کو جنرل ضیا بنے گھومتے پھریں؟'

جنرل ضیا نے اپنے چہرے سے شال گھسیٹ کر ہٹائی، اس توقع میں کہ کانسٹیبل اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لے گا۔

'عالم پناہ۔' کانسٹیبل نے کہا، 'آپ تو بہت مصروف آدمی ہوں گے۔ آپ کو تو بہت جلدی ہوگی کہ واپس آرمی ہاؤس میں جا کر اس ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ مجھے ایک لطیفہ سناؤ تو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ کیا اپنی زندگی میں تمھیں اتنا رحم دل پولیس والا پہلے کبھی ملا ہے؟ چلو مجھے جنرل ضیا کے بارے میں کوئی لطیفہ سناؤ۔'

یہ تو آسان تھا، جنرل ضیا نے سوچا۔ اس نے اپنے بارے میں لطیفے سنا کر بہت سے صحافیوں کو تفریح پہنچائی تھی۔

اس نے اپنا گلا کھنکارا اور شروع کیا۔ 'خاتونِ اوّل نے اپنے بیڈ روم میں جنرل ضیا کو کیوں نہیں داخل ہونے دیا؟'

'ابے بکواس مت کرو،' کانسٹیبل نے کہا کہ۔ 'یہ لطیفہ تو سب کو آتا ہے۔ اور یہ تو لطیفہ ہے بھی نہیں۔ یہ تو شاید سچ ہے۔ چلو تین مرتبہ یہ کہہ دو کہ جنرل ضیا کانا دجال ہے، اور میں تمھیں جانے دوں گا۔'

جنرل ضیا نے یہ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ بھارتی پروپیگنڈا لگتا ہے، اس نے سوچا اور اس نے اپنی آنکھوں کے پپوٹے تین مرتبہ کھولے اور بند کیے تا کہ اس حکم کا پھر سے جائزہ لے لے: اس کی بائیں آنکھ نے پولیس والے کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کینوس کے جوتے دیکھے، اور اس کی دائیں آنکھ نے شاہ راہِ آئین پر مینڈک کے ایک بچے کا تعاقب کیا۔ لیکن اس کی کمر اسے مارے ڈالتی تھی، وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی سیدھی کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ہلکی سی آواز میں سرگوشی کی: 'جنرل ضیا ایک۔۔۔'

اس نے ایک فاصلے سے سائرن کی آواز بلند ہوتی سنی، وہی سائرن جو اس کے صدارتی قافلے کے بیرونی جانب کی گاڑیوں سے بجائے جاتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ جب وہ باہر اس ناہنجار پولیس والے سے باتیں کر رہا تھا تو اس دوران کسی اور نے آرمی ہاؤس پر قبضہ نہ کر لیا ہو۔

'مجھے لگتا ہے تمھارا دل نہیں لگ رہا۔ میں اس سڑک پر جسے بھی روکتا ہوں اس پر یہی چیز آزماتا ہوں اور قسم سے مجھے کسی نے مایوس نہیں کیا۔ یہ واحد سزا ہے جسے وہ سب پسند کرتے ہیں۔'

کانسٹیبل نے اس کی پیٹھ پر لات ماری، جنرل ضیا کی ریڑھ کی ہڈی تڑخ کر سیدھی ہوئی، درد کی لہریں اس کے سارے جسم میں دوڑ گئیں، اور وہ منھ کے بل زمین پر جا گرا۔

کانسٹیبل اسے گھسیٹتا ہوا جھاڑی کے پیچھے لے گیا۔

'اصلی والا کانا آ رہا ہے۔ پہلے میں اس سے نمٹ لوں۔ پھر ہماری لمبی بات چیت ہوگی،' کانسٹیبل نے اپنی شال اتارتے اور اسے جنرل ضیا پر پھینکتے ہوئے کہا۔

کانسٹیبل سڑک کے کنارے ہوشیار پوزیشن میں کھڑا رہا اور جب قافلہ چمکیلی روشنیوں اور روتے ہوئے سائرنوں کے ساتھ وہاں سے تیزی سے گزرا تو اس نے اسے سلیوٹ کیا۔ قافلے میں ایک سیاہ مرسیڈیز تھی جس کے پیچھے کھلی چھت والی دو جیپیں تھیں، جن میں الرٹ کمانڈوز کی ٹیمیں سوار تھیں جن کی بندوقیں سڑک کے کنارے کی جانب تھیں۔ جب کانسٹیبل جنرل ضیا سے اس کی رہائی کی بابت گفت و شنید دوبارہ شروع کرنے کے لیے واپس مڑا تو اس نے قافلے کو پوری رفتار سے پیچھے آتے ہوئے سنا؛ سائرن ہچکیاں لینے لگے اور اس روتے ہوئے بچے کی طرح خاموش ہو گئے جسے نیند آ گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ کانسٹیبل کے پاس یہ سمجھنے کا وقت ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، کمانڈوز اپنی کلاشنکوفوں اور سرچ لائٹس کے ساتھ اس کے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص نے، جو اب تک جیپ میں سوار تھا، سائیکل کی طرف اشارہ کیا اور پُرسکون آواز میں کہا، 'یہی ہے وہ سائیکل جو وہ لے کر گئے تھے۔'

آرمی ہاؤس کی جانب واپسی کے مختصر سفر میں جنرل ضیا مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر بیٹھا یہ تاثر دیتا رہا جیسے جنرل اختر وہاں موجود نہیں ہے۔ اس نے شال کس کر اپنے گرد باندھ لی اور کسی ایسے آدمی کی طرح سر نیہوڑائے بیٹھ گیا جو ابھی ابھی کسی بہت برے خواب کو دیکھ کر جاگا ہو۔

لیکن دل ہی دل میں اسے معلوم تھا کہ اسے کرنا کیا تھا۔ جنرل اختر نے اپنی ٹیپوں اور تمام تر جاسوسوں کے باوجود اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے ملک کے تیرہ کروڑ لوگ اس کے بارے میں حقیقتاً کیا سوچتے تھے۔ اس نے تو اسے سچائی کا دس فی صد بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے جنرل اختر کی جانب نہیں دیکھا لیکن کار میں پھیلی ہوئی بُو سے وہ بتا سکتا

تھا کہ وہ امریکی سفیر کی پارٹی میں وِسکی کی بوتلیں چڑھاتا رہا تھا۔ آگے کیا کرے گا وہ؟ سؤر کا گوشت کھائے گا؟ اپنے بھائی کا ماس کھائے گا؟

گاڑی سے اترتے ہوئے وہ پہلی مرتبہ گویا ہوا۔ 'پولیس والے کو چھوڑ دو۔' اس نے کہا، اس یقین کے ساتھ کہ کانسٹیبل کی عجیب و غریب کہانی پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ 'وہ صرف اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔'

جنرل ضیا سیدھا اپنی مطالعہ گاہ میں گیا، اپنے اسٹینوگرافر کو طلب کیا اور تعیناتی کے دو خطوط املا کرائے۔ پھر اس نے فون اُٹھایا اور ملٹری آپریشنز کے انچارج ایک لیفٹیننٹ جنرل کو کال کی۔ آدھی رات کے وقت اسے نیند سے اُٹھانے پر تا دیر اس سے معافیاں مانگنے کے بعد اس نے لیفٹیننٹ جنرل سے کہا کہ وہ جنرل اختر کی جگہ اپنے فرائض سنبھال لے۔

'میری خواہش ہے کہ آپ ابھی چارج لے لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مشکوک افراد کے بارے میں تمام فائلیں بذاتِ خود ملاحظہ کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ جنرل اختر جو تفتیشی مراکز چلاتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک کا آپ دورہ کریں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ واپس آ کر بہ راہِ راست مجھے رپورٹ کریں۔'

اس دوران جب جنرل بیگ جنرل اختر سے چارج لینے کے لیے نکل رہا تھا، جنرل ضیا نے رات کی آخری ٹیلی فون کال کی۔

'جی، سر۔' جنرل اختر جاگ رہا تھا اور جنرل ضیا کی جانب سے شکریے کی ایک کال کا انتظار کر رہا تھا۔

'شکریہ، اختر۔' جنرل ضیا نے کہا۔ 'میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ تم نے میری جان بچائی ہو۔'

'یہ میرا فرض تھا، سر۔'

'میں نے تمھیں پروموٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فور اسٹار۔'

جنرل اختر جو کچھ سن رہا تھا اس پر اسے یقین نہیں آیا۔ کیا جنرل ضیا بڑی فوج کے

سربراہ کی حیثیت سے اپنا عہدہ چھوڑ دے گا؟ کیا جنرل ضیا ریٹائر ہو رہا تھا اور مکہ جا رہا تھا؟ جنرل اختر کو مزید جاننے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ 'میں نے آپ کو جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا چیئرمین تعینات کر دیا ہے۔ یوں ایک طریقے سے میں نے تمھیں اپنا بھی باس بنا دیا ہے۔۔۔'

جنرل اختر نے ملتجیانہ آواز میں مداخلت کی کوشش کی۔ 'سر، ایجنسی میں میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ امریکی ہماری پیٹھ پیچھے روسیوں سے باتیں کر رہے ہیں۔۔۔'

بیوروکریٹک فراغت کی ایک شان دار زندگی اس کی آنکھوں میں پھر کر رہ گئی۔ اس کے تین ایڈجوٹنٹ ہوں گے، فضائیہ، بحری اور بڑی فوج میں سے ایک ایک، لیکن اسے ان تینوں اداروں میں سے کسی پر بھی اختیار نہیں ہوگا۔ اس کا اپنا پرچم بردار کانوائے ہوگا لیکن اسے بڑی فوج کے افسران کے لیے ایک اور ہاؤسنگ اسکیم کا افتتاح کرنے کے علاوہ کہیں اور جانا نہیں ہوگا۔ اسے تیسری دنیا کے ہر ملک کے ہر دوسرے درجے کے معزز مہمان کے لیے ہر دوسرے دن کھڑی کی جانے والی استقبالی قطار میں سب سے آگے کھڑا ہونا ہوگا۔ اپنی خفیہ ایجنسی چلانے کے بجائے اسے ایک ایسے ادارے کی سربراہی کرتے ہوئے بیٹھنا ہوگا جو اتنا ہی اعزازی تھا جتنی کسی لڑتے ہوئے مرغ کی کلغی۔

'یہ زندگی ہے، اختر، کام چلتا رہے گا۔ میں نے فی الحال جنرل بیگ کو چارج سنبھالنے کے لیے کہہ دیا ہے۔'

'میں گزارش کروں گا کہ ہینڈ اوور ذرا طریقے سے ہو جائے۔۔۔' جنرل اختر نے اپنے سیف ہاؤسز، اپنی ٹیپس، اپنے جاسوسوں کے جال پر ہاتھ جمائے رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔ ہر وہ شے جو اسے طاقت دیتی تھی اب اس سے لی جا رہی تھی اور اسے ایک پنجرے کے پیچھے کھڑا کیا جا رہا تھا، ایک سنہری پنجرا، لیکن بہرحال ایک پنجرا۔

'آپ نے اسے کمایا ہے، اختر۔' جنرل ضیا نے کہا۔ 'آپ نے صحیح معنوں میں اپنا چوتھا اسٹار کمایا ہے۔'

۲۷

قلعے کے دروازے کھلتے ہیں، اور ہمیں لے جانے والی جیپ سیکیورٹی کے حصاروں کے درمیان سے گزرتی چلی جاتی ہے، سلیوٹ پیش اور قبول کیے جاتے ہیں۔ جب ڈرائیور ریڈیو لگانے کے لیے میری اجازت طلب کرتا ہے تبھی مجھ پر اپنی نئی زندگی کے حقائق منکشف ہوتے ہیں: اب میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہوئی، نہ ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، ہم آزاد ہیں اور اکیڈمی میں پھر سے رپورٹ کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک ہفتے کی چھٹی کا اجازت نامہ ہے۔ اگر 'عقابوں کا نشیمن' کا اختتام یہی ہوتا تو ہم اپنی نشستوں پر لیٹے ہوئے ہوتے، ہم نے سگار سلگائے ہوئے ہوتے اور ہم کسی سنے سنائے نازی لطیفے پر قہقہے لگا رہے ہوتے۔ لیکن ہم خاموش ہیں؛ ناکام قاتلوں کی ایک جوڑی، جسے اسی شخص نے معاف کر دیا جسے ہم ہدف بنانے چلے تھے۔ معمولی بھگوڑے، یا کچھ بچے جنھیں ڈانٹ پلا کر گھر بھیج دیا گیا تھا؛ جنھیں قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہونے کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔

ہمارے چہرے اگلا سنگِ میل دیکھنے کے لیے، بہت زیادہ گرم ہو چکے ہوئے رکشوں کے ایگزاسٹ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کا جائزہ لینے کے لیے، اور شناخت کے قابل چیزوں کو دیکھنے کے لیے جیپ کی کھڑکیوں کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ دنیا کو ہم ان بچوں کی طرح دیکھ رہے ہیں جو پہلی مرتبہ دیہی علاقوں کے سفر کو نکلے ہوں؛ خاکی کور والی نشست ہماری

اجتماعی خام خیالیوں کی طویل فہرست کی طرح ہمارے درمیاں پھیلی ہوئی ہے۔

کیا تمھیں کچھ درد تو نہیں ہو رہا؟ گفتگو کی شروعات کے لیے میری کوشش کم زور لیکن برجستہ ہے۔ میں بولتے ہوئے بھی باہر دیکھ رہا ہوں۔ جنرل ضیا کی تصویر والا ایک بل بورڈ ہمیں ایک محفوظ سفر کی دعا دیتا ہے۔

نہیں، کیا تمھیں؟ جیب میں مچھر مار اسپرے اور برنول نامی جلنے سے بچاؤ کے تیل کی بو پھیلی ہوئی ہے جو انھوں نے عُبید کے سر پر لگایا تھا۔

ہماری رہائی کی صبح قلعہ حرکت و عمل کے ایک دورے کی طرح بیدار ہوا تھا۔ مالیوں کی ایک ٹیم اپنے جھاڑوؤں کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی، مسلح کمانڈو شیش محل کی چھتوں پر پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ ایک سہ ستارہ جرنیل کا کارواں پھیلے ہوئے لان کے درمیان واقع صحن میں بریک لگا کر رک گیا تھا۔

ہمارے نجات دہندہ نے رے بین کا چشمہ پہنا ہوا ہے اور جب ہم اس کے سامنے آتے ہیں تو وہ اسے چہرے سے نہیں ہٹاتا۔ میجر کیانی اور اس کے اصلاح شدہ غنڈے کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ جنرل بیگ ایک ایسے شخص کی طرح بات کرتا ہے جسے قدرت نے میک اوور کرنے کے لیے منتخب کیا ہو۔ اس کے ہاں ہر شے تاب دار، نئی اور استری شدہ ہے؛ اس کے بے صبر ہاتھ نئی شروعات کی پکار ہیں۔

'میرا جہاز انتظار کر رہا ہے۔' وہ ایک کرنل سے کہتا ہے جو اس جگہ کا نیا انچارج لگتا ہے، اور جس کے سینے پر اتنے میڈل ہیں جتنے بظاہر اس کے دماغ میں خلیے بھی نہیں ہیں۔ 'یہ جگہ بری طرح بد انتظامی کا شکار ہے۔' جنرل بیگ کہتا ہے اور اس کا یہ بیان ہمارے لیے نہیں بلکہ قوم کی مجموعی حالت کا ایک اعلان ہے۔ 'تم'، وہ کرنل کے سینے کی جانب اپنی انگلی بڑھاتا ہے۔ جنرل بیگ نے ظاہر ہے ایسی بہت سی فلمیں دیکھ رکھی ہیں جن میں بیس بال کا کوچ بالآخر شیطان بن جاتا ہے۔ تم یہاں کی صفائی کرو گے۔ ساری جگہ کی صفائی کرو۔ کسی ماہرِ تعمیرات کو بلاؤ کہ وہ اس جگہ کو پھر سے ڈیزائن کرے۔ ضرورت پڑے تو کسی انٹیرئر ڈیکوریٹر کو بلاؤ۔ اس جگہ کی اور ہی فضا کی ضرورت ہے۔ کم از کم یہاں کے کچھ مقامات کو سیاحوں کے لیے ہی کھول دو۔ ایک تفتیشی مرکز چلانے کے لیے آخر تمھیں سارے کے سارے قلعے کی ضرورت کیوں ہے؟ کرنل کسی ایسے اپرنٹس سیکرٹری کی طرح نوٹس لیتا ہے جسے مستقل نوکری کی شدت سے ضرورت ہو۔ جنرل بیگ ہماری طرف مڑتا ہے۔

'تم لڑکے ہمارا مستقبل ہو۔ تم بہتر سلوک کے مستحق ہو۔ تم لڑکے کچھ نااہل بے وقوفوں کے طفیل یہاں تک پہنچے۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے، سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ کتنا وقت ضائع ہو گیا۔ آج مجھے تین چھاؤنیوں کا دورہ کرنا ہے۔ ہوائی اڈے پر میرا ذاتی جہاز میرا منتظر ہے اور دن میں گھنٹے کتنے کم ہوتے ہیں۔ چیف صاحب نے تمھارے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ میں وہ والی فائلیں بند کرا دوں گا۔ واپس جاؤ اور محنت سے کام کرو۔ کل کی جنگیں آج کی ڈرل پریکٹس سے ہی جیتی جا سکتی ہیں۔ ملک کو تمھاری ضرورت ہے۔'

ہاں بالکل اسی طرح۔ ملک کو اچانک ہماری ضرورت آن پڑی ہے۔

ہماری جیپ کا ڈرائیور وردی میں ملبوس ایک سپاہی ہے اور ہماری منزل جاننا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ 'آپ آج کہاں جانا چاہیں گے، سر؟' جب تین ستارہ کا نوحہ روتے ہوئے سائرن اور چھتوں سے پھلانگتے ہوئے کمانڈوز کی چکاچوند میں رخصت ہوتا ہے تو وہ ہم سے پوچھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنرل بیگ اپنے جہاز سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہنا چاہتا۔

اب یہاں زیرِ زمین جیلوں، تاریک تہ خانوں، خون کے چھینٹوں سے بھری ہوئی چھتوں، بدبودار غسل خانوں میں لکھی ہوئی شاعری کی کوئی علامات نہیں ہیں۔ اب یہاں صرف ابھی ابھی پانی سے سیراب کی ہوئی گھاس اور ایک نیا ورق موڑتی ہوئی تاریخ کی خوش بو ہے۔

'یہاں سے باہر' میں بتاتا ہوں۔

• • •

عُبید اپنی کھڑکی کے شیشے کے ساتھ جڑا بیٹھا ہے۔ اس کے نتھنے بہہ رہے ہیں اور وہ اپنے ترخے ہوئے ہونٹ چبا رہا ہے؛ وہ ظاہر ہے کہ برنول کی اس بو کو پسند نہیں کرتا جو جیپ میں پوری طرح پھیلی ہوئی ہے۔ میں اپنے بیگ میں ٹٹول کر پوائزن نامی پرفیوم کی بوتل نکالتا ہوں اور اسے پیش کرتا ہوں۔ وہ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے اور بوتل کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس پر ایسے ہاتھ پھیرتا ہے جیسے وہ کوئی ٹینس کی گیند ہو جسے میں نے صورتِ حال سے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے نکالا ہو۔

ہم ایک ایسے جوڑے کی طرح ہیں جسے یاد نہیں کہ وہ آخر ایک دوسرے سے جڑے ہی کیوں تھے۔

'بینن۔' وہ بڑبڑاتا ہے۔ 'کیا تمھیں لگتا ہے کہ انھوں نے اسے پکڑ لیا؟'

'تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟' میں اسے گھورتا ہوں لیکن پھر خود پر قابو پا لیتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے نرم خو اور مؤدب اور سمجھ دار ہونا چاہیے۔ ایک ہاکر ہماری طرف اخبار لہراتا ہے، جنرل ضیا کی ایک اور تصویر ہماری جانب گھورتی ہے۔ 'سفارتی استثنیٰ۔ وہ لوگ اسے کبھی بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔'

'کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ابھی تک اکیڈمی میں ہی ہوگا؟ اس سب کے بعد بھی؟'

'ایک امریکی کے لیے ہر وقت کوئی اور کام موجود ہوتا ہے۔ میں اس کے بارے میں پریشان نہیں ہوں گا۔'

'یہ منصوبہ اسی کا تھا۔' عُبید کہتا ہے، جیسے کہ ہم بارش کے ایک دن کسی منسوخ کر دی گئی پکنک سے واپس آ رہے ہوں اور محکمۂ موسمیات کے کسی اہل کار پر الزام دھر رہے ہوں۔

'یہ خیال گھساپٹا تھا۔' اس کے آہستہ رو اور نپے تلے جملوں پر میرا غصہ بالآخر میرے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ میں اپنا ماتھا شیشے والی کھڑکی پر رکھتا ہوں اور ایک بس کے پیچھے لٹکے ہوئے لوگوں کو گھورنے لگتا ہوں۔ ایک نوجوان مجھے جعلی سلیوٹ پیش کرتا ہے، اس کے ساتھ لٹکا ہوا شخص اپنے عضو کو پکڑتا ہے اور میری ماں سے مُجامعت کی پیش کش کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستانی لوگ وردی والوں کے بارے میں اتنے جذباتی کیوں ہیں۔

موٹی بھارتی بہنوں میں سے ایک جیپ کے کیسٹ پلیئر پر اپنا ایک اداس محبت بھرا گیت گا رہی ہے۔

'مجھے یہ گیت پسند ہے۔' میں ڈرائیور پر چلّاتا ہوں۔ 'کیا تم اس کی آواز اونچی کر سکتے ہو؟' ڈرائیور بات مانتا ہے۔

'ہم زندہ ہیں۔' عُبید کہتا ہے۔ میں مڑتا ہوں اور اس کے سر کو دیکھتا ہوں جو پہلے پیٹ سے لپا ہوا ہے۔ وہ ایسی حالت میں نہیں کہ میں اس سے اس موضوع پر بحث کرنے کی خواہش کروں کہ زندہ رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

'جنرل ضیا بھی تو زندہ ہے۔' میں کہتا ہوں۔

لیکن سیکرٹری جنرل مر چکا ہے۔

'وہ شخص جو تم سے تمھارے والد کے بارے میں پوچھ رہا تھا، کون تھا وہ؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟' عُبید کا تجسّس عمومی نوعیّت کا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ جیل میں میرا وقت تو ٹھیک سے گزرا نا، کھانا ٹھیک تو تھا، اور وہاں بات کرنے کے لیے دلچسپ لوگ تو موجود تھے نا۔

'کیا تم نے کُل پاکستان انجمنِ جمعداراں کا سنا ہے؟'

عُبید مجھے گھور کر دیکھتا ہے جیسے میں نے قید میں اپنے قلیل وقت کے دوران یونانی زبان سیکھ لی ہو۔ 'وہ سیکرٹری جنرل تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ اور وہ شاید یہ

سوچتے ہوئے مر گیا کہ اسے میں نے مروا دیا۔ وہ شاید یہ سوچتے ہوئے مر گیا کہ میں کوئی حرامی جاسوس تھا جسے فوج نے اس تہ خانے میں بھیجا تھا۔'

'اس نے تمھیں اس وقت کیوں نہیں پہچانا؟ میرا مطلب ہے جب تم اس کے پڑوسی تھے۔'

'یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کی اب اہمیت بھی نہیں رہ گئی۔' میں سیٹ کے اوپر سے اپنا ہاتھ لے جا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔

'اچھا۔' عُبید کہتا ہے، اس کے ہونٹ مسکراہٹ کا پہلا اشارہ دیتے ہیں۔ 'میرے بارے میں اتنے حساس نہ بنو۔ تم وہ شگری نہیں جسے میں جانتا تھا۔ یا کیا وہ تھوڑے ہی دنوں میں تمھیں تبدیل کرنے میں کام یاب ہو گئے؟'

میں ان حالات میں اسے اپنی زندگی تبدیل کرنے والے تجربات بالکل نہیں بتانا چاہتا جب مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مرے ہوئے لوگوں میں سے کیسے واپس آیا۔

'تم کہاں تک پہنچ سکے تھے؟'

'اڑ ہی نہیں سکا۔'

'حرام زادے۔' میں کہتا ہوں۔

'وہ وہیں تھے۔ اس سے بھی پہلے کہ میں رن وے تک پہنچ پاتا۔'

'میجر کیانی؟' میں پوچھتا ہوں اور مجھے فوری طور پر اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے۔

'وہ تو ہوگا۔ تمھارا کیا خیال ہے اسے کیسے معلوم ہوا؟'

'میں نے اس بارے میں سوچا ہے۔ میں جانتا تھا تم سوچو گے کہ وہ بینن تھا جس نے انھیں بتایا، مگر وہ کیوں بتائے گا؟ وہی تو تھا جس نے مجھے یہ خیال پیش کیا تھا۔ اور وہ صرف ایک ڈرل انسٹرکٹر ہی تو ہے۔'

'ہے تو وہ ایک ڈرل انسٹرکٹر لیکن اسے خیالات بڑے بڑے آتے ہیں، ہے نا؟' بے بی او سمجھتا ہے کہ زندگی بہت سے خوب صورت اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ اس

شاعری کی طرح جس کا وہ مطالعہ کرتا ہے، جہاں ادھر ادھر کے جذبات اور تشبیہات ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے غروبِ آفتاب کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں جبکہ سبب اور مسبب نومولود حرامی جڑواں بچوں کی طرح دہلیز پر سست رفتار موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ کاش میں اسے کرنل شگری کی باہر نکلی ہوئی مردہ آنکھوں سے دنیا دکھا سکتا۔

'دیکھو، علی۔' جب عُبید میرا پہلا نام لیتا ہے تو وہ عام طور پر مجھے زندگی کے معانی سے متعلق کوئی لیکچر دینے والا ہوتا ہے، مگر اس بار اس کے لہجے میں وہ شدت نہیں ہے جو اس کے لیکچر کو نظر انداز کرنے پر ایسی مسرت دیا کرتی تھی۔ اس کی آواز کسی خالی سیپی میں سے آ رہی ہے۔ 'میں نے وہ سب کرنے کی کوشش اس لیے کی، کیوں کہ میں تمھیں تمھاری تلوار اسے گھونپتے اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے تمھیں اس کے محافظوں کے ہاتھوں گولیاں کھاتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ڈر رہا تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔'

'تم نے میری گاف بچانے کے لیے یہ سب کیا؟ تم نے سمجھا کہ تم ایک چوری شدہ جہاز میں اڑ جاؤ گے، آرمی ہاؤس کا رخ کرو گے اور وہ سب آرام سے بیٹھ کر تمھاری پیش رفت دیکھتے رہیں گے؟ کیا تمھیں آئیڈیا بھی ہے کہ اس حرام پائی کے محل میں کتنی اَیک اَیک گنیں نصب ہیں؟ وہ تو شاید وہاں بھولے سے آ جانے والے کوّے تک مار ڈالتے ہیں۔' میں اپنے موقف پر زور دینے کے لیے اس کا ہاتھ دباتا ہوں۔

عُبید کپکپا اُٹھتا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکلتی ہے اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تکلیف میں ہے۔ اُن (لعنتیوں) نے ظاہر ہے اسے کسی وی آئی پی سیل میں نہیں رکھا تھا۔

'تم میری بات اب تک نہیں سُن رہے، شگری۔ میں کوئی کامی کیز نہیں ہوں۔ تمھیں اپنے دوستوں سے ایسی ہی توقُعات ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں وہ سب کچھ تمھاری خاطر کرنے جا رہا تھا؟ سوری، میں انھیں صرف بھٹکا رہا تھا۔ میں نے تمھارا کال سائن استعمال کیا، تاکہ تم اپنے بے وقوفانہ پلان پر عمل نہ کر سکو۔ تلوار، خدا کے لیے یار۔ ایک تلوار؟

میں اس کا ہاتھ پھر سے دباتا ہوں۔ وہ زور سے آہ بھرتا ہے۔ پٹی پھسل جاتی ہے۔ اس کا انگوٹھا خشک لہو سے بھرا ہوا ہے اور اس کا ناخن غائب ہے۔

عُبید اپنی وضاحت جاری رکھنا چاہتا ہے، حالانکہ میں حقائق کے لیے اپنی اشتہا کھو چکا ہوں۔

'میں کہیں نہیں جا رہا تھا۔ میں صرف تمھاری جان بچانا چاہتا تھا اور بینن کی بھی یہی مرضی تھی۔'

'مجھے اس ڈبل ڈیلنگ کرنے والے امریکی کے بارے میں تمھیں تنبیہ کر دینی چاہیے تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے میری بجائے اُس خر دماغ پر کیسے یقین کر لیا۔'

'ہمارا منصوبہ کافی حد تک ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے ایک ایسے جہاز کو لے کر اڑ جانا تھا جس کی مجھے اجازت نہیں تھی، اس کے بعد وہاں سیکیورٹی الرٹ ہو جاتا اور صدر کی انسپکشن منسوخ ہو جاتی۔ اور پھر میں کم از کم تم سے بات کر سکتا تھا۔ میرے پاس کم از کم اتنا وقت تو آ ہی جاتا کہ میں تمھاری کھوپڑی میں عقل گھسا سکتا۔'

اس حرام پائی کا شکریہ۔ ایک آدمی کا سادہ سا منصوبہ آپ کے زندگی بھر کے کام کو تباہ کر ڈالتا ہے اور پھر بھی آپ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ آپ اس کا شکریہ ادا کریں۔

'اسے ایک اور انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کاکے او۔ تم نے ایک دوست کو دھوکے میں رکھا، تم خود تقریباً مارے ہی گئے اور تم نے یہ سب کچھ جنرل ضیا کی زندگی بچانے کے لیے کیا۔'

'نہیں۔ تمھاری۔' وہ اپنی آنکھیں موند لیتا ہے۔ میں اسے انکل سارچی کے شہد کے بارے میں بتانے کا سوچتا ہوں، یا پھر اپنے پلان کے شاعرانہ عوامل کے بارے میں؛ شاید مجھے اسے یہ بتانا چاہیے تھا کہ عظمِ فولاد کا مطلب کیا ہے، لیکن اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

میں وہ لفافہ نکالتا ہوں جو اندھی عورت نے مجھے دیا ہے اور اس کے سر پر اس سے

پنکھا جھلنے لگتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ محسوس کیسا ہوتا ہے، لیکن اگر آپ کی جلد کو فلپس کی استری سے جلایا گیا ہو تو تکلیف تو ہوتی ہوگی۔

'میری زندگی بچانے کا شکریہ۔'

'تم کیا سمجھتے ہو میرے بال دوبارا اُگ آئیں گے؟' عُبید پوچھتا ہے۔

اب دوسری موٹی بھارتی بہن ایک نیا گیت گانا شروع کر چکی ہے۔ وہ گانا کسی ایسی گفتگو کے بارے میں ہے جو اتنی دیر سے چل رہی ہے کہ فسانہ بن گئی ہے۔ وہ لفافہ کُل پاکستان مینگو فارمرز کوآپریٹو کے نام بھیجا گیا ہے۔ غالباً سیکرٹری جنرل صاحب نے اپنے پیچھے رہ جانے والے ہم راہیوں کے نام اپنا آخری خطبہ بھیجا ہے۔

'تو تم نے اپنے بیان میں کیا لکھا۔۔۔؟' ہم دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی سوال منہ سے اگلتے ہیں، ایک ہی الفاظ میں۔ ہمارے سوال ہوا کے درمیان آپس میں ٹکراتے ہیں اور ان کا جواب جیپ پر ایسے گھسٹنے لگتا ہے جیسے کوئی کیڑا اپنا پر توڑ بیٹھنے کے بعد اڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

جب تمھاری زندگی کا واحد مشن ناکام ہو جائے تو تم کیا کرتے ہو؟

تم واپس اسی جگہ جاتے ہو جہاں سے یہ سب شروع ہوا تھا۔

'کیا تم کبھی شگری پہاڑی پر گئے ہو؟' میں ڈرائیور کے کاندھے کو تھپکی دیتے ہوئے پوچھتا ہوں۔ 'نہیں؟ تو چلو اس سڑک سے نکلنے کا اگلا راستہ پکڑ لو۔ میں تمھیں ہدایات دیتا چلوں گا۔ اگر درمیان میں کوئی ڈاک خانہ آ جائے تو رک جانا۔ مجھے ایک خط بھیجنا ہے۔'

میں عُبید کی جانب مڑتا ہوں۔ 'آشا یا لتا؟'

'لتا۔' وہ کہتا ہے۔ 'پرانی والی لتا، اداس والی۔'

آؤ تمھیں گھر لے چلیں بے بی او۔

۲۸

شگری پہاڑ دھند کا چغا اوڑھے ہوئے ہے۔ جب جیپ ہمیں ایک تنگ راستے کے آغاز پر اتار دیتی ہے، جو ایک گھر کو جاتا ہے تو ہم کپکپاتے ہیں۔ یہ جولائی کا مہینہ ہے اور میدانی علاقے اللہ میاں کے فرائی پان بن چکے ہیں لیکن پہاڑ پر ہوا مہین اور سرد ہے۔ جیسا کہ کرنل شگری کہا کرتے تھے، یہ ہوا اب بھی سائبیریا سے کبھی کبھار کوئی پیغام لے آتی ہے۔ شگری پہاڑ چاہے پاکستان کا حصّہ ہو لیکن اس کا موسم ہمیشہ سے باغی رہا ہے؛ اس نے کبھی بھی میدانی علاقوں کی موسمیاتی تقدیر میں شراکت نہیں کی۔ پہاڑ کے اردگرد ہمالیہ کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کے ٹو پہاڑ ان تمام پہاڑوں پر ایک سفید بالوں والی اداس ماتا کی طرح نگراں ہے۔ شفّاف سرمئی بادل نیچے وادی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ ہم گھر کو جانے کے لیے راستہ بناتے ہیں تو بادام کے بوڑھے درخت ہمارے کاندھوں سے کاندھے ٹکراتے ہیں۔ گھر کو جاتی سیدھی اونچائی پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے عُبید کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ 'تم لوگ یہاں سڑک کیوں نہیں بناتے؟' وہ اپنا سانس درست کرنے کے لیے بادام کے ایک درخت کے دبلے پتلے تنے کے سہارے کھڑا ہو کر پوچھتا ہے۔ 'اس کا ٹائم ہی نہیں ملا۔' میں اس کا ہاتھ پکڑتے اور آگے بڑھتے ہوئے کہتا ہوں۔

ہم بادام کے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہوئے ایک ترچھا موڑ مُڑتے ہیں اور

لو جی، لکڑی کا ایک گھر جس پر گرمائی محل کا گمان ہوتا ہے، ایک گھر جس میں کوئی نہیں رہتا ہمارے سامنے آ رہتا ہے۔ لکڑی کی قوسوں پر ڈھلواں سطح کے چھت پڑے ہیں، مکان کے ایک طرف لکڑی کی ایک طویل بالکونی وادی کا سامنا کرتی ہے۔ کئی دہائیوں سے مکان کو نظرانداز کیے جانے کے سبب لیموں کی سی ہری رنگت کا پینٹ کئی کئی بار اکھڑ چکا ہے اور اب پینٹ کی جگہ کچھ فیروزی رنگ کے خوف ناک دھبے ہی بچے ہیں۔ مکان پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور ایک فاصلے سے ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی نے چوٹی پر کوئی گڑیا گھر بنایا ہو اور اس سے کھیلنا بھول گیا ہو۔ اسے ذرا قریب سے دیکھیے تو یہ بہ یک وقت اُداس اور عالی شان لگتا ہے، جو یہاں تنہائی میں ایسے کھڑا ہے جیسے نیچے موجود دنیا کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہو۔

عُبید، جو اس سے پہلے اپنی زندگی میں کسی پہاڑی مقام پر کبھی نہیں آیا، قریب سے گزرتے ایک بادل کو گھونسا مارتا ہے اور جب اس کا ہاتھ ذرا سا نم ہوتا ہے تو دانت نکال کر ہنسنے لگتا ہے۔

اس کے سر پر برنول خشک ہو چکا ہے اور اس کی کھوپڑی کا جلا ہوا حصّہ اپنی دراڑوں میں سے کوبالٹ کے سے نیلے رنگ کا دِکھتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اس کے زخم بھرنے کے عمل کی نشانی ہے یا کسی انفیکشن کی ابتدا کی۔ مکان کے اندر، ایک شان دار تباہی کے آثار ہیں جیسے یہاں بچے نان اسٹاپ پارٹی کرتے رہے ہوں۔ قالین لپیٹے اور اِدھر اُدھر پھینکے ہوئے پڑے ہیں، فرش کے تختے اُکھاڑ کر غیر ماہرانہ طریقے سے پھر سے جوڑے ہوئے ہیں۔ ہم الماریوں سے کھینچ کر نکالے اور پھر راہ داریوں میں پھینکے ہوئے کپڑوں کی ڈھیریوں کے درمیان سے گزرتے ہیں۔

ان ملعونوں نے اس جگہ کو اس کے مالکان کے جانے کے بعد بھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ واحد چیز جس کا مجھے یقین ہے یہ تھی کہ وہ جو چیز ڈھونڈنے آئے تھے وہ انھیں ملی نہیں۔

مرکزی لونگ روم میں شیشے کی وال ٹو وال کھڑکی ہے جو پردوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ میں پردے کھولتا ہوں اور عُبید کو اس نظارے پر اپنا دم سادھے ہوئے محسوس کرتا

ہوں جو اسے شیشے کے پار نظر آتا ہے۔ کھڑکی چوٹی کے کنارے پر کھلتی ہے اور یہاں سے پہاڑی دور گہرائیوں میں گرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہم ایک سرسبز و شاداب وادی کے عمیق پیالے کے کنارے پر کھڑے ہیں جس کے درمیان سے سنہری سانپ جیسا ایک دریا سرسراتا ہے۔

'یہ محل کس نے بنایا؟'

'مجھے نہیں معلوم، میرے دادا کے والد نے شاید۔ یہ ہمیشہ سے یہاں تھا۔'

'یہ شرم ناک ہے کہ تم اپنے خاندان کی تاریخ میں دلچسپی نہیں رکھتے۔' عُبید کہتا ہے۔ پھر شاید اسے میرے خاندان کی تاریخ یاد آ جاتی ہے اور وہ میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کرتا۔ 'یہ بالکل اس دنیا سے ماورا کوئی شے ہے۔' وہ شیشے کی جانب اپنا ناک کیے کھڑا رہتا ہے۔

ہم انگیٹھی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور کھڑکی سے باہر ستاروں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ بہت نیچے لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بہت چمک دار جلتے ہیں۔ پہاڑیاں ایسے دیوزادوں کی طرح پڑی سوتی ہیں جو اپنا راستہ بھول بیٹھے ہوں۔

'یہاں کی رات بہت مختلف ہوتی ہے۔' عُبید کہتا ہے۔

'میں جانتا ہوں۔ بہت خاموش۔ ٹریفک بھی نہیں۔'

'نہیں۔ یہ اچانک ہی آ جاتی ہے۔ پھر بڑی سست رفتاری سے چلتی ہے۔ یہ کسی کشتی کی طرح ہے جو وادی کے آر پار چلتی ہو۔ سنو، تم اسے چلتے ہوئے سن سکتے ہو، تم اسے چپّو چلاتے ہوئے سن سکتے ہو۔ ذرا سنو تو پانی کے نرم چھپاکے۔۔۔'

'یہ نیچے وادی میں دریا ہے۔ یہ رات کو سوتا نہیں۔ لیکن مجھے نیند آ رہی ہے۔' میں کہتا ہوں۔

دن ایسے چڑھتا ہے جیسے کوئی آپ کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں تھپکی دے رہا

ہو۔ سورج برف سے ڈھکی چوٹیوں سے چھپن چھپائی کھیل رہا ہے؛ ایک لمحے ایک سنہری طشت اپنی ہی سفید آگ میں جلتا دکھائی دیتا ہے، تو دوسرے ہی لمحے بادل کے سیاہ مرغولے میں چھپا نظر آتا ہے۔

عُبید کھڑکی کے سامنے کھڑا ایک بادل پر غور وخوض کرتا ہے جو شیشے کو دھیرے سے سہلا رہا ہے۔ 'کیا میں اسے اندر آنے دے سکتا ہوں؟ کیا میں؟' عُبید مجھ سے پوچھتا ہے جیسے مجھ سے میرا پسندیدہ کھلونا مانگ رہا ہو۔

'ہاں بلا لو۔'

وہ کھڑکی کی چٹخنیوں کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے۔ جب تک وہ کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے، بادل ایک مرغولے میں تحلیل ہو چکتا ہے، جس کے پیچھے ایک پیاری سی دھند رہ جاتی ہے۔

'ہمیں آج کیا پکانا چاہیے؟' عُبید کچن میں سے چلّاتا ہے۔ مجھے تو یہ دھیان ہی نہ آتا لیکن عُبید نے ہمارے یہاں آتے ہوئے راستے سے ایک مہینے کا سودا خرید لیا ہے۔

کرنل شگری میرے خوابوں سے دور رہتے ہیں۔ عُبید مجھ سے ان کی اس مکان میں آخری رات کے بارے میں نہیں پوچھتا۔ وہ نہیں پوچھتا کہ میں نے انھیں کہاں اور کیسے پایا۔ میرا خیال ہے وہ جانتا ہے۔

مطالعہ گاہ کا تالا کھولا جا چکا ہے لیکن میں اس سے دور ہی رہتا ہوں۔ عُبید تصویریں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ تمام تصویریں دیواروں پر موجود ہیں، سب ایک دوسرے میں ملی ہوئی، کسی ترتیب کے بغیر، جیسے کرنل شگری کے کیریئر نے اسی بے ترتیبی سے پیش رفت کی ہو: جنرل اختر اور کرنل شگری افغان مجاہدین کمانڈروں کے نرغے میں کھڑے ہیں جنھوں نے اپنے کاندھوں پر شالیں اور راکٹ لانچر اوڑھ رکھے ہیں؛ کرنل شگری اپنی باریش آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ جو سول کپڑوں میں ملبوس ہیں اور جنھوں نے ایک سوویت ہیلے کاپٹر کے ملبے کے ٹکڑے ٹرافیوں کی طرح اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے ہیں؛ کرنل شگری بل کیسی کے ساتھ، جس میں بل کیسی کا بازو ان کے کاندھے پر پھیلا ہوا ہے، اور وہ دونوں درّۂ خیبر کے

پار دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس سے پہلے کی تصویریں: ان کے ساتھی افسران دبلے پتلے ہیں، ان کی مونچھیں ترشی ہوئی ہیں، تمغے بہت کم ہیں اور چہروں پر داڑھی بھی دکھائی نہیں دے رہی۔

'یونی فارم میں آپ کا کامریڈ کبھی بھی مر سکتا ہے جسے آپ کو ایک روز ڈھونا ہوتا ہے۔' کرنل شگری نے خود کو چھت کے پنکھے سے لٹکا ہوا پایا جانے سے بارہ گھنٹے پہلے اپنی وِسکی کا آہستگی سے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے ایک اور سفر سے واپس آئے تھے اور ان کے پاس تابوت کے سائز کا ایک سیمسونائٹ سوٹ کیس تھا اور وہ مجھے فوجیوں کے گرتے ہوئے فٹنس معیار کی مدد سے پاکستانی فوج کی تاریخ پڑھا رہے تھے۔ 'اپنے ساتھی سپاہیوں پر آپ کا ادھار یہ ہے کہ آپ فٹ رہیں کیوں کہ ایک دن لڑائی میں آپ کو زخمی ہونا ہے اور کسی نہ کسی کو آپ کو اپنی پیٹھ پر ڈھونا ہے۔ یہی ہے وہ قرض جو ایک سپاہی دوسرے سپاہی پر رکھتا ہے؛ اپنے بنکر تک واپس اُٹھا کر لیے جانے کا وقار، چاہے آپ مرنے کے قریب ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ چاہے مر بھی کیوں نہ چکے ہوں۔' ان کی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ 'لیکن ذرا اب انھیں دیکھو، ان کے موٹے جثّوں کو دیکھو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ انھوں نے خود کو بے لگام کیوں چھوڑ دیا۔'

میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ میں نے سوٹ کیس کی طرف دیکھا اور حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ اس مرتبہ کیا چیز گھر لائے ہیں۔

'اس لیے کہ انھیں معلوم ہے کہ اب انھیں جنگیں خود نہیں لڑنا پڑیں گی۔ نہیں، سر، یہ ڈرائنگ روم کے سپاہی ہیں، اپنے آرام دہ صوفوں پر بیٹھے موٹے ہوتے رہتے ہیں۔ یہی تو وہ پہلی چیز ہے جو وہ سوچتے ہیں، کہ اب انھیں کبھی میدانِ جنگ میں نہیں جانا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ اگر انھیں جنگ لڑنا ہی پڑی، اور اگر انھیں زخم لگ ہی گیا، تو کوئی بھی انھیں اُٹھا کر ان کے بنکروں میں نہیں لائے گا۔ کیا سمجھے؟'

میں نہیں سمجھا تھا۔ 'انھیں کوئی اُٹھا کر واپس کیوں نہیں لائے گا؟'

'اس لیے کہ ان پر خدا کی مار، موٹے ہی اتنے ہیں وہ اٹھیں گے کیسے؟'

میں نے ایک اپنے جنگل سروائیول کورس میں ایک گھات لگا کر کیے جانے والے حملے کی مشق کے دوران عُبید کو اپنی کمر پر اُٹھایا تھا۔ اس نے اپنی ایڑیاں میری ٹانگ کے پٹھوں میں گاڑ دی تھیں، اور میری گردن کے گرد اس کے بازو سخت سے سخت تر ہوئے جا رہے تھے۔ جب اس نے میرے کان کی لو پر کاٹا تو میں نے اسے اُٹھا کر زمین پر پھینک دیا تھا۔

'کیڈٹ عُبید۔ سروائیول کا پہلا اصول یہ ہے کہ تم خود کو بچانے والے کو تنگ نہیں کرو گے۔'

'اگر اس میں مزہ آ رہا ہو تب بھی نہیں؟' اس نے اپنی نیم بند آنکھوں سے پوچھا تھا۔

اس مکان میں ہماری آخری رات عُبید کچن میں بلیک لیبل کی آدھی خالی کی ہوئی بوتل دریافت کر لیتا ہے۔ میں اسے گھور کر دیکھتا ہوں۔ میں اسے نہیں بتاتا کہ جس صبح میں نے کرنل صاحب کو چھت کے پنکھے سے لٹکتا ہوا پایا اسی صبح مجھے یہ بوتل ان کی مطالعہ گاہ میں ملی تھی۔

ہم اسے پانی کے زیادہ تناسب کے ساتھ ملا کر نوش کرتے ہیں۔ 'یہ بہت کڑوی ہے۔' عُبید مُنھ بناتے ہوئے کہتا ہے۔ 'کیا میں اس میں چینی ڈال سکتا ہوں؟'

'یہ تو نفرت انگیز کام ہوگا۔'

وہ ایک گھونٹ بھرتا ہے، اور ایسے مُنھ بناتا ہے جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا ہو۔

دوسرے گلاس کے بعد وہ اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ 'اس کا ذائقہ اتنا برا بھی نہیں ویسے،' وہ کہتا ہے۔ 'ایسا لگتا ہے میں مائع آگ پی رہا ہوں۔'

ایک اور گلاس کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں اور اس کے نشے میں آئے ہوئے ہونٹوں پر بیچ نمودار ہو جاتا ہے۔

'میں نے انھیں تمھارا نام بتا دیا تھا۔ میں نے انھیں تمھارے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ تم تلوار کے ساتھ اس کی مشق کرتے رہے ہو۔'

میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہوں۔ 'میں بھی ہوتا تو یہی کرتا۔'

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں خود یہ کام کر بھی چکا تھا۔

'پھر انھوں نے تمھیں جانے کیسے دیا؟' وہ بڑبڑاتا ہے۔

'اسی وجہ سے جس کے باعث انھوں نے تمھیں چھوڑ دیا۔'

ستارے ایک ایک کر کے رخصت ہونا شروع کرتے ہیں جیسے خدا نے آج کی رات کے لیے اپنا ایوان بند کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

'انھیں اس بات میں کبھی دلچسپی نہیں تھی کہ ہم کیا کرنا چاہتے تھے اور کیوں؟ وہ صرف ہمارے نام اپنی فائلوں میں ڈالنا چاہتے تھے۔' عُبید ایسی بصیرت کے ساتھ کہتا ہے جو صرف پہلی مرتبہ نشے میں آنے والوں سے مخصوص ہے۔ 'ہم جنرل اختر کے مشتبہ تھے، جنرل بیگ اپنے مشکوک لوگ خود ڈھونڈے گا۔'

'کیا عجب کہ انھیں میرا پلان پسند ہی آ گیا ہو۔' میں بوتل کی آخری تلچھٹ اپنے حلق میں ٹپکاتے ہوئے کہتا ہوں۔ 'کیا عجب کہ وہ یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ میں اپنے پلان پر عمل بھی کر سکتا ہوں یا نہیں؟'

'کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو لوگ اس کی حفاظت پر مامور ہیں، وہی اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ کیا وہ ہم جیسے لوگوں کو آزاد کر رہے ہیں؟ تم نشے میں تو نہیں ہو؟ کیا فوج خود؟'

'اور کون ایسا کر سکتا ہے کاکے او؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ بلڈی سویلین ایسا کر سکتے ہیں؟'

کرنل شگری شراب کے چھٹے گلاس کے بعد بھی بولتے رہے تھے۔ میں نے افغانستان میں دشمن کی صفوں سے پیچھے ان کے آخری سفر کی طویل کہانی کے درمیان میں مداخلت کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے مجھے لونگ روم کی انگیٹھی میں آگ جلانے کے لیے کہا تھا، لیکن لگتا تھا کہ وہ اسے بھول چکے تھے۔'ہمارے پاس برف نہیں ہے۔'

'پانی چلے گا۔' انھوں نے کہا اور کہانی جاری رکھی۔'وہاں وہ لوگ ہیں جو لڑائی لڑ رہے ہیں اور یہاں اسلام آباد میں ایسے لوگ ہیں جو بس نوٹ گن رہے ہیں۔ وردی والے لوگ۔' وہ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر اپنی خون آلود اور دھندلی آنکھوں سے میرے چہرے پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔

'تم سمجھتے ہو گے کہ میں نشے میں ہوں۔'

میں نے ان کے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو دیکھا اور پھر ایک نیم دلانہ تردید میں سر ہلا دیا۔ آپ ایک ایسے آدمی سے کیسے بات کرتے ہیں جو آپ کو بس آپ کی پبلک اسکول کی رپورٹ کارڈوں سے جانتا ہو اور اب اچانک خواہش مند ہو کہ وسکی کی بوتل پر اپنی زندگی کی کہانی آپ کو سنا دے؟

انھوں نے میری نگاہوں کو خود پر مرکوز رکھنے کے لیے ان میں جھانکتے رہنے کی کوشش کی، لیکن ان کی آنکھیں پہلے ہی دیانت داری کے بوجھ تلے دہری ہوئی جا رہی تھیں۔

اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ انھوں نے مجھ سے اپنے روزمرہ فرائض سے مُتعلق بات کی۔

'میں اپنے ایک افسر کو نکالنے گیا تھا جس کی ایک ٹانگ ٹینک شکن سرنگ لگاتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی۔ پھر مجھے یہ پیغام ملا کہ مجھے افسر کو بھول کر اس چیز کو واپس لانا چاہیے۔ یہ چیز۔' انھوں نے سوٹ کیس کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے انھیں کسی مُردہ سؤر کو لانے کا حکم ملا ہو۔'فوراً واپس جاؤ رستے میں کوئی بھی ہو اُسے اڑا دو، انھوں نے مجھے بتایا۔'

میرا خیال ہے انھوں نے میری دلچسپی کو میری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔

'میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔' انھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔'میرا مطلب ہے اس مرتبہ۔ تم جانتے ہو میرا کام ہی ایسا ہے۔' انھوں نے کاندھے اُچکائے۔'افغانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یہ سب قتل و غارت گری کے لیے نہیں کر رہے۔ وہ لڑتے ضرور ہیں لیکن یہ بات بھی یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ جب لڑائی ختم ہو جائے تو وہ زندہ ہوں۔ قتل و غارت گری ان کا کاروبار نہیں۔ لڑنا ہے ان کا کاروبار۔ امریکی یہ جنگ جیتنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اور ہم؟'

انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک خطِ مستقیم پر چلتے ہوئے اب اُس سے ہٹ رہے ہیں اور سانس لیتے ہوئے کچھ بڑبڑائے جو کچھ ایسا سنائی دیتا تھا 'دتے اور رنڈیاں۔'

'آگ کیسی ہے، جوان؟' اچانک وہ ایک عملی آدمی بن گئے۔ پورے نشے میں عملی آدمی۔ جیسے میں نے انھیں کوئی شرابی ہی سمجھ لیا ہو اور انھیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

'تو چلو نوجوان۔ چلو اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہیں۔'

انھوں نے اپنی وسکی کی بوتل اُٹھائی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس میں سے کچھ شراب اپنے گلاس میں اُنڈیلی۔ گلاس میں شراب گھومی پھری اور قلقل کرنے لگی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ پیچھے مُڑے اور کہا،'کیا تم میرا سوٹ کیس لا سکتے ہو؟'

جب تک میں سوٹ کیس کو کھینچ کر لونگ روم تک لاتا وہ پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔ انگیٹھی میں آگ جلانے کا خیال زیادہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ آسمان صاف تھا اور ہمارے تیرتے ہوئے ساتھی بادل واپس سائبیریا، یا جہاں سے بھی وہ آئے تھے، چلے گئے تھے۔ نیچے وادی میں دریا تک خاموش تھا۔

یہ دریا کسی کسی رات چپ کیوں سادھ لیتے ہیں؟

میں سوٹ کیس کو کمرے کے درمیان میں گھسیٹ لایا اور آگ کی فکر کرنے لگا۔ لکڑیاں خشک تھیں، آسمان صاف تھا، اس منحوس آگ کی ہمیں ضرورت تھی ہی نہیں۔

'میں نے اپنے وقت میں کچھ زندگیاں بچائی ہیں۔ یا شاید میرا خیال ہے کہ میں نے بچائی ہیں۔ یہ سارا حرام کا افغان سلسلہ وغیرہ۔ میں وہاں پانچ سو بار سے زیادہ گیا ہوں۔ یہ تمام سفر ایسے جن سے میں انکار کر سکتا تھا۔ اور اب میں اپنا سفر یہاں ختم کر رہا ہوں۔' انھوں نے آگ کو تحسین کی نظروں سے دیکھا۔ میں نے سوٹ کیس کو دیکھا۔

میرے رخسار تمتما رہے تھے۔ کمرا بھٹی کی طرح گرم ہو چکا تھا۔

'اسے گھسیٹ کر واپس لانے میں مجھے تین دن لگے۔' انھوں نے پچھتاوے سے بھری آواز میں کہا۔

وہ اپنا گلاس اپنے سینے کے بالکل سامنے ہاتھ میں لیے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہوئے گلاس اونچا کیا اور تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پر گھوم گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی پارٹی میں ہوں جو بہت دیر سے جاری ہو اور جہاں وہ آخری رقص بھی کر ڈالنے کا عزم کیے ہوئے ہوں۔

'سوٹ کیس کو کھولو۔' انھوں نے کہا۔

ایک بہت صاف رات کے آسمان میں ایک سرمئی بادل، جس کے کنارے کسی بھرتے ہوئے زخم کی طرح خراش رنگ نارنجی تھے، کھڑکی پر یوں نمودار ہوا جیسے کرنل شگری نے اسے بہ طور گواہ طلب کیا ہو۔

میں نے سوٹ کیس کھولا۔ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈالروں سے۔

'یہ تھا میرا مشن۔ اس رقم کو ایک ایسے آدمی سے واپس لینا جو مر چکا تھا۔ اور میں نے اپنے آدمی کو وہاں دفن کیا اور اسے یہاں لے آیا۔ کیا میں کوئی اکاؤنٹنٹ لگتا ہوں۔ کیا میں اپنے بندوں کی بھڑوا گیری اسی کے لیے کرتا ہوں؟'

میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ہم ایک دوسرے کی نگاہوں میں دیکھتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے کے لیے انھیں یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے بیٹے سے بات کر رہے تھے۔

'پھینک دو آگ میں۔' انھوں نے کہا۔

اگر مجھ پر نیند کا غلبہ اس قدر نہ ہوتا تو شاید میں انھیں دلائل دینے کی کوشش کرتا۔ شاید میں انھیں بتاتا کہ ان کی جنگ کی اخلاقیات جو بھی رہی ہوں، لیکن یہ پیسہ ان کا نہیں تھا کہ وہ اسے آگ میں جلانے کو چلے تھے۔ مگر اس کے بجائے میں ان کا حکم بجا لایا۔ اور جلد مجھے بہت سے امریکی صدور، وائٹ ہاؤسوں اور ہمیں خدا پر یقین ہے کے لفظوں کو مڑتے تڑتے اور راکھ کی ڈھیریوں میں تبدیل ہوتے دیکھنے میں مزہ آنے لگا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ استعمال کیے اور ڈالروں کی مٹھیاں بھر بھر کر انگیٹھی میں ڈالیں۔ کمرا جلد ہی سبز رنگ کے دھوئیں اور ڈھائی کروڑ ڈالر مالیت کی راکھ سے بھر گیا۔ میں نے ایک آخری ڈھیری سے ایک نوٹ کی راکھ جھاڑی اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ صبح کو یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ وہ سب کچھ کوئی خواب نہیں تھا۔

'اب سونے چلو نوجوان۔ میں پہرا دوں گا۔ میں نے انھیں کہا ہے کہ وہ آئیں اور اپنی بھڑوت کی رقم لے جائیں۔' میں نے ان کی طرف دیکھا اور ہنسا۔ ان کا چہرہ کمرے میں اڑتی ہوئی راکھ سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بولی ووڈ کی کسی فلم کے کوئی ایسے حبشی غلام ہوں جس کا میک اپ ٹھیک سے کیا نہ جا سکا ہو۔ 'سونے سے پہلے اپنا منھ دھو لینا۔' انھوں نے کہا۔ میرے لیے یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔

* * *

بارش کھڑکی پر بجنا شروع ہو جاتی ہے۔

'کیا مون سون شروع ہو گیا؟' عُبید، جس کی توجہ کھڑکی پر بارش کے اچانک تازیانوں نے ہٹا دی تھی، پوچھتا ہے۔

'مون سون تم میدانی علاقے کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں بس بارش ہوتی ہے۔ بس آتی ہے اور جاتی ہے۔'

دعوتِ آم

۲۹

مون سون کی اوّلین ہواؤں نے کوّے کو مشرقی پنجاب میں پاکستانی سرحد کی پرلی طرف پیلے رنگ کے چھٹے پڑتے ہوئے سمندر میں سرسوں کے پھولوں پر دعوت اڑاتے ہوئے دیکھا۔ کوّے کی گرمیاں اچھی گزری تھیں، وہ موٹا ہو گیا تھا اور برہمن چیلوں کے گینگ کی کئی چھاپہ مار کارروائیوں سے بچ نکلا تھا۔ یہ چیلیں لگتی تو عقابوں کی طرح تھیں لیکن کام گدھوں جیسے کرتی تھیں اور گرمیوں میں اس علاقے میں بلا روک ٹوک راج کرتی تھیں، اور اپنے عظیم الشان نام کے باوجود فراواں سبزے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتی تھیں اور اس کے بجائے سرحد پار سے آئے ہوئے اس مہمان جیسے عام کوّوں کا شکار کرتی تھیں۔ کوّا ظاہر ہے اپنی زندگی کے لیے اپنی ہوش یاری کو داد دیتا تھا لیکن وہ جس بددعا کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھا اس نے اسے ایک مقصد کے لیے زندہ رکھا ہوا تھا اور ایک موت کے لیے جو خور و نوش کے قوانین بالائے طاق رکھنے والے لالچی چیلوں کے ایک جتھے کی زندہ خوراک بننے سے زیادہ ڈرامائی تھی۔

سرسوں کے کھیت سے ایک سو تیس میل دور، قلعہ لاہور کے سیل نمبر چار میں، اندھی زینب نے اپنی جا نماز تہ کی اور ایک سانپ کی شش کار سنی۔ یہ ایک چھوٹا سا سانپ تھا، شاید اس کی درمیانی انگلی جتنا، لیکن زینب کے کانوں نے فوراً ہی اس کی بہ مشکل سنائی دینے والی شوکر سن لی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو کھڑی کی کھڑی رہ گئی، پھر اپنی چپل

اتاری اور انتظار کیا کہ سانپ اگلی مرتبہ حرکت کرے۔ بچپن کے ایک واہمے کو ذہن میں رکھتے ہوئے زینب نے صرف اسی وقت حرکت کی جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ سانپ کو ایک ہی وار میں مار سکتی ہے۔ وہ اپنی چپل کو تیزی سے نیچے لائی اور تین تیر بہ ہدف وار کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ چپل ہاتھ ہی میں لیے وہ کھڑی تھی کہ اس کے نتھنوں نے کچلے ہوئے گوشت کی بُو سونگھی۔ مردہ سانپ کے خون کے قطرے تہ خانے کی ہوا میں تیرتے پھرے۔ اس کے سر کا درد انتقامی جذبے کے ساتھ عود کر آیا، اور دو غیر مرئی ہتھوڑے انتہائی تکلیف دہ یک سانیت کے ساتھ اس کی چوٹی پر وار کرنے لگے۔ وہ اپنے تہ خانے کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی، اپنی چپل پھینک دی اور ہلکی آواز میں بد دعائیں کرنے لگی۔ اس نے اس شخص کو بد دعا دی جس نے اس اندھے کنویں میں اسے بند کر دیا تھا، جہاں وہ کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی اور اپنی زندگی کے لیے دکھائی نہ دینے والی مخلوقات کو مارنے پر مجبور تھی۔ 'شالا تیرا لہو زہر بن جائے۔ شالا تیری آندروں کو کیڑے کھائیں۔' اندھی زینب نے اپنی کنپٹیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے دبایا۔ سرگوشی میں دُہرائے ہوئے اس کے لفظ قلعے کے قدیم روشن دانوں کے راستے سفر کرتے ہوئے منطقہِ حارہ کے اس ہوا کے کم دباؤ میں گھل مل گئے جو بُحیرہِ عرب پر بننا شروع ہوا تھا اور جس کی سمت ملک کی مغربی سرحدوں کی جانب تھی۔

مون سون کی ہواؤں نے کوّے میں کچھ بے چینی سی پیدا کی اور وہ اُڑا اور ہوا میں تیرنے لگا۔ ہوا نمی سے بھری تھی۔ کوّا بغیر رکے پورے ایک دن اُڑتا رہا اور اسے ایک مرتبہ بھی پیاس محسوس نہیں ہوئی۔ رات اس نے بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی چیک پوسٹ پر گزاری جہاں وہ کھیر سے بھری مٹی کی ایک ہانڈی میں چونچ مارتا رہا جو سپاہیوں نے ٹھنڈا ہونے کے لیے باہر کھلی فضا میں رکھ چھوڑا تھا۔ ہانڈی ایک ٹوکری میں رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹوکری کپڑے سکھانے کی ایک تار سے لٹکی تھی؛ وہ کھانے کے بعد کپڑے سکھانے کی تار پر ہی سو گیا۔ اگلے روز کوّے نے خود کو ایک ویران قطعے پر

اُڑتے ہوئے پایا، مون سون کی ہوا کا وعدہ جھوٹا ثابت ہوا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ آہستگی سے اُڑا اور سبزے کا کوئی نشان ڈھونڈتا پھرا۔ کوّا ایک متروک اور خشک کنویں کے قریب اترا جہاں اسے چونچ مارنے کے لیے ایک چڑیا کا گلتا سڑتا ہوا جثہ مل گیا۔ اس ضیافت نے اسے تقریباً مار ہی ڈالا۔ پیاس اور پیٹ کے درد سے پریشان اس نے خطِ مستقیم پر پرواز شروع کی اور ہوا کی سمت چل دیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک فاصلے پر روشنیاں جھل مل کرتی دیکھیں اور اسے افق پر دھوئیں کے بادل اُٹھتے نظر آئے۔ اس نے ایک زخمی لیکن پُرعزم سپاہی کی طرح باری باری پہلے اپنا بایاں پر اور پھر اپنا دایاں پر اپنے جسم کے ساتھ سکیڑا۔ صبح کو وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ روشنیاں غائب ہو چکی تھیں اور اُبھرتا ہوا سورج اپنے ساتھ گلے سڑے آموں کی حیرت انگیز خوش بُو لے آیا تھا۔ اس نے ایک باغ پر جھپٹا مارا، پھر اس نے مٹی سے لپے ایک چھوٹے سے گھر سے ایک ننھے سے پھرتیلے لڑکے کو غلیل کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ کوّا بچاؤ کی کوئی تدبیر کرتا، ایک کنکری اس کی دم کو جا لگی اور وہ لڑکے کی رسائی سے دور نکلنے کے لیے اوپر اُڑ گیا۔ اس کی بے چینی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی کوّے والی جبلت اور کوّے والی تقدیر دونوں نے مل کر اسے بتایا کہ اسے اس باغ میں رہنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہیے۔

پانچ سو میل دور پاک فضائیہ کے وی آئی پی موومنٹ اسکواڈرن کے ہینگر میں ایلومینیم کے دو کاگ مینٹی ننس چیک کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ کوّے کی تقدیر ان میں سے ایک کاگ سے جڑی ہوئی تھی۔ انجن ٹیسٹ کیے جا چکے تھے، جہاز کی تھکاوٹ کا اندازہ لگا کر اسے صحت مندانہ قرار دیا جا چکا تھا اور کسی ممکنہ خرابی سے بچاؤ کے لیے بیک اپ سسٹم بھی چیک کیا جا چکا تھا۔ دونوں سی ون تھرٹی ہرکولیس طیارے ٹھیک ٹھاک تھے اور اڑان بھرنے کے لیے سُپر فٹ تھے۔ جنرل ضیا کو گیریژن فائیو میں ٹینکوں کی ایک

مشق دیکھنے کے لیے جس سفر پر جانا تھا اس کے لیے جہاز کا انتخاب، صدارتی سیکیورٹی کی معیاری ضوابط کے مطابق، پرواز سے چند گھنٹے قبل ہی کیا جا سکتا تھا۔ وارنٹ افسر فیاض فائبر گلاس کے ایک بارہ فٹ لمبے پوڈ کو بہ ذاتِ خود صاف کر رہا تھا۔ باہر سے یہ پوڈ ناسا کے ان چمک دار کیپسولوں کی طرح لگتا تھا جو وہ خلا میں بھیجا کرتی تھی۔ اندر سے یہ کسی گینگسٹر کے ایسے دفتر سے مشابہ تھا جس میں ہر شے مہیا ہو۔ وارنٹ افسر فیاض نے بیج لیدر کے صوفوں کی جھاڑ پونچھ کی جن پر نوواسویڈ کے ہیڈ ریسٹ لگے ہوئے تھے اور سفید رنگ کے نرم کارپٹ کو ویکیوم کیا۔ اس نے ایلومینیم بار کو پالش کیا اور مشروبات کی کیبنٹ میں قرآن کی ایک جلد رکھ دی۔ جنرل جن سواریوں اور پروازوں پر سوار ہوتا تھا ان میں قرآن کی ایک جلد رکھنا لازمی تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ سفر کے دوران اس کی تلاوت کیا کرتا ہو۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے ہونے سے اس کے لمبے چوڑے سیکیورٹی کارڈن میں ایک اور غیر مرئی حفاظتی تہ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اب وارنٹ افسر فیاض کو صرف یہ کرنا تھا کہ ائرکنڈیشننگ ڈکٹ میں نیا ائرفریشنر رکھ دے اور پھر پوڈ بالکل تیار ہوگا۔ سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر یہ پوڈ ٹیک آف سے چھ گھنٹے پہلے تک ایک یا دوسرے جہاز میں فٹ نہیں کیا جائے گا۔ جب یہ پوڈ ان دو جہازوں میں سے کسی ایک میں فٹ کیا جائے گا تبھی وہ جہاز صدارتی طیارہ کہلائے گا۔ اس مرحلے پر اس کا کال سائن خود بہ خود پاک ون ہو جائے گا۔ وارنٹ افسر فیاض کے پاس بہت سارا وقت پڑا تھا، اتنا زیادہ کہ وہ وی آئی پی موومنٹ اسکواڈرن کے سپلائی افسر میجر کیانی سے نیا ائرفریشنر لانے سے پہلے جھاڑ پونچھ اور پالش کا ایک اور راؤنڈ لگا سکتا تھا۔

کوّے نے باغ کے گرد چکّر لگایا، اور غلیل کی رینج سے باہر نکل آیا۔ لڑکے نے سرخ چونچ والے ایک طوطے کو دیکھا اور اس پر گھات لگا کر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ کوّے نے سر نیہوڑا کر جست بھری اور سب سے طویل قامت آم کے درخت کی

سب سے اونچی ٹہنی پر سیاہ پڑتی ہوئی سبز شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنے پہلے آم کو چونچیں مارنا شروع کیں۔ جیسا کہ اس کی خوش بُو نے وعدہ کیا تھا، آم بہت پکا ہوا تھا اور میٹھے بہت میٹھے عرق سے بھرا ہوا تھا۔

جب میں نے کمانڈانٹ کے دفتر سے اپنے سمن وصول کیے تو میں اپنے سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کے ارکان کو یہ سکھانے میں مصروف تھا کہ ایک ہندوستانی کیسے بنا جاتا ہے؛ اس کے لیے فرش پر اپنے پیروں اور سر کو تین سو ساٹھ ڈگری پر گھمانا پڑتا ہے اور اس دوران اپنے ہاتھ فضا میں بلند رکھنے ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ سائلنٹ ڈرل کے دوران سرگوشیاں کر رہے تھے اور اب میں انھیں خاموشی کے فوائد پر ایک سبق دے رہا ہوں۔ وہ زنخوں کے کسی گروہ کی طرح مُنھ بنا رہے ہیں۔ شاید کوک کی بوتلوں کے ڈھکنے جو میں نے ان کے سروں کے نیچے رکھے ہیں انھیں تکلیف دے رہے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنی ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد زیادہ نرم دل بن کر واپس آیا ہوں گا تو انھوں نے اب تک اپنی اس، رائے پر نظرِ ثانی کر لی ہوگی۔ بینن رہے یا نہ رہے، ڈرل کے ضابطے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ جیل میں کچھ دن گزارنے سے ایک سپاہی کوئی صوفی بن جاتا ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ خود بھی قلعے میں ایک ہفتہ گزار آئیں۔ سلاخوں کے پیچھے سبق صرف سویلین سیکھتے ہیں، سپاہی سپاہی ہی رہتا ہے۔ میں اپنا آدھا پیا ہوا سگریٹ اس کے مُنھ میں ٹھونس دیتا ہوں جو سب سے زیادہ شور کر رہا ہے، دھواں اس کے نتھنوں میں داخل ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ ہوا میں لہرانے لگتے ہیں اور اس کی بڑبڑاہٹ زیادہ پُرشور ہو جاتی ہے۔ 'تھوڑی تمیز سیکھ لو۔' میں اسے بتاتا ہوں اور کمانڈانٹ کے دفتر کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہوں۔

کمانڈانٹ نے ہمیں ایسے پھر سے قبول کر لیا تھا جیسے ہم اس کے شرارتی بیٹے ہوں۔ جس رات ہم شگری پہاڑ سے واپس آئے، وہ ہمارے ڈورم میں آیا اور دروازے

سے ہی ہماری طرف نرمی سے دیکھا۔ عُبید اور میں اپنے بستروں کے ساتھ ہی ہوشیار پوزیشن میں کھڑے ہو گئے۔ 'جب میرے لڑکوں کو مجھ سے دور لے جایا جائے تو مجھے پسند نہیں آتا۔' اس نے ضبط سے دبائی ہوئی آواز میں کہا جس سے پدرانہ تشویش ٹپکتی تھی۔ جیسے کہ ہم تہ خانے میں رکھے جانے والے قیدی نہ ہوں بلکہ وہ شریر لڑکے ہوں جو لائٹ آؤٹ ٹائم کے بعد گھر واپس آئے ہوں۔ 'جہاں تک میرا تعلُّق ہے اور جہاں تک اکیڈمی کا تعلُّق ہے، ہمارے نزدیک تم لوگ جنگل سروائیول کورس پر گئے ہوئے تھے۔ اور یہ بات حقیقت سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہے۔'

میں نے اس کی سینڈھرسٹ برانڈ کی جذباتیت کو ہمیشہ قابلِ نفرت پایا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ بناوٹی نہیں تھے اور بغیر کسی ریہرسل کے انُ کے مُنھ سے نکل رہے تھے جیسے وہ جو کچھ کہہ رہا ہو، وہی اس کے دل میں بھی ہو۔ جب وہ ہم سے جو کچھ ہوا اسے بھول جانے کی اور پورے قصّے کے نیچے ایک لکیر کھینچ دینے کی ہدایت جیسی باتیں کر رہا تھا تو مجھے ایسے موقع پر جو متلی سی محسوس ہوتی تھی اس مرتبہ محسوس نہیں ہوئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑا اور سرگوشی میں کہا، 'از دیٹ کلیئر؟' ہم دونوں نے سٹرینتھ فائیو میں پکار کر کہا: 'یس سر۔' اپنی اداسی سے وہ ایک لمحے کے لیے حیران ہو کر نکلا، ایک پُر غرور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور وہ چل دیا۔

'وہ جا رہا ہے ایک اور جنرل جو تمھارے ڈیڈی کا کردار ادا کرنا چاہ رہا تھا۔' عُبید نے اپنے بستر پر گرتے ہوئے تلخی سے کہا۔

'جیل نے تمھیں سنکی بنا دیا ہے، بے بی او۔ ہم سب ایک بڑے خاندان کا حصّہ ہی تو ہیں۔'

'ہاں۔' اس نے جمائی لیتے اور اپنے چہرے کو ایک کتاب سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔ 'بڑا خاندان، بڑا سا گھر، شان دار عقوبت خانے۔'

کمانڈانٹ مجھ سے اب آخر کیا چاہ سکتا تھا؟ سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کی پراگریس پر کوئی رپورٹ؟ جیل کے زندگی کی یونی ورسٹی ہونے کے بارے میں کوئی لیکچر؟ کیا اسکواڈ میں سے کوئی شخص کوک کی بوتلوں کے ڈھکنوں کو سر کے نیچے رکھ کر انڈین بنانے کی شکایت کرتا رہا ہے؟ میں اپنی بیرٹ ٹوپی درست کرتا ہوں، کالر سیدھے کرتا ہوں، اس کے دفتر میں داخل ہوتا ہوں اور اسے ایک پُر جوش سلیوٹ پیش کرتا ہوں۔

اس کے مطالعے کی عینک اس کے ناک کے کنارے پر ہے اور اس کا دو انگلیوں والا سلیوٹ میرے سلیوٹ سے بھی زیادہ خوش گوار ہے۔ اس کے دفتر میں 'کیا تمھیں خوش خبری مل گئی' قسم کا ماحول ہے۔ کیا اسے اس کا تھرڈ اسٹار مل گیا ہے؟ لیکن اس کا چہرہ تو میری طرف دیکھ کر چمک رہا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے اچھے موڈ کا ذریعہ کوئی اور نہیں بلکہ خود میں ہوں۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ لیے ہوا میں اس سے دائرے بنا رہا ہے اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو 'اندازہ لگاؤ؟'

'تم نے ان بڑے لونڈوں پر ٹھیک ٹھاک امپریشن ڈالا ہو گا۔' کاغذ پر جو کچھ بھی لکھا ہوا تھا اس سے کچھ مخمصے میں مبتلا ہو کر وہ کہتا ہے۔

''سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ سترہ اگست کو بہاول پور کے گیریژن پانچ میں ٹینکوں کی مشق کے بعد پرفارم کریں۔'' وہ کاغذ پر سے پڑھتا ہے اور نظریں اُٹھا کر اس توقُّع سے میری جانب دیکھتا ہے کہ میں خوشی سے رقص کرنے لگوں گا۔

میں کیا چلّا رہا ہوں؟ کوئی ایلیٹ ڈرل اسکواڈ یا شہر شہر گھومنے والا کوئی حرام کا سرکس؟ کیا مجھ سے یہ توقُّع رکھی جا رہی ہے کہ میں ہر چھاؤنی میں فوجی دستوں کو تماشا دکھاتا پھروں گا؟ ویسے یہ گیریژن پانچ ہے کہاں؟

'یہ بڑے اعزاز کی بات ہے، سر۔'

'تمھیں اس اعزاز کا ابھی پتا ہی نہیں ہے، نوجوان۔ صدر صاحب بہ ذاتِ خود وہاں موجود ہوں گے، ساتھ میں امریکی سفیر ہوں گے۔ اور جب چیف صاحب خود وہاں آ رہے

ہیں تو تمھیں توقع رکھنی چاہیے کہ فوج کی ساری ہائی کمان بھی وہاں ہوگی۔ تم ٹھیک کہتے ہو نوجوان۔ یہ ایک اعزاز نہیں ڈیڑھ اعزاز ہے۔'

میں کسی ایسے لڑکے کی طرح محسوس کرتا ہوں جسے لاشوں کے ڈھیر میں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہو اور پھر وہ اپنا نام پکارا جاتا ہوا سن لے۔ اس بات کا کتنا چانس ہوتا ہے کہ آپ کے گلے کے گرد بندھی ہوئی رسّی آپ کا منکا ٹوٹنے سے پہلے خود ٹوٹ جائے؟ کتنے قاتل ایسے ہوں گے جنھیں ایک بار پھر کوشش کر دیکھنے کا موقع دیا گیا ہو؟

'یہ سب آپ کی لیڈرشپ کے طفیل ممکن ہوا ہے، سر۔'

وہ اپنے کاندھے اُچکاتا ہے اور میں فی الفور جان لیتا ہوں کہ اُسے تو بلایا ہی نہیں گیا۔

اسی کے ساتھ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان سفید ہوتے ہوئے بالوں، پرائیوٹ درزی سے سلوائی ہوئی یونی فارم اور ترقی کی برہنہ خواہش کے نیچے ایک ایسا آدمی بھی چھپا ہوا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ میری حق تلفی ہوئی تھی۔ وہ احساسِ گناہ کی ایک رزمیہ جیسی مہم پر ہے۔ یہ اچھا ہے کہ اس جیسے لہو چوسنے والے میرے ساتھ ہیں، لیکن اس کے ریم راڈ کی طرح کرسی پر بیٹھنے کے انداز، اس کے میری طرف بڑھنے اور میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھ دھرنے میں واحد افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے دل سے کہہ رہا ہے۔ اسے واقعی مجھ پر فخر ہے۔ وہ مجھے ایسی جگہوں پر جاتا دیکھنا چاہتا ہے جہاں وہ خود جانا چاہتا تھا۔

میں اس کے کاندھوں سے پرے اس کی ٹرافیوں کی کیبنٹ کی جانب دیکھتا ہوں۔ پینتل کا مجسمہ اب دائیں جانب ہے۔ اس کی جگہ ایک چھاتا بردار کے مجسمے نے لے لی ہے۔ اس کے پیراشوٹ کی چھتری سنہری فوائل کی بنی ہے، سنہری دھاگے سے بنی ہوئی رسّیاں اس آدمی کے دھڑ سے بندھی ہیں اور وہ آدمی اپنی رپ کورڈ تھامے ہوئے اوپر پیراشوٹ کی چھتری کو دیکھ رہا ہے۔ کمرے کا درجۂ حرارت یکا یک گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جب میں مجسمے پر موجود چمکتی ہوئی سیاہ لکڑی کے بلاک پر، جس پر وہ مجسمہ کھڑا ہے، لکھی

تحریر پڑھتا ہوں: بریگیڈیئر ٹی ایم میموریل ٹرافی فار پیرا ٹروپرز۔

'جاؤ، دکھا دو انھیں، نوجوان۔' میرے کاندھوں پر کمانڈانٹ کے ہاتھ بھاری محسوس ہوتے ہیں اور اس کی آواز مجھے کرنل شگری کے وھسکی میں ڈوبے وعظ کی یاد دلاتی ہے۔ میں جب اس کے دفتر سے باہر نکلتا ہوں تو سیکنڈ او آئی سی کو ایک مبالغہ آمیز سلیوٹ پیش کرتا ہوں اور اپنے ڈورم کی جانب دوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ شیشی وہیں ہے، میری یونی فارم مینٹی ننس کِٹ میں، بوٹ پالش اور براس شائن کی ٹیوب کے درمیان محفوظ، بے ضرر سی دکھائی دینے والی گلاس کی ایک بوتل۔ میں جانتا ہوں کہ وہ وہیں پڑی ہے کیوں کہ میں نے اسے پھینک دینے کا کئی مرتبہ سوچا ہے لیکن میں ایسا کر نہیں سکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ وہیں ہے کیوں کہ میں ہر صبح اسے دیکھتا ہوں۔ مجھے واپس جانا ہے اور اسے پھر سے دیکھنا ہے، اسے اپنے ہاتھ میں لینا ہے اور اپنی تلوار کی نوک اس میں بھگونی ہے۔ 'یہ پرانا بڑی جلدی ہو جاتا ہے۔' مجھے انکل ستار جی کی سرگوشی یاد آتی ہے۔ 'یہ وقت کے ساتھ نرم ہو جاتا ہے، آہستگی سے پھیلتا ہے۔ لیکن میرے جیسا غریب آدمی اسے زیادہ عرصہ رکھ نہیں سکتا۔' میں دریافت کروں گا کہ یہ زہر کتنی اچھی طرح پرانا ہوا ہے۔ میں دریافت کروں گا کہ میری تلوار کی نوک پر لگ کر اس کا رنگ کیسا ہو جاتا ہے۔ میں دریافت کروں گا کہ میرے لوہے میں وہ جذبہ زندہ بھی ہے یا مر چکا۔

سائلنٹ ڈرل کے دوران حادثات ہوتے تو کبھی کبھار ہیں لیکن ہوتے تو ہیں۔

۳۰

جنرل اختر کسی ایسے آدمی کی سی شدّت کے ساتھ کاغذ پر قلم گھسیٹ رہا تھا جسے پکّا پتا ہو کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، لیکن اس کے بیان کے لیے اسے درست الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ اس کی نظریں بار بار ہرے ٹیلے فون کی طرف اُٹھتیں، جو اس نے بالکل اپنے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ فون وہاں میز پر ان بہت سے جھنڈوں کے چھوٹے سے باغ کے درمیان پڑا تھا جو بری، بحری اور فضائی فوج اور دیگر نیم فوجی رجمنٹوں میں اس کی ذمّے داریوں کی نمایندگی کرتے تھے۔ انٹر سروسز انٹیلی جینس کے سربراہ کی حیثیت سے اسے کبھی فون کال کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا، خصوصاً اتنے چھوٹے سے معاملے سے مُتعلّق انفارمیشن کے لیے۔ لیکن اب جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے وہ اسٹریٹیجک ریویو سے مُتعلّق اجلاسوں کی صدارت کرتا یا آرمی افسران کی ایک کے بعد دوسری ہاؤسنگ اسکیموں کا افتتاح کیا کرتا۔ کبھی کبھار اسے جنرل ضیا کی نقل وحرکت سے مُتعلّق اخبارات سے اطلاع مل جاتی۔ اس پر اسے غصّہ آ جاتا لیکن اس نے اپنی طبیعت میں انٹیلی جینس امور میں دلچسپی کے ایک نپے تلے فقدان کو فروغ دینا سیکھ لیا تھا: میرا چیف مجھے اپنے ملک کی جس بھی حیثیت میں خدمت کرنے کا موقع دے، میں خوش ہوں،' وہ ہر مرتبہ کہتا جب وہ جنرل ضیا کے اردگرد ہوتا۔ جو انفارمیشن وہ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ آسانی سے مل سکتی تھی: وہاں دو جہاز تھے اور صرف ایک وی آئی پی پوڈ۔ وہ

صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ فائبر گلاس کا اسٹرکچر دونوں میں سے کس جہاز میں لگایا جائے گا، اور دونوں میں سے کون سا جہاز پاک ون بنے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اس بارے میں نہ سوچے۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے خطاب کا آخری جملہ گھڑنے پر توجہ مرکوز رکھے۔

تقریر سادہ سی ہونی تھی۔ وہ اسے چھوٹی اور پُر اثر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جنرل ضیا کی طرح لمبی چوڑی تمہید میں نہیں پڑنا چاہتا تھا جیسے 'میرے بھائیو اور بہنو اور چاچو اور چاچیو'۔ اس کا پیغام مختصر ہونا تھا۔ صرف دس جملوں کا جو بس ڈیڑھ منٹ میں مکمل ہو جانے تھے اور جن سے وہ تاریخ کا رخ تبدیل کر دینے والا تھا۔ 'میرے عزیز ہم وطنو۔ ہمارے محبوب صدر کا طیارہ بہاول پور کے ائر فیلڈ سے ٹیک آف کے فوراً بعد ایک بدقسمت حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔۔۔'

اس نے جملہ پھر سے پڑھا۔ وہ جملہ اسے زیادہ قابلِ یقین محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس جملے میں ایسا کچھ تھا جو سچا نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اسے وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔ کوئی میکانیکی خرابی؟ وہ سبوتاژ کی کارروائی تو ممکنہ طور پر نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کی جانب اشارہ تو کر سکتا تھا۔ اس نے 'ایک بدقسمت حادثے کا شکار ہو گیا' کے الفاظ کاٹ دیے اور ان کے بجائے 'پھٹ گیا' کے الفاظ رکھ دیے۔ یہ زیادہ زبردست لگ رہے ہیں، اس نے سوچا۔ اس نے حاشیے میں ایک اور جملے کا اضافہ کیا۔ 'ہم ان دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں جو ہمارے ملک کو خوش حالی کے راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔۔۔'

اس نے پھر فیصلہ کیا کہ وہ 'بدقسمت حادثہ' کے الفاظ رہنے دے مگر ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیا: طیارے کے اس الم ناک حادثے کی وجوہات ابھی معلوم نہیں۔ انکوائری کا حکم دے دیا گیا ہے اور مجرم کوئی بھی ہوں اس دھرتی کے قانون کے تحت انھیں فوری کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔'

اس نے غائب دماغی کے ساتھ فون اُٹھایا۔ وہ ابھی تک کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریر کی اختتامی لائن سے متعلق بہت طویل سوچ بچار کی۔ اسے کسی ایسے جملے کی

ضرورت تھی جو سارے معاملے کو جوڑ کر رکھ دے، کوئی بہت ہی انوکھا جملہ، مورال بلند کر دینے والا۔ جنرل ضیا کے زمانے میں اللہ کا نام بہت پکارا جا چکا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ کوئی اچھا سا سیکولر اشارہ دے تو امریکی اُسے پسند کر سکتے ہیں، کچھ ایسا جو دانش ورانہ قسم کا لگتا ہو، دلاسا دیتا ہوا اور ایک ایسے قولِ زرّیں کی طرح جسے دُہرایا جا سکے۔ اس کی رائے ابھی 'ہم اشتراکیت کی ابھرتی ہوئی لہر کے مقابل ایک فرنٹ لائن اسٹیٹ کی حیثیت سے' اور 'ہم اشتراکیت کے سیلاب کے آگے ایک فرنٹ لائن اسٹیٹ کی حیثیت سے' کے درمیان منقسم تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ کسی سلام دعا کے بغیر میجر کیانی نے اسے آج کی موسم کی رپورٹ پڑھ کر سنا دی۔ 'ہوا کے کم دباؤ کے دو زون جو جنوب میں مجتمع ہو رہے تھے اب شمال کی طرف جا رہے ہیں۔ ڈیلٹا ون یقیناً ڈیلٹا ٹو سے آگے بڑھ جائے گا۔' فون نیچے رکھنے کے بجائے جنرل اختر نے اپنی شہادت کی انگلی کریڈل پر دبائی اور ایک ذہنی چیک لسٹ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس فہرست کا اتنی بار جائزہ لے چکا تھا کہ، اس کے خیال میں، اب وہ اس کے بارے میں معروضی ہو کر سوچنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے اس فہرست کا نیچے سے اوپر جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

۹۔ قوم سے خطاب: تقریباً مکمل۔

۸۔ قوم سے خطاب کے لیے سیاہ شیروانی: استری ہو چکی، پہن کر دیکھی جا چکی۔

۷۔ امریکی ردِّ عمل: متوقع۔ آرنلڈ رافیل کو کال کرنی ہے اور اسے پھر سے یقین دہانی کرانی ہے۔

۶۔ جب خبر سامنے آئے تو مجھے کہاں ہونا چاہیے: جنرل ہیڈ کوارٹرز میں نئے آفیسرز کلب کے افتتاح میں مصروف

۵۔ اگر شگری لڑکا چل جائے: مسئلہ ٹیک آف سے پہلے ہی حل ہو جائے گا۔ اگر شگری لڑکا اپنے کنچے ہار جائے: جہاز جانا چاہیے۔

۴۔ اگر ائر فریشنر نے کام نہ کیا: کچھ بھی نہیں ہو گا۔

۳۔ اگر ائر فریشنر کام کر گیا: کوئی نہیں بچے گا۔ کسی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوگا۔

۲۔ کیا اُسے واقعی مر جانا چاہیے؟ وہ ملک کے وجود کے لیے ایک خطرہ بن چکا ہے۔

۱۔ اللہ مجھ پر جو ذمہ داری ڈالنے والا ہے، کیا میں اُس کے لیے تیار ہوں؟

جنرل اختر نے اپنا سر آہستگی سے ہلایا اور نمبر ڈائل کیا۔ کسی سلام دعا کے بغیر اس نے موسم کی رپورٹ پڑھ کر سنا دی، پھر توقف کیا اور ریسیور کو دوسرے ہاتھ میں لینے سے پہلے اونچی اور واضح آواز میں کہا۔ 'لیونڈر۔'

یکایک اسے نیندسی آنے لگی۔ اس نے خود کو بتایا کہ وہ اپنی تقریر کے آخری جملے کا فیصلہ صبح کر لے گا۔ شاید اس کے خوابوں میں ہی اس پر کچھ اتر آئے۔ اس نے بستر کی طرف جانے سے پہلے اپنے وارڈ روب کو دیکھا اور سیاہ شیروانی پر ایک طویل نگاہ ڈالی جس میں اسے اگلے روز قوم کے سامنے آنا تھا۔ اپنے خوابوں میں اپنی تقریر کا آخری جملہ سوجھنے سے مُتعلق اس کی امید غلط ثابت ہوئی۔ وہ ایک ایسے شخص کی نیند سویا جسے پتا ہو کہ صبح وہ جاگا تو ایک بادشاہ ہوگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اپنے بستر کے کنارے رکھے سرخ فون کی گھنٹی سے، اور یہ کال جنرل ضیا کی تھی۔ 'بھائی اختر۔ اتنی صبح تکلیف دینے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن آج میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے والا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ایسے میں میرے ساتھ موجود ہوں۔ پاک ون میں مجھے جوائن کر لیجیے۔'

میرے سائلنٹ ڈرل اسکواڈرن کو لے جانے والا سی ون تھرٹی جانوروں کے پیشاب کی بو اور ائر کرافٹ کے لیک ہوتے ہوئے فیول کی بو سے بھرا ہوا ہے۔ میرے

لڑکے نائلون کے جال سے بنی نشستوں پر ٹانگیں پھیلائے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں تاکہ ان کی وردیوں کی استری شدہ کریز خراب نہ ہو۔ انھوں نے اپنی پی کیپ پلاسٹک کے تھیلوں میں رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان پر موجود سنہری دھاگے سے سلے پاک فضائیہ کے نشان کی چمک برقرار رہے۔ جب سے جہاز نے ٹیک آف کیا ہے عُبید کا سر ایک چھوٹی سی کتاب میں دفن ہے۔ میں اُس کے سرورق پر نگاہ ڈالتا ہوں؛ اس پر ایک موٹی سی عورت کی فُحش سی تصویر بنی ہے، عنوان کا کچھ حصّہ عُبید کے ہاتھ نے ڈھانپ رکھا ہے۔ میں صرف '۔۔۔ ایک پیش گفتہ موت کی' کے ہی الفاظ پڑھ سکتا ہوں۔

'یہ کیا ہے؟' میں اس کے ہاتھوں سے کتاب کھینچ لیتا ہوں، پہلے صفحے پر نظر ڈالتا ہوں اور پہلا جملہ پڑھتا ہوں۔

'تو کیا نصر واقعی مر گیا؟'

'میرا یہی خیال ہے۔'

'یہ تو یہاں اس پہلے ہی جملے میں لکھا ہے۔ اسے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے جب تمھیں پہلے سے ہی پتا چل گیا ہے کہ ہیرو مر جانے والا ہے۔'

'یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مرتا کیسے ہے۔ اس کے آخری الفاظ کون سے ہوں گے۔ اسی طرح کی چیزیں۔'

'تم ایک انحرافی ہو، کامریڈ۔' میں کتاب دوبارہ اس کی طرف پھینکتا ہوں۔

'ریہرسل کے بارے میں کیا خیال ہے؟' میں ایسی آواز میں چلّاتا ہوں جو جہاز چلنے کی آواز کے باوجود سنائی دے سکے۔

میرا اسکواڈ تکان زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ عُبید مُنھ ہی مُنھ میں مجھے گالی دیتا ہے۔ وہ سب ڈھیلے ڈھالے انداز میں کیبن کے وسط میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ یہ سب دل سے نہیں کر رہے۔ ایک ایسے جہاز کا بد بُو دار کیبن، جسے حال ہی میں بیمار جانوروں کو لے جانے کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور جو تیس ہزار

فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا ہو، ہماری ٹیپ ٹاپ سے بھرپور ڈرل روٹین کے لیے کوئی بہترین جگہ نہیں۔ لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ درجۂ کمال حاصل کرنے کا شوق کسی آئیڈیل ماحول کے ملنے کا انتظار تو نہیں کر سکتا نا۔

ہم بندوق سے مارے جانے والے سلیوٹ کے وسط میں تھے جب جہاز میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ میں کھڑا ہو جاتا ہوں اور ان کے ردِّعمل دیکھنے لگتا ہوں۔ بلندی میں یک لخت گراوٹ اور اس کے بعد ائرکرافٹ میں پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ کے باوجود میرے لڑکے اپنی بندوقوں کے ساتھ اپنی پوزیشنیں برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ میں اپنی تلوار کا دستہ اپنے ہونٹوں کے قریب لاتا ہوں، تلوار کی نوک انکل سٹارچی کے شہد سے اسٹیل بلیو کلر کی ہو چکی ہے، اور اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عُبید مجھے سیدھا رکھنے کی کوشش میں اپنا بازو میری کمر کے گرد کر دیتا ہے۔ لوڈ ماسٹر جہاز کے پچھلے حصے سے چلّاتا ہے۔ 'بیٹھ جاؤ، پلیز۔ سٹ ڈاؤن۔ ہم اب لینڈ کرنے ہی والے ہیں۔'
جہاز اترنا شروع کر دیتا ہے۔ میرے اندر بجتی ہوئی جلترنگ مجھے بتاتی ہے کہ میرا مشن تو اب شروع ہوا ہے۔ میری زہر میں بجھی ہوئی تلوار مجھے بتاتی ہے کہ وہ تیار ہے۔

ایک بغیر نمبر پلیٹ والی ٹویوٹا کرولا نے راول پنڈی سے اپنا سفر اس ارادے کے ساتھ شروع کیا کہ بہاول پور تک پانچ سو تیس میل کا سفر ساڑھے پانچ گھنٹے میں طے کر لے۔ جن لوگوں کا بھی اس کار یا اس کے جنونی ڈرائیور سے سامنا ہوا انھیں یقین ہو گیا کہ ڈرائیور اگلے دس میل تک زندہ نہیں بچے گا۔ کار آوارہ کُتّوں کو نیچے دیتی اور مضافات کے کوڑے کے ڈھیروں کی طرف جاتے ہوئے گایوں کے ریوڑوں کو توڑتی تاڑتی چلی گئی۔ یہ شہروں کے پُرہجوم جنکشنوں سے زوم کر کے گزری اور اس نے دلیر ترین ٹرک ڈرائیوروں کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ انھیں پیچھے بھی چھوڑ دیا۔ یہ کار زیبرا کراسنگ پر انتظار کرتے ہوئے بچّوں کے لیے نہیں رکی، اس نے سست رفتار گھوڑا گاڑیوں پر اپنے ہارن بجائے،

اس نے پبلک ٹرانسپورٹ کی بسوں کو دائیں بائیں سے پیچھے چھوڑا، ریلوے پھاٹکوں کو پار کرنے کا خطرہ مول لیا اور جہاں سڑک جام نظر آئی وہاں فٹ پاتھوں پر چڑھ دوڑی۔ محصول چونگی وصول کرنے والے ایک انسپکٹر نے اس کا بے کار میں پیچھا کیا، سڑکوں کی استرکاری کرنے والے مزدوروں نے اسے گالیاں دیں۔ ایک پٹرول اسٹیشن پر یہ پٹرول بھروانے کے لیے کھڑی ہوئی اور بغیر پیسے دیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ کار کا ڈرائیور واضح طور پر جلدی میں تھا۔ بہت سے لوگ، جنھوں نے اس کار کو اپنے پاس سے زن سے گزرتے دیکھا، یقین رکھتے تھے کہ اسے چلانے والا خودکشی پر مائل ہے۔ وہ غلط تھے۔
خودکشی پر مائل ہونا تو درکنار، میجر کیانی تو زندگیاں بچانے کے مشن پر تھا۔
اس نے وی آئی پی پوڈ کی آخری جھاڑ پونچھ کی بہ ذاتِ خود نگرانی کی تھی اور اس کی ائرکنڈیشننگ ڈکٹ میں ائر فریشنر لگایا تھا۔ وہ وہیں تھا جب ایک کرین کی مدد سے پوڈ اُٹھایا گیا اور اسے سی ون تھرٹی کے پچھلے ریمپ سے اس کے ڈھانچے میں داخل کیا گیا اور پھر پاک فضائیہ کے ٹیکنیشن کی مدد سے کیبن کے فرش کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ جب جنرل ضیا کا قافلہ آنا شروع ہو گیا تو اسے وی آئی پی ایریا چھوڑنا اور اپنے دفتر کو رخصت ہونا پڑا؛ اپنی نئی جاب میں اسے ریڈ کارپٹ کے اردگرد ہونے کے لیے سیکیورٹی کلیئرنس نہیں ملی تھی۔

پاک ون کے راول پنڈی کے ملٹری ائرپورٹ سے بہاول پور کے لیے پرواز کر جانے کے بعد ہی میجر کیانی کو موقع ملا کہ اپنے پاؤں میز پر رکھ کر ڈن ہل کا سگریٹ جلائے اور پاک ون کی روانگی سے پہلے اپنی میز پر چھوڑی ہوئی ایک فہرست کو بس یوں ہی سا دیکھے جس میں جہاز کے مسافروں کے نام درج تھے۔ جب اس نے جنرل ضیا کے نام کے نیچے ہی جنرل اختر کا نام دیکھا تو اس کے پیر اچانک میز سے نیچے آ رہے۔ زیادہ تر گھاگ انٹیلی جینس آپریٹروں کی طرح وہ یہ سمجھتا تھا کہ بندے کو اتنی ہی معلومات ہونی چاہئیں جتنی اسے ضرورت ہوں۔ یقیناً جنرل اختر جانتا ہوگا کہ کب پاک ون پر سوار ہونا ہے اور کب

اس پر سے اتر جاتا ہے؛ ایک وسیع تر پس منظر ہمیشہ جنرل اختر کے پیش نظر رہا کرتا تھا۔ فہرست میں اٹھارہ نام دیکھنے کے بعد، جو فوجی عہدے کی سنیارٹی کی ترتیب سے لکھے تھے، اس نے پہلا سویلین نام دیکھا۔ امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافیل۔ وہ اپنی سیٹ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ امریکی سفیر اپنے سیسنا طیارے کے بجائے پاک ون پر سفر کیوں کر رہا ہے؟

خوف ہی تو میجر کیانی کا کاروبار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسروں کو اس کا راشن کیسے پہنچایا جا سکتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ اس سے حفاظت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اب اُسے جس قسم کا خوف محسوس ہو رہا تھا وہ مختلف تھا۔ وہ پھر سے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اسے احساس ہوا کہ اس کا پچھلا سگریٹ ابھی تک ایش ٹرے میں پڑا سلگ رہا ہے۔ کیا جنرل اختر کی جانب سے خود کو دی جانے والی ہدایات سمجھنے میں اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی؟

اسے اس بات کا احساس کرنے میں مزید آٹھ منٹ اور ڈن ہل کے تین سگریٹ لگے کہ اس کے پاس آپشن محدود ہیں۔ وہ کوئی ایسی فون کال نہیں کر سکتا تھا جس کے نتیجے میں اس کا اپنا نام ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کا حصہ بن جائے، کوئی ایسا سیکیورٹی الرٹ نہیں تھا جو وہ جاری کر دیتا اور اس کے نتیجے میں وہ خود نہ پھنس جاتا۔ وہ بس یہی کر سکتا تھا کہ جب پاک ون اپنی واپسی کی پرواز کرنے والا ہو تو وہ وہاں پر بہ ذاتِ خود موجود ہو۔ اسے وہاں پہنچنے اور جنرل ضیا سے بات کرنے کی ضرورت تھی، اس سے پہلے کہ ضیا اس جہاز پر پھر سے بیٹھ جاتا۔ اگر جنرل اختر پاک ون کے ساتھ کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ داخلی سلامتی کا مسئلہ تھا۔ لیکن اگر جنرل اختر ایک ایسے جہاز کو گرانے کا منصوبہ بنا رہا تھا جس میں امریکی سفیر بھی سوار ہو تو یقیناً یہ قوم کی بقا کے لیے ہی ایک خطرے کی بات تھی اور یہ اس کا فرض تھا کہ ایسا ہونے سے روکے۔ میجر کیانی نے محسوس کیا کہ اگست کے اس پر امن دن اور تیسری عالمی جنگ کے درمیان صرف وہی ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس نے مسافروں کی فہرست پر ایک مرتبہ پھر نظر دوڑائی اور سوچنے لگا کہ جہاز پر اور کون کون ہو سکتا ہے۔ ہو

سکتا ہے سبھی ہوں، اس نے سوچا، ہو سکتا ہے کوئی بھی نہ ہو۔

ایسے دانش ورانہ تکے لگانے کے لیے وقت پہلے ہی نکل چکا تھا۔

کمرشل فلائٹس پر جلدی میں ایک نظر ڈالنے سے کسی قریبی شہر سے جہاز پکڑنے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ اس نے کچھ فون کالیں کر کے پاک فضائیہ کا کوئی جہاز پکڑنے کا سوچا، لیکن اس کے لیے کسی جنرل کی اجازت کی ضرورت پڑتی اور وہ اسے کسی صورت بہاول پور پر لینڈ کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس نے اپنی کرولا گاڑی کی چابیاں اُٹھائیں اور دروازے کی جانب دھم سے جا ہی رہا تھا جب اس نے اپنے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس پتا تھا کہ اسے اپنی وردی پہننا ہوگی۔ کوئی سویلین آدمی راستے میں ایک درجن مرتبہ روکے جانے کے بغیر اتنی لمبی ڈرائیو نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد جنرل ضیا کے سیکیورٹی حصار سے گفت وشنید کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ وردی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کاغذات کی الماری سے ایک وردی نکالی۔ وہ استری شدہ اور اکڑی ہوئی تھی مگر اس پر دھول کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ آخری مرتبہ کب پہنی تھی۔ اس کی خاکی پتلون بہت زیادہ اکڑی ہوئی تھی اور اس کی کمر کے گرد اس کا بند ہونا ناممکنات میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی پتلون کا زپ بٹن کھلا رہنے دیا اور اس کارروائی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی خاکی شرٹ باہر نکال لی۔ اس نے الماری سے اپنے دھول میں اٹے آکسفورڈ شوز نکالے لیکن پھر سوچا کہ وقت نکلا جا رہا ہے اور کار میں کوئی ویسے بھی اس کے پیر نہیں دیکھنے والا۔ اس نے اپنے پنجوں کی جانب سے کھلے پشاوری چپل ہی پہنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا ہولسٹر اُٹھانا نہیں بھولا۔ اس نے آئینے میں خود پر ایک آخری نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر مسرور ہوا کہ اس کی وردی کے فٹ نہ ہونے کے باوجود، اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے بالوں سے اس کے کان بھی ڈھکے ہوئے تھے اور پھر اس کی پشاوری چپلوں کے باوجود کوئی بھی جلدی میں اسے فوج کے ایک میجر کے بجائے کچھ اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔

۳۱

جنرل ضیا اپنی دوربین سے ریت کے ٹیلوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور ٹینکوں کی مشق شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا، جب اس نے ریت کی چمک دار وسعت پر ایک پرندے کا سایہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی دوربین ہٹائی اور پرندے کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن افق تا حد نگاہ خالی اور نیل گوں تھا، سوائے اس سورج کے جس کی بھڑکتی ہوئی سنہری تھالی اس سے بھی نیچے آ چکی تھی جتنا کسی فلکیاتی سیارے کو آنا چاہیے۔ جنرل ضیا ایک صحرائی کیموفلاج ٹینٹ کے نیچے بیٹھا تھا اور اس کے ایک طرف امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور دوسری طرف وائس چیف آف آرمی اسٹاف جنرل بیگ اپنی نئی تھری اسٹار والی پٹیوں اور رنگین سن گلاسز کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جنرل اختر کچھ دور کھڑا تھا، اس کی دوربین ابھی تک اس کی گردن میں لٹک رہی تھی اور وہ اپنی اس مہاگنی کی چھڑی سے کھیل رہا تھا جو اس نے اپنی ترقی کے بعد سے رکھنا شروع کر دی تھی۔ ان کے پیچھے ٹو اسٹار جرنیلوں کی قطار تھی، بکتر بند کور کے فارمیشن کمانڈر تھے اور بیٹری سے چلنے والے پیڈسٹل فین تھے جو اگست کی اس مرطوب فضا میں سکون پہنچانے کے بجائے چھوٹا سا صحرائی طوفان سا اُٹھائے ہوئے تھے۔ ٹینٹ انھیں کم از کم سورج سے محفوظ رکھ رہا تھا جبکہ سورج مشق کے اس ایریا میں آب و تاب سے چمک رہا تھا جس کی سرخ جھنڈوں سے حدبندی کی گئی تھی، اور سورج نے اس علاقے کو ریت کے ایک چمک دار اور بے حس و

حرکت سمندر میں تبدیل کر رکھا تھا۔ ٹینک بنانے والوں کی طرف سے فراہم کردہ چمڑے کے کیس میں بند دوربینیں آنکھوں سے لگائے، جرنیلوں نے ایم ون ابرام کی خاکی بیرل کو ریت کے ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ جنرل ضیا نے یہ بات دلچسپی سے نوٹ کی کہ ٹینک کو ابھی سے پاک فوج کے ہلکے سبز رنگ سے پینٹ کیا جا چکا تھا۔ کیا یہ کوئی فری نمونہ ہے، اس نے سوچا، یا دفاعی خریداری کے محکمے میں کسی بے قرار جرنیل نے اس کے لیے پہلے ہی سے چیک لکھ دیا ہے؟

ایم ون ابرام نے جنرل کو سلیوٹ کرنے کے لیے اپنی بیرل نیچے کی اور تلاوتِ کلامِ پاک کے احترام میں جھکائے رکھی۔ بکتر بند کور کے ایک امام نے ان مواقع کے لیے جنرل کی ایک پسندیدہ آیت منتخب کر رکھی تھی: وَاَعِدُّوْا لَـهُـمْ مَّا اسْتَطَعْتُـمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِـمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَـهُـمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُـمْ ۚ[1]

اپنی دوربین نیچے کرتے ہوئے جنرل ضیا نے اپنی آنکھیں موند کر تلاوتِ کلامِ پاک سماعت کی اور اس دوران ٹک بکس کی شرح گنتا رہا۔ جیسے ہی تلاوت ختم ہوئی وہ جنرل بیگ کی جانب مڑا اور ان ٹینکوں کے لیے ادائیگی کے بارے میں مشورہ کرنے لگا۔ اس نے جنرل بیگ کے سن گلاسز میں اپنے چہرے کو مڑا تڑا ہوا پایا۔ جنرل ضیا کو یاد نہیں تھا کہ جنرل بیگ کو اپنا نائب بنانے اور فوج کی کمان عملی طور پر اس کے حوالے کرنے سے پہلے اس نے جنرل بیگ کو کبھی وہ سن گلاسز پہنے دیکھا ہو۔ جب جنرل ضیا اسے اس کے نئے دفتر کے پہلے دن مبارک باد دینے گیا تھا تو جنرل بیگ نے یہی سن گلاسز پہنے ہوئے

---

[1] (آیت ساٹھ، سورۃ الانفال)

ترجمہ: اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمھارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی۔ ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری

اس کا استقبال کیا تھا، اگر چہ اس روز اسلام آباد پر بادل چھائے ہوئے تھے؛ ایک اور ثبوت، اگر ثبوت کی ضرورت تھی کہ طاقت بندے کو بدعنوان کر دیتی ہے۔ جنرل ضیا کو جنرل بیگ کے سن گلاسز سے چڑ تھی لیکن ابھی تک اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کوئی بہانہ اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ شاید یہ یونی فارم کوڈ کی خلاف ورزی تھی۔ اس سے زیادہ بری بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ وہ ویسٹرن اور فحش سا لگتا، کسی اسلامی جمہوریہ کے کمانڈر ان چیف کے بجائے ہالی ووڈ کے کسی جرنیل کی طرح۔ اور پھر ان کے باعث جنرل ضیا اس کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جنرل اختر نے ان دونوں کو اتنے شدومد کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دیکھا تو اس کا عزم مزید پختہ ہو گیا۔ جیسے ہی مشق ختم ہوگی وہ کوئی بہانہ بنائے گا اور اپنے سیسنا طیارے میں اسلام آباد نکل جائے گا۔ لگتا تھا جیسے جنرل ضیا کو یہ بات بھول ہی گئی ہو کہ اس نے اپنی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو بھی بلا رکھا ہے۔ لگتا تھا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے 'بھائی اختر' سے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کے بارے میں مشورہ کرنے کی خواہش کی تھی۔ اگر یہ کوئی امتحان تھا تو جنرل اختر اس میں کام یاب ہو گیا تھا۔ اب اسے جنرل ہیڈ کوارٹر کے قریب، قومی ٹیلی ویژن اسٹیشن کے قریب، اپنی سیاہ شیروانی کے قریب رہنے کی ضرورت تھی۔ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں اسے قوم سے خطاب کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ شیڈول سے باہر اس دورے نے اس کے پلان میں گہرائی کی ایک اور پرت کا اضافہ کر دیا تھا۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ جان بوجھ کر اسلام آباد میں رکا رہا تھا۔ وہ یہی کہیں گے کہ وہ خوش قسمت رہا کہ دوپہر کے کھانے کے لیے گیریژن میس میں نہیں رکا۔ وہاں جاری کارروائی سے اپنی توجہ ہٹانے کے لیے وہ قوم سے اپنے خطاب کی خاموشی سے ریہرسل کرنے لگا۔

جنرل بیگ کی جانب سے ٹینکوں کی پے منٹ سے متعلق طویل جواب سننے کے دوران جنرل ضیا نے اپنے ذہن میں یہ بات نوٹ کر لی کہ ٹینکوں کی مشق کے بعد وہ ان

سن گلاسز کے مسئلے کو تو ایک مرتبہ حل کر کے ہی رہے گا۔ جنرل بیگ اب بھی ٹینکوں کے مجوزہ سودے اور امریکا کی فوجی امداد کے درمیان بہ راہِ راست تعلق کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا اور یہ کہ یہ سارا معاملہ پاک امریکا دفاعی معاہدے کے تحت حصولِ امداد کے مقاصد کی ذیل میں آتا ہے۔ اسی دوران ٹینک نے پہلا گولہ داغ دیا۔

جنرل ضیا نے اس کی گفتگو جملے کے درمیان میں ختم کر دی، دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی اور افق کا نظارہ کرنے لگا۔ اسے ریت کی ایک دیوار کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنی دوربین پھر سے ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کی اور جب ریت بیٹھ رہی تھی تو اس نے ایک سرخ بینر دیکھا، بستر کی سنگل بیڈشیٹ جتنا، جس پر ایک بڑی سی ہتھوڑی اور درانتی بنی ہوئی تھی، اور جو ٹارگٹ کی پریکٹس کرنے والی ایک ریموٹ کنٹرول گاڑی کے اوپر لہرا رہا تھا اور وہ گاڑی ایسے لگ رہی تھی جیسے وہ کوئی گولف کارٹ ہو جس پر کوئی اشتہاری بینر لگا ہوا ہو۔ لگتا تھا کہ ایم ون ابرام اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جنرل ضیا نے آرنلڈ رافیل کی طرف دیکھا جو اپنی آنکھوں سے دوربین چپکائے ابھی تک افق کو بڑی رجائیت سے دیکھ رہا تھا۔ جنرل ضیا اسے یہ لطیفہ سنانا چاہتا تھا کہ ٹینک کمیونسٹوں کا کوئی ہم درد لگتا ہے لیکن سفیر نے اس جانب دیکھا ہی نہیں۔ ٹارگٹ پریکٹس کے لیے تیار دوسری گاڑیاں بھی ریت کے ٹیلوں سے اترنا شروع ہو گئیں، جن پر دوسرے ٹارگٹ لگے ہوئے تھے: ایک ڈمی انڈین مگ فائٹر جیٹ، لکڑی سے بنی ہوئی ایک گن بیٹری جس پر گلابی رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا، کارڈ بورڈ سے بنایا ہوا ایک بنکر جس میں ڈمی سپاہی چھپے ہوئے تھے۔

ایم ون ابراہم کی توپ نے مزید نو گولے داغے اور کوئی بھی گولہ نشانے پر نہ لگانے میں کام یاب رہی۔ ٹینک اب مشاہدہ کرنے والوں کے ٹینٹ کی جانب مڑا اور اپنی بیرل ایک بار پھر نیچے کر لی، آہستگی سے، جیسے وہ اتنی جدّ و جہد کے بعد تھک سا گئی ہو۔ تمام جرنیلوں نے سلیوٹ کیا، سفیر نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔ ایم ون ابرام واپس

مڑا اور ایک ریت کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والی ٹارگٹ گاڑیاں، جن پر ڈمی ٹارگٹ اب بھی ویسے کے ویسے موجود تھے، ریت کے ٹیلے کے نیچے قطار بنا کر کھڑی ہونا شروع ہو گئیں۔ ٹیلے کے پیچھے سے صحرائی ہوا کا ایک مرغولہ سا اُٹھا اور ریت کا ایک مدوّر ستون رقص کرتا ہوا مشاہدہ کاروں کے ٹینٹ کی جانب بڑھا۔ سب نے اپنے چہرے پیچھے کر لیے اور انتظار کیا کہ یہ مرغولہ گزر جائے۔ جب انھوں نے ریت کو اپنی ٹوپیوں پر ہٹاتے اور وردیوں پر سے جھاڑتے ہوئے اپنے چہرے پھر سے سامنے کی جانب کیے تو جنرل ضیا نے سرخ بینر کو گاڑی پر موجود اپنے پلیٹ فارم سے لڑکھڑا کر گرتے اور ریت کے ٹیلے پر دور اُڑتے ہوئے جاتے دیکھا۔ آرنلڈ رافیل پہلی مرتبہ گویا ہوا۔ 'ویل، ہم نے اس کو تو جا ہی لیا۔ ہماری فائر پاور سے نہ سہی اس اشتراکیت مخالف صحرائی طوفان ہی سے سہی۔'

زبردستی کا ایک قہقہہ سنائی دیا جس کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس کے دوران سب نے صحرائی ہواؤں کی ہلکی لیکن یقینی دہاڑ سنی۔ جنرل بیگ نے بڑے غیر فطری انداز سے اپنے سن گلاسز اتار لیے۔ 'ایک اور مشق باقی ہے، سر۔' اس نے ایک ڈرامائی توقف کرتے ہوئے کہا۔ 'دوپہر کا کھانا۔ اور اس کے بعد موسم کے مزے دار ترین آم۔' اس نے لکڑی کے کریٹوں سے بھرے ہوئے ایک فوجی ٹرک کی جانب اشارہ کیا۔ 'آل پاکستان مینگو فارمرز کوآپریٹو کا ایک تحفہ۔ اور آج کے لنچ کے لیے ہمارے میزبان ہیں جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے انتہائی قابلِ احترام چیئرمین جنرل اختر۔'

۳۲

تازہ کی گئی سفیدی سے آراستہ گیریژن میس اور اس کے سامنے فٹ بال کے میدان جتنے لان کے درمیان شارعِ شُہدا چیختے ہوئے سائرنوں اور کلاشنکوف بردار کمانڈوز سے بھر چکی ہے جو کھلی چھت کی جیپوں سے کبھی اچھل کر اترتے ہیں اور کبھی ان میں کود کر سوار ہوتے ہیں۔ ہر جرنیل جس کے کاندھے پر دو یا دو سے زیادہ ستارے ہیں، اپنے الگ محافظوں کے ہم راہ ہے اور اس کی پیشوائی کے لیے اس کا ذاتی سائرن گیت موجود ہے، جیسے یہ موقع ان کے اپنے ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کا نہ ہو بلکہ کوئی گلیڈی ایٹر پریڈ ہو جس میں اس آدمی کو فتح یاب ہونا ہو جس کے پاس سب سے زیادہ ہیبت ناک محافظ ہوں اور جس کا سائرن سب سے زیادہ چنگھاڑ سکتا ہو۔ گیریژن کمانڈر شاید پُر تپاک استقبال کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ ہر وہ شے جو حرکت نہ کر سکتی ہو اس پر سفیدی پھیر دی جائے۔ میس کے سامنے لان میں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے جو فٹ پاتھ بنایا گیا ہے اس پر بھی سفیدی پھیری جا چکی ہے، لکڑی کے بینچوں پر سفید پینٹ کر دیا گیا ہے، بجلی اور ٹیلے فون کے کھمبے سفید کیے جا چکے ہیں، حتیٰ کہ کیکر کے اس اکیلے درخت کے تنے پر بھی سفیدی پھر دی گئی تھی جس کے نیچے میں نے اپنے سائلنٹ ڈرل اسکواڈ کو قطار بنوا کر کھڑا کیا تھا۔

چیختے ہوئے سائرنوں اور چمکتی ہوئی کلاشنکوفوں کے اس اوپیرا میں کسی کو سڑک کے

ایک کونے پر کھڑے کیڈٹوں کی پروا نہیں لگتی۔ میرے لڑکے اپنی جی تھری رائفلوں کے سہارے کھڑے ہیں اور نظر بچا کر اپنی کڑک خاکی وردیوں کے نیچے پسینے سے گیلے جسموں پر خارش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے ٹرک سے اترنے کے فوراً بعد گیریژن کمانڈر میرے پاس آیا۔ اتنے بڑے موقع کی عظمت اس پر حاوی تھی۔ 'میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا وقت تو نہیں ہے لیکن جنرل اختر نے اس کی فرمائش کی تھی۔' اس نے میرے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'کیا آپ اسے مختصر رکھ سکتے ہیں؟' میں نے اسے بات سمجھنے والی مسکراہٹ سے دیکھا اور کہا، 'ڈونٹ وری، سر۔ ہم انھیں زیادہ انتظار نہیں کرائیں گے۔'

اگر کوئی شخص ہمیں دیکھ کر واقعی خوش ہے تو وہ ہے ملٹری بینڈ فارمیشن کا بینڈ ماسٹر۔ اس کا بینڈ زرق برق لباس پہنے آدمیوں کی تین قطاروں پر مشتمل ہے جو میس کے سامنے منی کیور کیے ہوئے لان کے وسط میں کھڑے ہیں۔ کچھ دیر میری طرف دیکھنے کے بعد وہ اپنی سنہری پرت والی چھڑی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے۔ اس کا ٹارٹن ڈبلٹ اس کے پیچھے لکیر بناتا ہوا اور اس کی بیرٹ ٹوپی پر ایک نقلی سرخ پر لرزتا ہوا۔ جب میں اسے بتاتا ہوں کہ ہمیں اپنی پرفارمنس کے لیے اس کے بینڈ کی مدد نہیں چاہیے ہوگی تو بے یقینی سے اس کا چہرہ لٹک سا جاتا ہے۔

'تم لوگ کسی بیٹ کے بغیر مارچ کیسے کرو گے؟'

'ہماری ڈرل سائلنٹ ہے۔ اس میں میوزک کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور ویسے بھی ہم مارچ نہیں کریں گے۔'

'تم یہ سب خاموشی سے کر سکتے ہو لیکن ان لڑکوں کو ٹائمنگ برقرار رکھنے کے لیے ہمارے ڈرم کی ضرورت پڑے گی۔ اس سے ڈرل میں خوب صورتی آ جائے گی۔' اس کے پروں، ٹارٹن ڈبلٹ اور بونٹ کے باوجود اس کا چہرہ خشک ہے۔ اس پر پسینے کی ایک بوند بھی نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

میں اپنا سر نفی میں ہلاتا ہوں۔ 'رائفل کا سلیوٹ ہوگا بس۔ کوئی کمانڈ نہیں دی جائے گی۔' میں اسے پھر سے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ 'صدر صاحب سلیوٹ لیں گے اور اس دوران آپ کے آدمی آرام کر سکتے ہیں۔' وہ تلوار کے دستے پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو غور سے دیکھتا ہے جس پر سفید دستانہ چڑھا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے آگے میرے لڑکوں کی طرف دیکھتا ہے جو اپنے جوتوں میں اپنے پنجے ہلا جلا رہے ہیں تاکہ ان کا دورانِ خون درست رہے۔ پھر وہ اپنا سر ہلاتا ہے۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھتا ہے جیسے کہ میں نے سائلنٹ ڈرل کا سارا قصہ اسے نوکری سے نکلوانے کے لیے خود سے گھڑا ہو۔ پھر وہ مارچ کرتا ہوا واپس جاتا ہے اور اپنی چھڑی ہوا میں لہرا کر اپنے بینڈ کو سگنل دیتا ہے کہ وہ بجانا شروع کر دے۔ وہاں ہم سے زیادہ قابلِ ترس بس وہی ہیں۔ ان کے کاندھوں پر سے لباس پردوں کی طرح لٹک رہے ہیں، ان کے بیگ پائپ پر مخمل چڑھا ہوا ہے اور ان کے پیتل کے ڈرم پالش کیے ہوئے اور اتنے چمک دار ہیں کہ بغیر آنکھیں میچے انھیں دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ بینڈ بجائے جاتے ہیں، سورج کی تمازت کے باوجود، کمانڈوز کی پر شور آنیوں اور جانیوں کے باوجود جو اپنی جیپوں میں کبھی چھلانگ لگا کر سوار ہوتے ہیں کبھی ان پر سے کود کر اترتے ہیں اور جن کی بندوقیں خالی افق کی جانب نشانہ باندھے ہوئے ہیں؛ وہ بینڈ بجائے جاتے ہیں جیسے انھوں نے سفیدی پھری ہوئی گیریژن میس اور اس کے سامنے سفیدی پھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے زیادہ داد دینے والے سامعین کبھی نہیں پائے ہوں۔

میری تلوار کا دستہ میرے سفید دستانے کے اندر جلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ ریت کی ایک نرم تہ میرے جوتوں پر بیٹھ چکی ہے۔ میں اپنے اسکواڈ کا آخری مرتبہ جائزہ لیتا ہوں۔ لڑکے اپنی پی کیپ سے نکلتے پسینے کے باوجود الرٹ کھڑے ہیں جو ان کے رخساروں پر دوڑ رہا ہے۔ ان کی جی تھری رائفلوں کے لکڑی کے دستے شاید اب ان کے ہاتھوں کے گوشت میں ہی ضم ہو رہے ہیں۔ ہم کیکر کے ایک درخت کے سائے تلے ہیں، لیکن اس کا

سفیدی پھرا ہوا تنا اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا کہ اُس پر پتّوں سے زیادہ کانٹے اُگے ہوئے ہیں۔ اس کا سایہ کنکریٹ کے اس فرش پر خشک شاخوں کا ایک جال سا بُن دیتا ہے جس پر ہماری ڈرل کے لیے پہلے ہی سے سفید لکیریں لگائی جا چکی تھیں۔ عُبید آنکھ میچ کر اوپر دیکھتا ہے۔ میں یہ دیکھنے کے لیے اوپر دیکھتا ہوں کہ شاید وہ کسی آتے ہوئے بادل کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ کوئی نہیں۔ مجھے بس ایک کوّا دکھائی دیتا ہے جو ایک شاخ پر بیٹھا اپنی چونچ پروں میں دبائے اونگھ رہا ہے۔

گیریژن میس کے اندر دوپہر کا کھانا لگ رہا ہے۔ بریگیڈیئروں اور جرنیلوں نے میس کے داخلی دروازے کے سامنے قطار بنا لی ہے اور ان کے کمانڈوز نے ملحقہ عمارتوں کی چھتوں پر پوزیشنیں سنبھال لی ہیں۔ بینڈ ماسٹر اپنے آدمیوں پر بے صبری سے ہوا میں چھڑی چلاتے ہوئے شاید انھیں یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایک ہی موسیقی بار بار بجائیں۔ وہ اپنی چھڑی ہوا میں پھینک دیتا ہے، اسے پھر سے تھامتا ہے اور مجھے فاتحانہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

جنرل ضیا، لگتا یہ ہے کہ، راستے میں ہے۔

میں سائرنوں کے رونے کی آواز سنتا ہوں جس کے بعد مجھے سفید یاماہا موٹر سائیکلوں پر سوار دو آدمی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سفید ہیلمٹ پہن رکھے ہیں اور ایک دوسرے کے متوازی چل رہے ہیں۔ شاید جنرل ضیا کا کانوائے ان کے پیچھے ہے مگر مجھے تو بس ریت کا ایک کے بعد دوسرا مرغولہ رقص کرتا نظر آ رہا ہے؛ ایسا لگتا ہے کہ طوفان ان موٹر سائیکل سواروں کا پیچھا کر رہا ہے۔ اپنے پیچھے آنے والے ان مرغولوں سے بے نیاز وہ دونوں سوار اپنی موٹر سائیکلیں چلاتے گیریژن میس کے مرکزی دروازے تک آتے ہیں اور پھر بڑے کمال کے ساتھ علاحدہ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمت ڈرائیو کرتے ہیں جبکہ ان کے سائرنوں کا گلا ایک اونچے سُر پر گھٹ جاتا ہے۔ جیپوں کا کانوائے اس ریت میں سے دھیرے سے ابھرنے لگتا ہے جو اب غصّے کی لہروں کی صورت ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ سب سے پہلے کھلی چھتوں والی جیپیں پہنچتی ہیں جن

کے سائرن کی آواز بہت اونچی ہے۔ ہوا اور سائرن کی چیخیں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں، اور جب کوئی جیپ گیریژن میس کے دروازے پر پہنچتی ہے تو اس کا سائرن خاموش ہو جاتا ہے۔ جیپوں کے پیچھے دو کنورٹیبل سیاہ لیموزین آتی ہیں؛ ان میں موجود کمانڈوز ایک اور ہی نسل سے تعلّق رکھتے محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے جنگی لباس پہن رکھا ہے اور ان کی بیرٹ ٹوپیاں سرخ رنگ کی ہیں۔ وہ گاڑیوں میں اپنی بندوقیں گود میں لیے نہیں بیٹھے ہوئے، ان کی باہر نکلی ہوئی اوزی گنیں ہمارا، بینڈ کا اور ریت کے ناچتے ہوئے بگولوں کا نشانہ باندھ رہی ہیں۔ ان کے پیچھے تین سیاہ مرسیڈیز آ رہی ہیں جن کی کھڑکیوں پر غلاف کی پرتیں مڑھی ہوئی ہیں: ان میں سے پہلی پر ایک امریکی اور ایک پاکستانی پرچم لگا ہوا ہے، دوسرے پر ایک جھنڈا ہے جس میں پاکستان کی تینوں مسلح افواج کے لوگو لگے ہیں اور تیسری پر ایک جانب پاکستانی پرچم اور دوسری جانب چیف آف آرمی اسٹاف کا جھنڈا لگا ہے۔ تیسری مرسیڈیز کی کھڑکی کی غلافی پرت سے میں بڑے بڑے سفید دانتوں، جیٹ بلیک مونچھوں اور ایک ہاتھ کی جھلک دیکھتا ہوں جو وہ کنکریٹ پر ناچتے ہوئے مرغولوں کو دیکھ کر ہلا رہا ہے۔ شاید اسے اس کی عادت ہے، میں اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ کو مضبوطی سے جماتے ہوئے خود کو بتاتا ہوں۔ اچانک وہ دستہ مجھے گرم محسوس ہونا بند کر دیتا ہے۔ ارے، وہ تو دھات کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں محسوس ہو رہا۔ وہ میرے ہاتھ ہی کی ایک توسیع لگتا ہے۔ میرا اپنا خون دھات کی اس دھار کے اندر بہنے لگا ہے۔

گیریژن میس کے داخلی دروازے پر تھوڑی بہت پریشانی کی صورتِ حال ہے۔ سفید پگڑی میں ایک ویٹر دروازہ کھولتا ہے اور ایک سیکنڈ کے لیے مجھے شک گزرتا ہے کہ صحرائی طوفان نے جنرل کو قائل کر لیا ہے کہ ڈرل منسوخ کر دی جائے، لیکن دروازہ پھر سے بند ہوتا ہے۔ ہم کمانڈوز کے ایک جتھے کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں جن کے پیچھے پیچھے تین جرنیل آ رہے ہیں۔

ان کے دائیں بائیں جو لوگ ہیں ان سے مجھے کوئی واسطہ نہیں۔

بینڈ ماسٹر کی چھڑی ہوا میں لہراتی ہے اور اس کا بینڈ ایک فلمی گیت بجانا شروع کر دیتا ہے: آج موسم بڑا بئی مان ہے۔ بڑا بئی مان ہے۔ آنے والا کوئی طوفان ہے۔ آپ اس بینڈ ماسٹر پر چھوڑ دیجیے، میں خود سے کہتا ہوں، یہ آدمی موسم کے حساب سے ساری دھنیں جانتا ہے۔ جنرل ضیا بھی اس کے موسیقی کے ذوق کا معترف لگتا ہے۔ میرے اسکواڈ کی جانب مارچ کرنے کے بجائے جنرل ضیا بینڈ کی جانب رُخ کرتا ہے۔ بینڈ ماسٹر کی چھڑی ہوا میں مجنونانہ سرسالٹ کرتی ہوئی نیچے آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی موسیقی بھی بند ہو جاتی ہے۔

جنرل ضیا بینڈ ماسٹر کو اس کے کاندھے پر تھپکی دیتا ہے، جبکہ باقی دو جرنیل پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ جنرل ضیا کے ہاتھ ایک تخیلاتی بیگ پائپ کو بجانے لگتے ہیں۔ بینڈ ماسٹر ایسے دانت نکالتا ہے جیسے اسے اپنی ٹیم میں بیگ پائپ بجانے والے جس فن کار کی تلاش تھی وہ بالآخر اسے مل گیا ہو۔ اس کی بیرٹ ٹوپی میں لگا ہوا پر خوشی سے کپکپانے لگتا ہے، جیسے وہ کسی ایسے مرغے کا تاج ہو جس نے ابھی ابھی کسی گاؤں میں مرغوں کا مقابلۂ حُسن جیت لیا ہو۔

اب وہ چلتے ہوئے میری جانب آ رہے ہیں۔ جنرل بیگ اپنے ٹاپ گن رے بین چشمے کے ساتھ ضیا کے دائیں جانب ہے اور جنرل اختر ان سے دو قدم پیچھے۔ جنرل اختر ہر قدم کے ساتھ اپنی چھڑی اپنی ٹانگ پر مارتا جاتا ہے۔ وہ مجھے اجنبیت سے دیکھتا ہے جیسے اسے بھنے ہوئے تیتروں پر ہماری ملاقات یاد نہ رہی ہو۔ جنرل ضیا میں مجھے بڑے بڑے اور باہر نکلے ہوئے سفید دانتوں اور ایک مونچھ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور یہ مونچھ اتنی سیاہ ہے کہ نقلی لگتی ہے۔ میری تلوار کا دستہ پہلے سلیوٹ کے لیے میرے ہونٹوں کی طرف لپکتا ہے اور میرا اسکواڈ فی الفور ہوش یار پوزیشن میں آ جاتا ہے۔ جنرل ضیا مجھ سے پورے پانچ قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہے اور میری تلوار کی رسائی سے باہر ہے۔ پریڈ کمانڈر اور پریڈ کا معائنہ کرنے والے شخص کے درمیان معمول کا فاصلہ یہی ہوتا ہے۔ وہ

ایک مرجھائے ہوئے ہاتھ کے ساتھ مجھے سلیوٹ کرتا ہے اور پھر پریڈ کا سارا نظم و ضبط توڑتے ہوئے پیچھے جھکتا ہے اور اتنی آواز میں سرگوشی کرتا ہے کہ پیچھے موجود دونوں جرنیل اسے سن لیں۔ 'جب ایک بیٹا اپنے باپ کے اچھے کام جاری رکھتا ہے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ ہم گناہ گاروں سے ابھی مکمل طور پر مایوس نہیں ہوا۔'

'ڈرل شروع کرنے کی اجازت ہے، سر؟' میں لیول پانچ پر چلاتا ہوں۔ اور جیسے ہماری ڈرل مشق کے احترام میں اچانک ہی طوفان تھم جاتا ہے؛ ہوا خاموش ہو کر کبھی کبھار کی کسی شُوکر تک محدود ہو جاتی ہے؛ ہوا کے ذرّے، چھنے ہوئے اور بکھرے ہوئے، ابھی تک ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ اس ایک لمحے میں، جب میں اس سے اجازت مانگ رہا ہوں اور وہ اثبات میں سر ہلا رہا ہے، میں اس پر اپنی پہلی حقیقی نظر ڈالتا ہوں۔ جنرل ضیا کے بجائے یہ اس کا کوئی بہروپیا لگتا ہے۔ وہ ٹیلے ویژن پر جیسا نظر آتا ہے اس کے مقابلے میں بہت پستہ قد ہے، اور اپنی سرکاری تصاویر کی نسبت بہت موٹا۔ ایسا لگتا ہے اس نے مانگے تانگے کا یونی فارم پہن رکھا ہے۔ اس کی پی کیپ سے لے کر اس کے سینے پر کراس کی شکل میں بنی ہوئی پٹی سمیت ہر شے کی فٹنگ کچھ خراب سی لگتی ہے جس نے اس کے جسم کے بالائی حصے کو باندھ سا رکھا ہے۔ اس کے ماتھے پر سرمئی رنگ کا ایک گٹا بہت نمایاں ہے، شاید اس کی پانچ وقت کی نمازوں کا نتیجہ۔ اس کی حلقوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ملے جلے پیغام دے رہی ہیں: ایک آنکھ مجھے شفقت سے دیکھ رہی ہے اور دوسری مجھ سے ورا میرے اسکواڈ کو شک و شبے کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ اس کے اردگرد ہر شے خاموش ہے جیسے اس کے پاس میرے لیے تمام دنیا کا وقت موجود ہو۔ وہ اپنا مُنھ کھولتا ہے اور میں یہی سوچ پاتا ہوں کہ اس کے دانت بھی حقیقی نہیں ہیں۔

'پلیز،' وہ کہتا ہے۔ 'بسم اللہ۔'

میں ایک، پھر دو قدم پیچھے ہٹتا ہوں، ایک اباؤٹ ٹرن لیتا ہوں اور میرا دایاں پیر جیسے ہی کنکریٹ پر پڑتا ہے، میرا اسکواڈ ہوش یار پوزیشن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اچھا

اسٹارٹ ہے۔ میری تلوار ہوا میں چمکتی ہے اور اپنی نیام میں چلی جاتی ہے۔تلوار کا دستہ نیام کے منھ کو چھوتا ہے؛ میرا اسکواڈ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کی مخالف سمت دس قدم مارچ کرتا ہے اور پھر ہالٹ ہو جاتا ہے۔ میں دو قطاروں کے بیچ میں ہوں، وہ پھر سے مڑتے ہیں اور نو قدم مارچ کرنے کے بعد رک جاتے ہیں۔ دونوں جانب کی قطاروں کے لیڈر اپنی بانہیں کھولتے ہیں اور اپنی جی تھری رائفلیں میری طرف پھینکتے ہیں۔ میرے پہلے سے تیار ہاتھ مشق سے سدھائی ہوئی آسانی سے رائفلیں تھام لیتے ہیں۔ میں انھیں کسی لٹو کی طرح تیس مرتبہ گھماتا ہوں اور اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر قطار کے لیڈروں کے محفوظ ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں۔ سارا اسکواڈ اپنی رائفلیں ہوا میں اچھالتا ہے، جن کی نالیاں آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہوتی ہیں، اور پھر اپنے کاندھوں کے پیچھے انھیں کیچ کر لیتا ہے۔

میں آخری انسپکشن کے لیے اپنی تلوار باہر نکالتا ہوں۔ میرا دماغ ہر دوسری بات سے خالی ہو چکا ہے؛ میں اب ہر شے کو مرے ہوئے کرنل شگری کی باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔ میں تلوار کو اپنے جسم کے بالائی حصّے کے متوازی کھڑا کیے جنرل ضیا کی طرف مارچ کرتا ہوں۔ میری تلوار کا دستہ میرے ہونٹوں کے قریب جاتا ہے اور پھر نیچے ہو جاتا ہے۔ میرا بازو اب میرے جسم کے متوازی کھڑا ہے، اور میری تلوار کی نوک ہمارے قدموں کے درمیان زمین کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جنرل ضیا سلیوٹ کرتا ہے۔ 'سائلنٹ اسکواڈ انسپکشن کے لیے تیار ہے، سر۔'

اس کا بایاں پیر ہچکچا رہا ہے لیکن میرا بایاں پیر پہلے ہی ایک سست گام مارچ کے لیے اُٹھ چکا ہے اس لیے اب اس کے پاس میرے ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب ہم بالآخر ایک دوسرے کے کاندھے سے کاندھا ملائے ساتھ چل رہے ہیں۔ میری تلوار میرے سامنے پھیلی ہوئی ہے اور اُس کے ہاتھ اس کے اطراف میں ہیں۔ ہم سست گام مارچ کرتے ہوئے سائلنٹ زون میں داخل ہونے کو ہیں۔ ملٹری سروس میں

اسے پینتالیس سال ہو چکے ہیں اور اسے اب بھی اپنی حرکات وسکنات پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ اگر میں چھوٹے چھوٹے قدم نہ لے رہا ہوتا تو وہ بہت پیچھے رہ چکا ہوتا۔ سائلنٹ اسکواڈ دو حصّوں میں منقسم ہے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کے ڈھیلے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں اور ان کی رائفلیں تیار ہیں۔ جب رائفلوں کا پہلا جوڑا ہمارے سامنے سے گزرتا ہے تو میں اس کے سر کو جبلّی طور پر پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ لیکن اب جب کہ وہ رائفلوں سے بنائی جانے والی سرنگ کے بیچ میں آچکا ہے، اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا جائے۔

ملک میں سب سے زیادہ حفاظت میں رکھا جانے والا شخص بندوقوں کی ناچتی ہوئی نالیوں کے دائرے میں ہے اور میری بھوکی، زہر میں بجھی تلوار سے کچھ ہی انچ کے فاصلے پر ہے۔

اسے احساس ہے کہ مارچ کی انسپکشن کے لیے اسے بالکل سیدھا دیکھنا ہے لیکن لگتا ہے کہ اسے خود پر قابو نہیں ہے؛ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ اس کی ایک آنکھ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ یہ معجزہ ہی ہے کہ میرے لڑکوں نے اپنی رائفلیں پھینکتے وقت غلطی سے انھیں ہمارے مُنھ پر نہیں دے مارا۔ دونوں قطاروں کی آخری جوڑی اپنی رائفلیں اُٹھائے تیار کھڑی ہے کہ میں اپنے بائیں جانب لڑکے کو آنکھ مارتا ہوں۔ مجھے علم تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ بالکل اسی لمحے جنرل ضیا کی آوارہ گردی کرتی ہوئی دائیں آنکھ ہماری دائیں جانب کھڑے ہوئے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ وہ دونوں ایک بیٹ مس کر جاتے ہیں، ایک ہی بیٹ، اور اپنی اپنی رائفلیں پھینکتے ہیں۔ رائفلوں کی نالیاں ہوا میں چمکتی ہیں اور نصف دائرہ بناتی ہوئی ایک دوسرے کے پاس سے گزرنے کے بجائے ہوا کے درمیان ایک لمحاتی ایکس کی صورت میں ٹکرا جاتی ہیں جیسے وہ کسی رائفل رجمنٹ کی بریگیڈ کی تصویر کا پوز دینے کے لیے رک گئی ہوں۔ شگری ریسکیو شروع کرتا

ہے: میرا بوٹ جنرل ضیا کی پنڈلی سے ٹکراتا ہے اور جب وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوتا ہے تو میرا بایاں ہاتھ اسے گرنے سے روک دیتا ہے جبکہ میرا دایاں ہاتھ اپنا کام کرتا ہے؛ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں، کوئی ایسی بات جسے کوئی نوٹ بھی کرتا، بس میں نے اپنی تلوار کی نوک سے اس کے ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ کی پشت پر ایک چٹکی سی لی ہے، جس سے خون کا بس ذرا سا قطرہ نکلا ہے۔ میں نے اسے اس سے زیادہ زخمی نہیں کیا جتنا کوئی مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ تماشا دیکھنے والوں کی جانب سے اس کا ردِعمل ضرورت سے زیادہ تو ہے لیکن اس کی توقع بھی تھی: جیک بوٹ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آتے ہیں، رائفلیں کاک ہو جاتی ہیں، کمانڈوز پوزیشن لے لیتے ہیں اور ڈیوٹی ڈاکٹر طبی عملے کو ہدایات دینے لگتا ہے۔

'اگر اللہ کسی کو بچانا چاہے، تو کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔' جب ڈیوٹی ڈاکٹر خون کا قطرہ صاف کر دیتا ہے اور اس کے زخم کو ایک معمولی خراش قرار دے دیتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ میس کی چھتوں پر بیٹھے کمانڈوز کی طرف نہ دیکھوں اور اس سے اتفاق کرنے کے لیے سر ہلا دوں۔ وہ اپنی یونی فارم کی شرٹ کی جیب سے ایک جیبی گھڑی نکالتا ہے اور جنرل اختر کی جانب دیکھتا ہے، جس کی گرمی کے خلاف مزاحمت کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ اس کے یونی فارم پر بھوتوں کی طرح کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ 'آپ کا کیا خیال ہے اختر، کیا ہمیں لنچ سے پہلے نماز نہیں پڑھ لینی چاہیے؟' وہ اپنی بازو میرے کاندھے پر رکھتا ہے اور جنرل اختر کو دیکھے بغیر میس کی جانب چلنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نوٹ کرتا ہوں کہ جنرل اختر کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ اس کا منھ کھلتا تو ہے لیکن اس میں سے کوئی لفظ نہیں نکلتا اور وہ تقریباً اپنے پیر گھسیٹتا ہوا ہمارے پیچھے آنے لگتا ہے۔ آرنلڈ رافیل کہتا ہے 'کیسا اتفاق ہے، صدر صاحب۔ مجھے بھی آج ایک عبادت میں جانا ہے۔ یہاں سے پانچ میل دور ایک گرجا گھر ہے اور ایک یتیم خانہ بھی،

جس کا مجھے دورہ کرنا ہے۔۔۔'

'اوہ، آف کورس۔ لیکن آپ واپس ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔ میں اس صحرا میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور چوں کہ بھائی اختر ہمارے ساتھ ہیں تو اس ٹینکوں کے معاملے کا حل بھی اپنی واپسی کی فلائیٹ کے دوران نکال لیں گے۔'

'میں ٹیک آف سے پہلے واپس پہنچ جاؤں گا۔' آرنلڈ رافیل کہتا ہے۔ جب وہ چلتا ہوا کار پارکنگ کی جانب بڑھتا ہے تو ایک آشنا چہرہ اس کا استقبال کرتا ہے۔ بینن نے سوٹ پہن رکھا ہے اور وہ مجھے دیکھ کر بہت سرکاری انداز میں سر ہلاتا ہے جیسے اسے میرا چہرہ تو کچھ کچھ یاد ہو لیکن وہ میرا نام بھول گیا ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ ڈرل کے دوران دکھائی نہیں دیا۔ مجھے اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت تھی۔ کمانڈوز کی ایک ٹیم پھرتی سے ان کے ساتھ ہو لیتی ہے۔

سفید پگڑی پہنے ہوئے ایک ویٹر میس کا دروازہ کھولتا ہے اور ہمیں ایک ایسی دنیا میں داخل کر دیتا ہے جہاں کی ہوا ریت سے پاک اور ٹھنڈی ہے، جہاں شیشے کی بڑی بڑی الماریوں میں ٹینکوں کے ماڈل اور ٹینس کی ٹرافیاں رکھی ہیں اور جس کی سفید دیواریں پگڑی پوش گھڑسواروں کی پینٹنگ سے بھری ہیں جو دھبے دار ہرنوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گیریژن کمانڈر ہمیں ایک بڑے سے سفید رنگ کے ہال کی جانب لے جاتا ہے اور اس دوران بڑبڑاتے ہوئے معافیاں مانگتا جاتا ہے کہ گیریژن کی نئی مسجد اب تک زیرِ تعمیر ہے۔ جنرل اختر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ میں اس امید میں اپنی رفتار تیز کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ایک بازو کے جلد ہی اپنے کاندھے پر دھرے جانے سے بچ سکوں۔ وہ اپنا بازو میرے کاندھے پر رکھ دیتا ہے۔'That was very well done' وہ بڑے مایوس کن لہجے میں کہتا ہے۔ پھر وہ میرے کان کی طرف جھکتا ہے اور سرگوشی کرتا ہے، 'میں نے ہی انھیں کہا تھا کہ تمھیں چھوڑ دیں، تمھیں معلوم ہی ہوگا کہ یہ ہماری غلطی فہمی تھی۔ بائے دی وے، تم فی الحقیقت جانتے ہو کہ تلوار کو کیسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ورنہ وہ

تو کہیں بھی گھس جاتی۔ تمھارا باپ بھی تو نہیں جانتا تھا کہ رُکنا کہاں ہے۔'

'یہ سب پریکٹس سے آتا ہے۔' میں تھوڑا سا وقفہ دیتا ہوں اور پھر زور سے بولتا ہوں، 'سر۔'

وہ میرے کاندھے سے اپنا بازو اچانک ہٹا لیتا ہے جیسے وہ میرے ساتھ مزید دیکھا جانا نہ چاہ رہا ہو۔ عُبید نے شاید انھیں میری تلوار کی مشق کے بارے میں بتا دیا ہو، لیکن دنیا میں کوئی ایک بھی شخص انکل ستارچی کے شہد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

میری آنکھیں کوئی نشانی دیکھنے کے لیے جنرل ضیا کے پیر تلاش کرتی ہیں۔ وہ بالکل سیدھے اور ہم وار قدموں سے چل رہا ہے جیسے اس کے خون نے میری تلوار کی نوک کبھی نہیں چکھی ہو۔

'نرمی سے، آہستگی سے۔' میں خود کو انکل ستارچی کا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔

ہم پانی کے ایک پائپ کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں جس کے ساتھ ہمارے وضو کے لیے اسٹین لیس اسٹیل کی بہت سی ٹونٹیاں لگائی گئی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ وضو کیسے کیا جاتا ہے اس لیے میں اردگرد دیکھتا ہوں اور وہی کچھ کرتا ہوں جو دوسرے کر رہے ہیں۔ پہلے ہاتھ، پھر مُنہ میں پانی تین مرتبہ، پھر بایاں نتھنا، دایاں نتھنا، اس کے بعد اپنے کانوں کے پیچھے پانی کا چھپاکا مارنا۔ میں جنرل ضیا کی طرف بار بار دیکھتا ہوں۔ اس کی حرکات وسکنات میں میکانیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ایک ہتھیلی سے چلّو بنا کر اسے پانی سے بھرتا ہے، پھر اس پانی کو دوسری ہتھیلی کے چلّو میں اُنڈیلتا ہے اور پھر یہ پانی بہہ جانے دیتا ہے اور اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر مل لیتا ہے۔ وہ درحقیقت پانی استعمال ہی نہیں کر رہا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ وضو کر ہی نہیں رہا، بس کٹھ پتلی کی طرح وضو کی نقالی کر رہا ہے۔ میں جب وضو کرنا ختم کرتا ہوں تو میری یونی فارم پر ہر طرف پانی کے چھپاکے پڑ چکے ہیں۔ شاید ایسا کبھی کبھار عبادت کرنے والے کی عقیدت کے باعث ہوا ہے۔

نماز کے دوران بھی میں بار بار اپنے دائیں اور بائیں جھانکتا رہتا ہوں، تاکہ دیکھ سکوں کہ مجھے کب رکوع میں جانا ہے اور کب اپنے ہاتھ کانوں تک بلند کرنے ہیں۔ ایسا لگتا ہے میں امتحان میں بیٹھا نقل مار رہا ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ یہاں کا ممتحن بات کو زیادہ سمجھتا ہوگا۔ جنرل بیگ بھی شاید ایسا ہی سمجھتا ہے، کیوں کہ اس نے نماز میں بھی اپنے ٹاپ گن رے بین چشمے لگا رکھے ہیں۔ یہ کیسا آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ نماز کے دوران خدا بھی اس کی آنکھوں میں نہ جھانکے؟ میں پھر اپنی سوچیں جمع کرتا ہوں اور وہ واحد دعا پڑھنا شروع کر دیتا ہوں جو مجھے یاد ہے۔ وہ دعا جو میں نے کرنل شگری کے جنازے میں پڑھی تھی۔ مُردوں کے لیے کی جانے والی دعا، سورۂ فاتحہ۔

۳۳

جنرل اختر نے اضافی احتیاط کے ساتھ سلیوٹ کیا، اور یقینی بنایا کہ اس کی ہتھیلی سیدھی، آنکھیں برابر، ریڑھ کی ہڈی تنی ہوئی اور جسم کی ہر بافت احترام سے دھڑک رہی ہو۔ اس شگری لونڈے نے آخری وقت پر اپنے کنچے گنوا دیے، لیکن جنرل ضیا جس جہاز میں سوار ہونے کو ہے اس میں اتنی وی ایکس گیس ہے جو ایک گاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کافی ہے۔

جنرل ضیا ایک مردہ شخص ہے اور یونی فارم میں ملبوس مردہ احترام کا مستحق ہوتا ہے۔

کسی بھی اور حالات میں جنرل اختر اس کے ساتھ ساتھ طیارے تک چلتا ہوا جاتا، جنرل ضیا کا انتظار کرتا کہ وہ کب سیڑھیوں سے اوپر چڑھے گا اور کب ائرکرافٹ کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اس کے بعد ہی سرخ قالین پر چلتا ہوا واپس آتا۔ لیکن سرخ قالین پر دو سو گز کا وہ فاصلہ جو اس کے اور اس طیارے کے درمیان ہے، اسے وہ طے نہ کرنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہے۔ وہ پہلے ہی اسلام آباد میں اپنی آمد کا وقت دو مرتبہ تبدیل کر چکا ہے اور اب اسے نکلنا ہے، اسی وقت، چاہے اسے اس کے لیے بدتمیز اور احترام نہ کرنے والے شخص کا تاثر دینے کا رسک ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ بھئی آخر اس نے ایک ملک کو بھی تو چلانا ہے۔

جنرل ضیا اس کا سلیوٹ لوٹانے کے بجائے آگے بڑھتا ہے اور اپنی بانہیں جنرل

اختر کی کمر میں ڈال دیتا ہے۔

'بھائی اختر، میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو بلایا ہی اس لیے تھا کیوں کہ میں آپ کو ایک یاد میں اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا تھا۔ جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو میرے والدین میرے لیے ایک سائیکل خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ مجھے اپنے پڑوس میں ایک لڑکے کی سائیکل پر بیٹھ کر اسکول جانا پڑتا تھا۔ اور اب دیکھو ہمیں۔' وہ اپنے بازو کو نصف دائرے میں موڑتا ہے اور سی ون تھرٹی طیارے اور اس کے ساتھ دو چھوٹے سیسنا طیاروں کی جانب اشارہ کرتا ہے جو ٹارمک پر کھڑے ہیں۔ 'اب ہم خود اپنے اپنے طیاروں میں سفر کرتے ہیں، چاہے ہمیں ایک ہی جگہ کیوں نہ جانا ہو۔'

'اللہ آپ پر بڑا مہربان رہا ہے۔' جنرل اختر کہتا ہے اور اپنے چہرے پر زبردستی کی ایک مسکراہٹ سجا دیتا ہے۔ 'اور آپ بھی مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں، ہم سب پر۔' وہ جنرل بیگ کی جانب دیکھتا ہے جس کی آنکھیں افق پر مرکوز ہیں جہاں پاک فضائیہ کا ایک چھوٹا لڑاکا طیارہ ابھی ابھی اڑان بھر کر فضائی نگرانی کی مہم پر نکلا ہے۔ اس طیارے کا مشن یہ ہے کہ اردگرد کے ماحول میں کسی قدرتی خطرے کی تلاش کرے اور اگر اس علاقے میں کوئی شخص پاک ون پر نشانہ بازی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بوگی ٹارگٹ کا کام کر سکے۔

جہاں یہ جرنیل کھڑے ہیں وہاں سے پانچ میل دور وہ کوا آنے والے طیارے کی دہاڑ سنتا ہے۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد آئی ہوئی اونگھ سے چونک کر جاگتے ہوئے پریشانی کے عالم میں اپنے پَر پھڑپھڑاتا ہے اور پھر اس کی توجہ ہٹ کر اس آم کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جو اس کے سر کے اوپر ایک شاخ پر گل رہا ہے اور وہ اپنی اونگھ کو مزید کچھ عرصہ جاری رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

جنرل ضیا نوٹس نہیں کرتا کہ جنرل اختر اس کی گرفت کے اندر بے قرار ہو رہا ہے اور اس سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جنرل ضیا اپنی یادداشتوں کو جاری رکھتا ہے۔ 'لوگ ہمیشہ ماضی کی بات کرتے ہیں۔ ماضی کے اچھے دنوں کی۔ ہاں وہ اچھے دن تھے، لیکن تب بھی مفت کی سواری کون دیتا تھا۔ ہر ہفتے میرا سائیکل والا پڑوسی مجھے ہمارے اسکول کے قریب واقع آم کے باغ میں لے جاتا اور اس کے باہر میرا انتظار کرتا، جبکہ میں باغ کی بیرونی دیوار پر چڑھتا، اندر جاتا اور چرائے ہوئے آموں کے ساتھ واپس آ جاتا۔ مجھے امید ہے کہ اللہ میاں ایک بچے کی بے احتیاطیوں کو معاف فرمائیں گے۔ ذرا اب مجھے دیکھو بھائیو۔ اللہ نے مجھے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں میرے پاس میری اپنی سواری ہے اور میرے اپنے آم ہیں جو میرے اپنے لوگوں نے مجھے تحفے میں بھجوائے ہیں۔ تو چلیے پاک ون میں ایک دعوتِ آم کرتے ہیں۔ چلیے پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔'

جنرل بیگ پہلی مرتبہ مسکراتا ہے۔ 'میں ان بدقسمت لوگوں میں شامل ہوں جنھیں اللہ نے آم جیسے بہشتی پھل کا لطف لینے کے لیے ذائقے کے مسام ہی نہیں دیے۔ مجھے تو آم کی خوش بو سے بھی الرجی ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اس دعوت کا لطف اُٹھائیں گے۔ وہاں ان کے بیس کریٹ موجود ہیں، آپ کچھ آم خاتونِ اوّل کے لیے بھی لے جا سکتے ہیں۔' وہ سلیوٹ کرتا ہے اور جانے کے لیے مڑ جاتا ہے۔

'جنرل بیگ۔' جنرل ضیا خود میں وہ حاکمانہ قوت بیدار کرنے کی سعی کرتا ہے جو لگتا ہے کہ اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ جنرل بیگ مڑتا ہے، اس کا چہرہ پُرسکون اور احترام کرتا ہوا لیکن اس کی آنکھیں اس کی عینک کے شیشوں کی پارہ لگی کوٹنگ کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔ جنرل ضیا اپنی بائیں آنکھ مسلتا ہے اور کہتا ہے، 'میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے، کیا میں تمھارے سن گلاسز لے سکتا ہوں؟' جنرل ضیا کی آنکھیں جنرل بیگ کے چہرے پر مرکوز ہیں اور وہ سن گلاسز کے چہرے سے اترنے کا انتظار کر رہا ہے، انتظار کر رہا ہے کہ وہ جنرل بیگ کی آنکھوں میں اچھی طرح جھانک لے۔ اسے وہ خفیہ دستاویز یاد آتی ہے جو

اس نے جنرل بیگ کی ترقی سے پہلے تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس میں مہنگی خوش بویات، بی ایم ڈبلیو کاروں اور برٹرینڈ رسل سے جنرل بیگ کے شغف سے متعلق کچھ لکھا تھا۔ اس میں کسی الرجی کا کوئی بیان نہیں تھا، نہ آموں کا کوئی تذکرہ تھا اور ہاں سن گلاسز کا ذکر تو بالکل بھی نہیں تھا۔

جنرل بیگ کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اس کا بایاں ہاتھ سَن گلاسز اتارتا ہے اور انھیں جنرل ضیا کو پیش کر دیتا ہے، جبکہ اس کا دایاں ہاتھ اس کی شرٹ کی جیب میں جاتا ہے، اسی طرح کے ایک اور سن گلاسز نکالتا ہے اور انھیں چہرے پر سجالیتا ہے۔ اس لمحے میں جب اس کی آنکھ برہنہ تھی، جنرل ضیا وہ بات دریافت کرتا ہے جو اسے پہلے ہی سے معلوم تھی: جنرل بیگ اس سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔

یہ جنرل ضیا کی دائیں آنکھ تھی جو اس فیصلے تک پہنچی۔ اس کی بائیں آنکھ جنرل بیگ سے ماورا آوارہ گردی کر رہی ہے، تلوار اُٹھائے ہوئے شگری لڑکے سے بھی ماورا جو اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہے، جیسا باپ ویسا بیٹا، موقع محل کا پتا ہی نہیں، جنرل ضیا سوچتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک آدمی کا سراب سا تارمک پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ یونی فارم میں ملبوس ہے اور ان کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے، سیکیورٹی کا حصار توڑتا ہوا، کمانڈوز کی جانب سے چلّا کر رک جاؤ کا حکم سننے کے باوجود، ان کی بھری ہوئی کلاشنکوفوں کو نظرانداز کرتے ہوئے، اور مخمصے میں مبتلا چھپے ہوئے بندوق برداروں کی بے قرار انگلیوں کو بھلائے ہوئے۔ وہ اب تک اسے گولی مار چکے ہوتے اگر وہ اپنی میجر کی یونی فارم پہنے ہوئے نہ ہوتا اور اس کے ہاتھ اپنے پر امن عزائم کی وضاحت میں فضا میں بلند نہ ہوتے۔ جنرل اختر اسے کسی بھی دوسرے شخص سے پہلے شناخت کر لیتا ہے اور چھپے ہوئے بندوق برداروں کو فائرنگ سے پرہیز کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھا کر انھیں سگنل دیتا ہے۔ چھپے ہوئے بندوق بردار اپنی ٹانگیں اور چہرے سکیڑ لیتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں میجر کے کہ مبادا وہ کوئی اوچھی حرکت کرے۔

جنرل اختر کا سکون ایک ایسے آدمی کا سکون ہے جو پھانسی کے تختے پر کھڑا ہو، رسی اس کی گردن کے گرد باندھی جا چکی ہو اور اس کے چہرے پر سیاہ نقاب اوڑھایا ہی جانے والا ہو، پھانسی دینے والا پھانسی کے لیور کو درست کر رہا ہو اور اس دوران اپنی دعا دُہرا رہا ہو؛ اپنی گردن کے گرد پھندا لگا ہوا شخص دور فاصلے پر گھوڑے پر سوار کسی پیغام بر کو دیکھتا ہے جو اس منظر کی جانب گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا لا رہا ہو اور اپنے ہاتھوں کو فضا میں زور زور سے ہلا رہا ہو۔

جنرل اختر میجر کیانی کو دیکھ کر سکون محسوس کرتا ہے۔

جنرل اختر یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میجر کیانی کون سا پیغام لا سکتا ہے، لیکن پھر بھی اسے سکون تو محسوس ہو رہا ہے۔ اسی لمحے جب وہ خدائی مداخلت کی دعائیں ترک ہی کرنے والا تھا، اس کا اپنا آدمی اس کے بچاؤ کے لیے چلا آیا تھا۔

جنرل ضیا جو اب تک جنرل بیگ کے پرسکون اقدام پر حیرت زدہ تھا اور اب تک اس کے دیے ہوئے سن گلاسز کو ہاتھوں میں ہی لیے کھڑا تھا، میجر پر بس ایک واجبی سی نگاہ ڈالتا ہے جو اب آہستہ گام ہو چلا تھا اور ان کی جانب میراتھن دوڑ کے ایک ایسے کھلاڑی کی طرح بڑھ رہا تھا جو منزل کی جانب آخری قدم اُٹھا رہا ہو۔ جب وہ ان سے کچھ ہی قدم کے فاصلے پر رک کر سلیوٹ مارتا ہے تو تبھی جنرل ضیا کسی فوجی بوٹ کی ٹھوس آواز کے بجائے کنکریٹ پر بجتے والی پشاوری چپل کی پھُسپھُسی آواز سنتا ہے تو میجر کے پیروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہتا ہے، بلڈی ہیل میجر، تم اپنے سلیپرز میں کیوں گھوم رہے ہو؟

یہ جنرل ضیا کی آخری واضح سوچ ثابت ہوئی، اس کے آخری الفاظ جو پاک ون میں اس کے ساتھ سفر کرنے والے ہم راہیوں کی کچھ سمجھ میں آ سکے۔

۳۴

کریش کے بعد آپ نے مجھے ٹیلے وژن پر دیکھا ہوگا۔ وہ کلِپ چھوٹا سا ہے اور اس میں بھی ہر شے سورج کی شعاعوں میں چھپی ہوئی اور مدھم سی ہے۔ ٹی وی پر کچھ ابتدائی خبرناموں کے بعد اسے ہٹا لیا گیا تھا، کیوں کہ اس سے قوم کے مورال پر بُرا اثر پڑنے کا امکان تھا۔ آپ اسے کلِپ میں نہیں دیکھ سکتے، لیکن اس میں ہم سب پاک وَن کی جانب چلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، جو کیمرا مین کی پشت کے پیچھے کھڑا ہے، اور جو ابھی تک جنریٹروں اور ایک فاضل فیول پمپ سے منسلک ہے، اور الرٹ کمانڈو ابھی تک جس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ اس کے پروں سے گرمی اُٹھ رہی ہے اور ایندھن کے قطرے سفید دھوئیں کے مرغولوں کی صورت اوپر اُٹھ رہے ہیں۔ یہ ساحل پر آ جانے والی کسی وھیل مچھلی کی طرح ہے، سرمئی اور زندہ، جو یہ سوچ رہی ہو کہ کیسے خود کو ایک بار پھر سمندر میں لے جائے۔ آپ اس کلِپ میں جنرل ضیا کے چمکتے ہوئے سفید دانت دیکھ سکتے ہیں لیکن آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ وہ مسکرا نہیں رہا۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ بے قرار ہے۔ وہ ایسے آدمی کی طرح چل رہا ہے جسے قبض ہو گئی ہو۔ جنرل اختر کے ہونٹ بھی کھنچے ہوئے ہیں، اور اگرچہ سورج نے ہر شے کو ابال کر اطاعت پر مجبور کر دیا ہے اور اردگرد کے تمام مناظر میں سے ہر رنگ کو نچوڑ ڈالا ہے، لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی عموماً زرد نظر آنے والی جلد گیلے گیلے پیلے رنگ کی ہو چلی ہے۔ وہ اپنے

پیر گھسیٹ رہا ہے۔ جنرل بیگ اپنے سن گلاسز کے پیچھے چھپا ہوا ہے، لیکن جب وہ سلیوٹ کرتا ہے اور وہاں سے چل دیتا ہے تو اس کی رفتار تیز ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کی چال چل رہا ہے جسے یہ معلوم ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں۔ آپ مجھے صرف کچھ سیکنڈوں کے لیے ان سب کے پیچھے دیکھ سکتے ہیں، میرا سر ان کے کاندھوں کے اوپر سے نکلا ہوا نظر آ رہا ہے، اور اگر آپ صحیح معنوں میں غور سے دیکھیں تو صرف میں ہی ہوں جس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی ہے، شاید وہ واحد شخص ہوں جو جنرل ضیا کے سفر کا انتظار کر رہا ہے۔ میرا اسکواڈ پہلے ہی ایک اور سی ون تھرٹی طیارے پر مرغ مسلّم اور نرم بن کے پیک شدہ ظہرانے کے ساتھ پرواز کر چکا ہے۔ مجھے پاک ون پر ایک دعوتِ آم کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ مجھے آموں سے نفرت ہے لیکن اگر مجھے کرنل شگری کے قاتل کو منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے اور اپنے آخری سانس کے لیے ہانپتے ہوئے دیکھنا ہے تو میں کچھ آم کھا ہی لوں گا۔

کلپ یہ نہیں دکھاتا کہ جب میں جنرل ضیا کو سلیوٹ کرتا ہوں اور پاک ون کی جانب چلنا شروع کرتا ہوں تو میری مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک مرے ہوئے شخص کو سلیوٹ کر رہا ہوں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ وردی میں ہیں تو آپ کو سلیوٹ کرنا ہی ہوتا ہے؛ بس اتنی سی بات ہے۔

۳۵

لینگلے کے آپریشن روم میں رکھی جانے والی ٹیلے فون لاگ بک بعد میں یہ بتائے گی کہ جنوبی ایشیا ڈیسک کی ابتدائی شفٹ نے اس روز پاکستان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل کو تلاش کرنے کی کوشش میں ایک سو بارہ ٹیلے فون کالیں وصول کیں۔ آرنلڈ رافیل کی تلاش سی آئی اے کے مقامی چیف کی اس مخبری کے بعد شروع ہوئی تھی جو اسے پاک فوج کے ایک میجر سے ملی تھی؛ وہ مخبری یہ تھی کہ پاک ون میں بہت سے آم ہیں اور ہوسکتا ہے کہ جہاز کا ائرکنڈیشننگ نظام ناکارہ ہو جائے۔ چک کوگن کے پاس مقامی ثقافت کے لیے مخصوص کوڈ زبی پر کام کرنے کا وقت تھا نہ صبر۔ اس نے لینگلے اسٹیشن کو اطلاع دی اور جب ڈیوٹی اینالسٹ نے اسے بتایا کہ انھوں نے ایک پاکستانی جنرل کی جانب سے پاک ون اور آموں کے بارے میں کسی اور کو بھیجا جانے والا ایک پیغام پکڑ لیا ہے تو چک کو پریشانی ہوئی۔ 'چلیے سفیر صاحب کو اس جہاز سے اتروا لیجیے۔' چک کوگن نے اپنے ذہن میں یہ بات نوٹ کرلی کہ اسے پاکستانی فوج کی کمان کی ترتیب میں دراڑیں پڑنے سے متعلق بھی ایک پیراگراف اپنی ماہانہ ڈی بریفنگ میں شامل کرنا ہے، اور پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹیلے فون کالیں ہانگ کانگ میں جنوب مشرقی ایشیا بیورو، اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے اور پشاور میں رابطہ دفتر سے گزریں۔ مایوسی میں آخری کوشش کے طور پر

ایک مواصلاتی سیارچے کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا مدار تبدیل کرے تاکہ رافیل کے سیٹلائٹ فون ریسیور پر پیغام نمودار ہو سکے۔ جلدی میں پڑنے والی اس ضرورت کا لاگ بک میں اندراج نہیں ہوا۔ لاگ بک میں یہ نہیں لکھا جا سکا کہ آرنلڈ رافیل نے ایک مقامی گرجے سے منسلک یتیم خانے کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ جنرل ضیا سے جان چھڑا سکے اور ایم آئی ابرام کی کارکردگی کے پریشان کن پوسٹ مارٹم سے گریز کر سکے۔

سیٹلائٹ ریسیور ایک عجیب سا کھڑکھڑانے والا سنہری آلہ تھا جو پلاسٹک کے ایک ٹھوس ڈبے میں بند تھا، فی الوقت اُس کا سوئچ آف تھا اور سفیر کی سیاہ مرسیڈیز کی پچھلی نشست کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ مرسیڈیز ایک زیرِ تعمیر کیتھولک گرجے کے اینٹوں سے بنے ہوئے صحن میں پارک کی ہوئی تھی۔ سفیر کے دورے کی خاطر لکڑی کی پاڑ کو پلاسٹک کی سفید شیٹوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا، تین ستاروں اور سنہری صلیب والا فرقہِ کارملیہ کی راہباؤں کا نشان گرجے کی چھت سے لگے ڈنڈے پر ٹیڑھا سا لٹکا ہوا تھا۔ مرسیڈیز کے پیچھے پاک فوج کے کمانڈو اپنی کھلی چھتوں والی جیپوں میں اپنے بازو اور ٹانگیں پھیلائے، کھجور کے درختوں کے قلیل سائے میں خود کو ٹھنڈک پہنچاتے ہوئے، گرجے کے دروازے سے آنے والی تھوڑی بہت موسیقی سماعت کر رہے تھے۔

آرنلڈ رافیل نیچی چھت والے ہال میں پا برہنہ راہباؤں کے درمیان فرنٹ بینچ پر بیٹھا اپنی زندگی کی سب سے حیرت انگیز گائیک منڈلی کو سن رہا تھا۔ ایک شخص ہارمونیم پر ہے اور بارہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ بیٹھا طبلے پر سنگت کر رہا ہے۔ 'یسوع دے سکولاں وِچ، یسوع دے سکولاں وِچ۔' ہارمونیم بجانے والا شخص گا رہا ہے، اور خاکی کچھے اور آدھی آستین کی سفید شرٹیں پہنے، اچھی طرح نہائے دھوئے بچوں کی ایک منڈلی اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر اور اپنے سر ہلا ہلا کر صاحبِ صلیب کا سوانگ رچا رہی ہے۔ چھت کا پنکھا، برف لگی ہوئی کوک، ایک صحرائی گاؤں میں درست قسم کی امریکی انگریزی، آرنلڈ رافیل کو لوری سی دے رہے ہیں، اس پر ایک حیرت انگیز سکون اتر آتا ہے اور کچھ لمحوں

کے لیے وہ اس خوف ناک ٹینک کی مشق اور جنرل ضیا کے ساتھ جلد ہی وقوع پذیر ہونے والے واپسی کے سفر کو بھول جاتا ہے۔ یہ ویسا گرجا نہیں تھا جن میں وہ واشنگٹن ڈی سی کے مضافات میں کبھی کبھار جاتا کرتا تھا۔ یہاں قربان گاہ پر خوش بو کی دھونی رکھی ہے، اور راہبائیں اس کی جانب دیکھ کر کمالِ اسراف سے مسکرا رہی ہیں۔ ایک موٹا سا یسوع، جو پس منظر میں سنہری اور گلابی رنگوں کے مختلف شیڈز میں مصور کیا گیا ہے، اور جس کی گردن میں گیندے کے پھول پڑے ہیں، اپنی کاجل لگی ہوئی آنکھوں سے نیچے اس مجمعے کو دیکھتا ہے۔

'نسج فیس نہیں لگدی، یسوع دے سکولاں وِچ۔' اس کی آنکھیں ایک راہبہ کے برہنہ پیروں پر ٹک جاتی ہیں۔ اس کے دونوں پیروں پر نازک صلیبوں کی قطاریں ہی قطاریں ہیں جو مہندی سے کاڑھی گئی ہیں۔ آرنلڈ رافیل کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور وہ عبادت کے اختتام تک وہیں رہنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جنرل ضیا پاک ون پر اپنی اجل رسیدہ دعوتِ آم کرتا رہے، وہ سوچتا ہے، مجھے اپنے سیسنا طیارے پر جانا چاہیے۔ 'سر دینا چیندا اے، سر دینا چیندا اے بے کشتہ گاہ میں۔' یتیم بچے تخیلاتی تلواروں سے اپنے حلقوم قطع کرتے ہیں اور منڈلی گائے جاتی ہے۔ 'یسوع دے سکولاں وِچ، یسوع دے سکولاں وِچ۔'

لینگلے میں چیف کمیونی کیشن افسر اپنے ہاتھ ہوا میں اُٹھا دیتا ہے اور رپورٹ کرتا ہے کہ سفیر صاحب شاید کوئی لمبا چوڑا قیلولہ فرما رہے ہیں۔ 'پاک ون کو ٹیکسی کرنے کے لیے کلیئرنس دی جا چکی ہے۔ اب وہ کچھ ہی منٹوں میں ٹیک آف کرنے والا ہے۔' گیریزن کی طرف سے آنے والی ائر ٹریفک کنٹرول کی کالیں سن کر مواصلاتی سیٹلائٹ بتلاتا ہے۔ جنوب ایشیا ڈیسک پر موجود ڈیوٹی اینالسٹ اپنے رجسٹر میں کالوں کا اندراج دیکھتا ہے، جن میں سے پہلی کال کسی جنرل کی تھی جس کا بڑا غیر متوقع سا نام بیگ تھا اور

جس نے گزارش کی تھی کہ امریکی سفیر کو پاک ون پر دعوتِ آم میں شامل نہیں ہونا چاہیے، اور فیصلہ کرتا ہے کہ اس معاملے پر مزید پیش رفت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

لو بھئی اب تم لوگ اعتبار کرو ان پاکستانی جرنیلوں کا جو ایک اجل رسیدہ بو دار پھل کے بارے میں بے قرار ہو رہے ہیں، وہ اپنے ساتھیوں کو بتاتا ہے اور اپنی شفٹ ختم کر کے چلا جاتا ہے۔

۳۶

میجر کیانی اپنی چپلوں کی جانب دیکھتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھول جاتا ہے کہ اس نے اپنے فوجی بوٹ کیوں نہیں پہنے ہوئے۔ اس کا سر گھوم رہا ہے جیسے وہ ابھی ابھی کسی رولر کوسٹر سے اترا ہو۔ وہ کسی مرتی ہوئی مچھلی کی سی اشتہا سے سانس لیتا ہے۔ پورے پانچ سو تیس میل کی ڈرائیو کے دوران وہ صرف ایک جملے کی ریہرسل کرتا ہوا آیا ہے: 'یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے، سر، یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے، سر۔' وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ آرنلڈ رافیل کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ ٹارمک پر ایک بھی امریکی موجود نہیں۔ جنرل اختر ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے، جیسے وہ اس سے گڑگڑا کر گزارش کر رہا ہو کہ وہ خدا جانے کیا کہے۔ میجر کیانی کو اچانک محسوس ہوتا ہے کہ اسے سلیوٹ کرنا چاہیے، اپنی کار کی طرف واپس چلنا چاہیے، اپنے دفتر کی طرف واپس ڈرائیو کرنی چاہیے، اس مرتبہ کسی معقول رفتار کے ساتھ، اور اپنے فرائض دوبارہ سے سنبھال لینے چاہئیں۔ لیکن وہ کمیں گاہوں میں چھپے نشانہ بازوں کی بندوقوں کو اپنے سر کی پشت پر نشانہ لگائے اور انتہائی متجسس نگاہوں کی دو جوڑیوں کو اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے، جو کسی وضاحت کی منتظر ہیں۔ زندگی اور موت کا معاملہ ہے، سر، وہ ایک بار پھر آہستگی سے خود سے کہتا ہے، لیکن پھر آکسیجن کے کچھ اور مکعب فٹ سینے میں بھر کر بڑبڑاتا ہے: 'یہ قومی سلامتی کا

معاملہ ہے، سر۔'

جنرل اختر کے اکڑے ہوئے، زرد چہرے پر ایک سیاہ سایہ پھیل جاتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ میجر کیانی کے سر میں گولی مار دے، اپنے سیسنا طیارے میں بیٹھے اور واپس اسلام آباد پرواز کر جائے۔ اسے اپنے آدمیوں سے یہ توقّع تھی کہ وہ فیصلہ کن ایکشن کریں، جنگ میں اس کے آزو بازو کو کور فراہم کریں، اور جب اسے پسپائی کی ضرورت ہو تو اس کے لیے دروازہ فراہم کریں، نہ کہ زنخوں کی طرح قومی سلامتی کے معاملات پر بحث کرتے پھریں۔

وہ اپنے پتلے ہونٹوں کو سانس کے ساتھ اندر کھینچتا ہے اور اپنی چھڑی کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ میجر کیانی اچانک اسے اپنی معصومیت کی ناقابلِ تردید گواہی کی سند لہراتے ہوئے، گھوڑے پر بیٹھے رُست گار کے بجائے موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

جنرل ضیا کی آنکھیں چمک جاتی ہیں، وہ اپنی بند مٹھی سے ہوا میں مکّا لگاتا ہے اور چلّاتا ہے: 'قسم سے، قومی سلامتی کی ایسی کی تیسی۔ ہمارے پاس بیس کریٹ ہیں۔ جنرل اختر، میرے بھائی، میرے کامریڈ، ہم جہاز میں دعوت اڑانے والے ہیں۔' وہ اپنا ایک بازو جنرل اختر کی کمر کے گرد پھیلا دیتا ہے اور دوسرا میجر کیانی کی کمر کے گرد اور پاک ون کی جانب چلنا شروع کر دیتا ہے۔

جنرل ضیا ان دو پیشہ ور سپاہیوں کے درمیان خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے، لیکن اس کا دماغ آگے کو دوڑ رہا ہے۔ تصویروں، لفظوں اور بھولے ہوئے ذائقوں کا ایک جمگھٹا اس کے دماغ میں آ رہا ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ اتنی تیزی سے بول سکتا جس تیزی سے اس کا دماغ کام کر رہا ہے، لیکن وہ اپنے الفاظ کو ٹھیک طرح سے ترتیب نہیں دے پا رہا۔ قسم سے، وہ سوچتا ہے، ہم سن گلاسز والے اس حرام زادے سے نجات حاصل کر لیں گے؛ ہم ابرام ون ٹینک کے بیرل کے ساتھ اسے لٹکائیں گے اور پھر اس کا گولہ داغ دیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ ابرام ون اس ہدف کو کیسے مس کرتا ہے۔ وہ اس خیال پر زور سے

ہنستا ہے۔' ہم یہ ٹینک خرید لیں گے۔ ہمیں ضرورت ہے ان ٹینکوں کی۔' وہ آرنلڈ رافیل سے کہتا ہے اور پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ سفیر تو اس کے برابر میں موجود ہی نہیں۔

'بھائی رافیل کہاں ہیں؟' وہ چلّاتا ہے۔ جنرل اختر اس موقع کو غنیمت جانتا ہے اور جنرل ضیا کی گرفت میں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔' میں جاتا ہوں، انھیں ڈھونڈ کر آتا ہوں۔' جنرل ضیا جنرل اختر کے گرد اپنے بازو کی گرفت مزید مضبوط کر لیتا ہے، اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے اور کسی ٹھکرائے ہوئے عاشق کے سے لہجے میں کہتا ہے۔ 'تم میرے ساتھ قومی سلامتی چوسنا نہیں چاہتے؟ تم چھری سے اس کے ٹکڑے کاٹ کر شہری بیگمات کی طرح، یا جیسے بھی چاہو اسے کھا سکتے ہو۔ ہمارے پاس بہترین قومی سلامتی کے بیس کریٹ ہیں جو ہمارے اپنے لوگوں نے ہمیں تحفے میں دیے ہیں۔'

جنرل ضیا سرخ قالین تک پہنچتا ہے اور اسے سلیوٹ کرنے کے لیے درجن بھر جرنیل قطار باندھ لیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ ان کے ابروؤں تک پہنچتے ہیں تو جنرل ضیا ان کے سلیوٹ لوٹانے کے بجائے ایک آنکھ بند کر کے ان کے چہروں کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ جنرل ضیا سوچتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان سے ان کے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھے، تاکہ اپنے کمانڈروں کے خیالات کے اندر جھانکنے کے لیے ان سے کسی گفتگو کی شروعات کر سکے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ انھیں ایک دعوت دے ڈالتا ہے جو کسی حکم کی طرح لگتی ہے۔ 'دعوت جہاز میں ہوگی۔' وہ پاک ون کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔' سب چڑھ جاؤ، جنٹل مین۔ سب چڑھ جاؤ۔ قسم سے، اس پارٹی کو شروع کرتے ہیں۔'

اور اس موقع پر، سرخ قالین پر اپنے پہلے قدم رکھتے اور درجن بھر حیران پریشان جرنیلوں کو اپنی کمان میں پاک ون کی طرف لے جاتے ہوئے جنرل ضیا اپنے زیریں شکم میں ایک شدید اور خشک درد کی پہلی لہر محسوس کرتا ہے۔

کدو دانوں کی ایک فوج، اس کے دورانِ خون میں پیدا ہونے والے اچانک

ابھار کومحسوس کرتے ہوئے اپنی جھونجھ سے بیدار ہونا شروع کر دیتی ہے۔ کدو دانے بھوک سے بے قرار ہوئے جاتے ہیں۔ ایک کدودانے کی اوسط عمر سات سال ہوتی ہے اور وہ اپنی ساری عمر خوراک کی تلاش اور اسے ہضم کرنے میں صرف کرتا ہے۔ جنرل ضیا کے کدودانوں کی نسل نے اپنا سفر بڑی خوش قسمتی کے ساتھ شروع کیا۔ اس کے مقعد سے اوپر چڑھتے ہوئے، وہ پہلے اس کے جگر پر حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے اس کے جگر کو صحت مند اور صاف پایا، ایک ایسے آدمی کا جگر جس نے پچھلے بیس برسوں میں شراب کی ایک بوند نہیں چکھی اور سگریٹ نوشی بھی نو سال پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اس کی انتڑیاں ایک ایسے شخص کی انتڑیوں جیسی ہیں جس نے پچھلی پوری دہائی کے دوران کوئی لقمہ بھی کھایا تو اسے پہلے سے چکھ کر دیکھنے کے لیے اس کے پاس ذائقہ داں موجود تھے۔ اس کے جگر پر کام کرنے کے بعد کدو دانوں کی فوج اس کے معدے کی نالی میں سرنگ لگانا شروع کرتی ہے اور پھر اوپر، اور اوپر سفر جاری رکھتی ہے۔

ان کا سات سالہ دورانِ زندگی، اب صرف بیس منٹ کا رہ گیا ہے، لیکن اس زندگی کے دوران وہ خوب دعوت اڑائیں گے۔

۳۷

سی ون تھرٹی طیارہ ہمیں اُڑا کر یہاں تک لایا تھا، اس کے مقابلے میں پاک ون ایک محل ہے۔ اس میں ائر کنڈیشننگ نظام ہے۔ اس کے فرش سے جراثیم کش اسپرے کی لیموں جیسی خوش بو آ رہی ہے۔ ہم وی آئی پی پوڈ کے پیچھے باقاعدہ کرسیوں پر بیٹھے ہیں جن پر کہنیاں ٹکانے کی جگہ بھی بنی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ یہاں سفید پگڑی میں ایک ویٹر بھی ہے جو ہمیں پلاسٹک کے گلاسوں میں برف کی ڈلیوں سے بھری کوکا کولا پیش کر رہا ہے۔ یہ ہے اچھی زندگی، میں خود کو بتاتا ہوں۔ میں اپنی کہنی سے عُبید کی پسلیوں میں ٹہوکے دیتا ہوں اور ایک کارگو لفٹ کی جانب اس کی توجّہ مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہوں جو جہاز کے پچھلے حصے میں بہت سے کریٹ رکھ رہی ہے۔ عُبید کتاب کے مطالعے میں مستغرق ہے۔ وہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ لکڑی کے کریٹوں کے پیچھے سے وارنٹ افسر فیاض کا گنجا سر اُبھرتا ہے۔ کریٹوں پر نیلی روشنائی سے واضح پیغام درج کیا گیا ہے۔ 'یہ آم جو ہم آپ کو پیش کر رہے ہیں، صرف موسمی پھل نہیں، یہ ہماری محبت کا اظہار اور ہماری وفاداری کی علامت ہیں۔' تمام کریٹوں پر بڑے بڑے حروف میں 'آل پاکستان مینگو فارمرز کوآپریٹو' بھی لکھا ہے۔ سیکرٹری جنرل کے یار لوگ اب بھی اپنا ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ وارنٹ افسر فیاض کریٹوں کو جہاز کے فرش پر ایک پلاسٹک کی بیلٹ سے باندھ دیتا ہے اور پھر بیلٹ کو زور سے ہلا کر دیکھتا ہے کہ کریٹ ہلیں گے تو نہیں۔ نہیں ہلیں گے۔

جہاز کا پچھلا دروازہ اوپر اُٹھتا ہے اور ایک کرخت آواز کے ساتھ بند ہو جاتا ہے اور کیبن یکا یک آموں کی غالب آ جانے والی خوش بو سے بھر جاتا ہے۔ ایک آم کی خوش بو اچھی ہوتی ہے، لیکن ایک ٹن آموں کی خوش بو متلی جیسی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ فیاض میرے آر پار ایسے دیکھتا ہے جیسے اس نے مجھ پر ٹھرک جھاڑنے کی کبھی کوشش نہ کی ہو۔ میجر کیانی وی آئی پی پوڈ کے ساتھ اپنی کمر ٹکائے ایسا کھڑا ہے جیسے اسے کسی بھی وقت بلائے جانے کی توقّع ہو۔ لگتا ہے کہ اس نے اپنے سائز سے بہت چھوٹی وردی پہن رکھی ہے۔ میں عُبید کی پسلیوں میں ایک اور ٹہوکا دیتا ہوں۔ 'ذرا اس کے پیروں کو دیکھو۔' عُبید بے صبری سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔'اس نے چپلیں پہنی ہوئی ہیں۔ تو؟ چلو اس نے کم از کم وردی تو پہننا شروع کی۔ ایک وقت میں ایک ہی چیز پہن سکتا ہے نا وہ۔' وہ ایک مرتبہ پھر اپنی کتاب میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ میجر کیانی میری طرف آتا ہے اور میرے چہرے کو ایسے گھور کر دیکھتا ہے جیسے اسے اچانک یاد آ گیا ہو کہ اس نے مجھے کہیں دیکھا ہے، لیکن اب اسے پتا نہ ہو کہ اسے مجھ سے کیا کہنا ہے۔ میں اپنی سیٹ خالی کر دیتا ہوں۔ 'سر، آپ یہاں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟' وہ سیٹ پر تقریباً گر سا جاتا ہے جیسے اس کے گھٹنوں نے اس کا وزن اُٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ وارنٹ افسر فیاض آموں کے کریٹوں کے پیچھے سے چلّا کر کہتا ہے۔ 'انڈر آفیسر، مجھے آپ کو آف لوڈ کرنا پڑے گا۔ ہمیں کھڑے ہوئے مسافروں کو پاک ون پر لے جانے کی اجازت نہیں۔' میرا جی تو چاہتا ہے کہ آموں کا کوئی کریٹ مار کر اس کا سر پھاڑ ڈالوں، لیکن سی ون تھرٹی پر مامور دو داڑھی والے کمانڈو پہلے ہی مجھے شک و شبے کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ 'آؤ چلیں، عُبید۔' میں اس کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے جنرل ضیا کے بسترِ مرگ کے کنارے کی نشست سے اُٹھا دیا گیا ہو۔ دروازے پر کھڑا ہو کر میں پیچھے دیکھتا ہوں تو عُبید اپنی کتاب لہرا کر میری جانب اشارہ کرتا ہے اور اس دوران مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہے جو مجھے کچھ ایسا سنائی دیتا ہے:

'بس ختم ہی ہونے والی ہے۔'

میں اسے ملامت کرنے والی نظروں سے دیکھتا ہوں اور میجر کیانی کی جانب دیکھ کر سر ہلا دیتا ہوں جو آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ پر مزید دھنس گیا ہے۔ میں دروازے پر کھڑے کمانڈوز کو دیکھ کر اپنی پی کیپ اتارتا ہوں اور زور سے چیختا ہوں،'Enjoy your VVIP flight'

'بھائی رافیل، آپ نے ہمارے ساتھ لنچ نہیں کیا۔' جنرل ضیا شکایتی لہجے میں کہتا ہے اور آرنلڈ رافیل کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پاک ون کی جانب چلنا شروع کر دیتا ہے۔ 'مجھے پتا ہے آپ یسوع مسیح اور مریم کے ساتھ قیلولہ کر رہے تھے۔' جنرل ضیا اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر دیتا ہے اور اپنی آواز کو سرگوشی بنا دیتا ہے۔ 'اب ہمیں سر جوڑ کر بیٹھ جانا چاہیے اور قومی سلامتی چوسنی چاہیے۔' آرنلڈ رافیل، جو ابھی تک کارمیلائٹ بہنوں اور ان کے گاتے ہوئے یتیموں سے ہونے والی روحانی ملاقات کے زیرِ اثر تھا، سمجھتا ہے کہ جنرل ضیا کوئی مذاق کر رہا ہے۔

آرنلڈ رافیل اپنے سیسنا طیارے کی جانب دیکھتا ہے، اس کا ذہن بہت سے بہانوں کی ایک فہرست کھنگالتا ہے، لیکن جس وقت وہ نینسی کے نام سے شروع ہونے والے کسی بہانے تک پہنچا، جنرل ضیا کا بازو اس کی کمر پر تھا اور وہ اسے پاک ون کی سیڑھی پر سے اوپر لے جا رہا تھا۔

جنرل اختر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے اور اپنی انگلیوں کے درمیان سے وی آئی پی پوڈ کے فرش پر بچھے نرم سفید قالین کو دیکھتا ہے۔ وہ نوٹ کرتا ہے کہ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ وہ اس لکیر کو اس کے منبع تک ڈھونڈتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جنرل ضیا کے چمک دار آکسفرڈ جوتوں سے سیاہی مائل سرخ خون پھوٹ رہا ہے۔ پریشانی میں وہ خود اپنے جوتے دیکھتا ہے۔ وہ بے داغ ہیں۔ اچانک امید کی ایک

کرن، مبہم تاہم پھر بھی امید ہی کی ایک کرن، اس کی روح کا حصار کرنے والے گنبد میں داخل ہوتی ہے۔ شاید شگری لڑکے نے کوئی اندرونی زخم لگایا ہے اور ضیا اس سے بہنے والے خون کے نتیجے میں مرنے والا ہے۔ شاید جہاز بہ حفاظت اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ شاید اسے اپنی تقریر پھر سے لکھنی پڑے گی اور 'ایک بدقسمت حادثہ' والے جملوں کو 'صدر کی اچانک موت' والے جملوں سے تبدیل کرنا پڑے گا۔ اگر جہاز اسلام آباد پہنچ پاتا ہے تو کیا وہ ملک کو ٹیک اوور کرنے کے لیے تیار ہوگا؟ جنرل اختر کو عرصہ پہلے بھول چکی ہوئی اپنے بچپن کی ایک دعا یاد آتی ہے اور وہ اسے دُہرانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اپنی دعا کے درمیان میں وہ اپنا ارادہ تبدیل کر لیتا ہے اور وی آئی پی پوڈ کے دروازے کی جانب لپکتا ہے۔ 'میجر کیانی، عملے سے کہیے کہ ائر کنڈیشننگ سسٹم آف رکھیں، صدر زیادہ بہتر محسوس نہیں کر رہے۔'

'اللہ قسم، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔' جنرل ضیا احتجاج کرتا ہے، پھر اپنے جوتوں کے گرد قالین پر بن جانے والے خون کے چھوٹے سے تالاب پر نظریں گاڑتا ہے، لیکن پھر نہ ماننے والے کسی نشئی کی طرح وہ اپنے معدے سے اُٹھنے والے پیس کر رکھ دینے والے درد، اپنی پتلون سے لکیر بنا کر اترنے والے مواد اور قالین پر سیاہی مائل سرخ رنگ کے خون کی لکیر کے درمیان کڑیاں جوڑنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ فیصلہ کرتا ہے کہ انھیں موضوع تبدیل کر دینا چاہیے۔ وہ چاہتا ہے کہ بات چیت کو ایک اعلیٰ تر سطح پر لے جائے تاکہ کوئی شخص فرش پر گرا ہوا خون نہ دیکھ سکے۔ وہ جانتا ہے کہ واحد آدمی جس پر وہ بھروسا کر سکتا ہے آرنلڈ رافیل ہے۔

سی ون تھرٹی کے دروازے بند کیے جا چکے ہیں، پائلٹ اپنے تھروٹل آگے بڑھاتا ہے اور چار پروپیلر رفتار پکڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جنرل ضیا آرنلڈ رافیل کی جانب دیکھتا ہے اور اس سے ملتجیانہ آواز میں کہتا ہے، 'ہم وہ ٹینک خرید لیں گے۔ آپ لوگوں نے کتنی حساس مشین بنائی ہے۔ لیکن پہلے مجھے یہ بتائیے کہ تاریخ مجھے کیسے یاد رکھے گی۔' وی آئی پی

پوڈ کے احاطے میں آوازیں طیارے سے نکلنے والی آوازوں میں ڈوبتی جا رہی ہیں۔ آرنلڈ رافیل سمجھتا ہے کہ جنرل ضیا اس سے ابرام ون ٹینک پر لگے ٹارگٹ سینسر کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ آرنلڈ رافیل، جس کے سر میں کارمیلائٹ یتیموں کی حمدیں ابھی تک گونج رہی ہیں، یکایک صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور اپنی زندگی کا پہلا اور آخری غیر سفارتی بیان دیتا ہے۔ 'No, Mr. President, they are as useless as tits on a boar'

آرنلڈ رافیل نے ابھی جو کچھ کہا اس پر جنرل ضیا کو یقین نہیں آتا: دنیا اسے ایسے یاد رکھے گی جیسے کوئی bore انسان۔

پریشانی کے ایک لمحے میں جنرل ضیا محسوس کرتا ہے کہ اسے اس تاریخی مغالطے کو درست کر لینا چاہیے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ نصاب کی کتابوں میں ایک ایسے صدر کی حیثیت سے جانا جائے جس نے اپنے ملک کے تیرہ کروڑ لوگوں پر گیارہ سال حکم رانی کی، دنیا کی پہلی جدید اسلامی ریاست کی بنیادیں رکھیں، کمیونزم کو انجام تک پہنچایا، لیکن وہ خود ایک بور انسان تھا۔ اسے انھیں کوئی لطیفہ سنانا چاہیے، وہ فیصلہ کرتا ہے۔ وہ سیکڑوں ایک فقرے کے لطیفے جو اس نے اپنی کابینہ کے اجلاسوں میں آزمائے اس کے ذہن سے گزرتے ہیں اور ایک دھندلے نامختتم کائناتی لطیفے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں ایک لطیفے کی ریہرسل کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لطیفوں میں ٹائمنگ بہت اہم ہوتی ہے۔ 'جب ستر حوروں کو بتایا گیا کہ اب وہ جنت میں تا ابد جنرل ضیا کے ساتھ رہیں گی تو انھوں نے کیا کہا؟' وہ حوروں کے اصل الفاظ یاد نہیں کر پاتا۔ کچھ اس طرح کے تھے کہ یہ تو تا ابد جہنم میں رہنے کے برابر ہوا، لیکن اگر آپ کو لطیفے کی پنچ لائن یاد نہیں تو لطیفہ سنانا خطرناک ہوتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک کوندا لپکتا ہے۔ اسے کوئی گھریلو قسم کا لطیفہ سنانا چاہیے۔ وہ ایک بذلہ سنج آدمی کی حیثیت سے یاد کیا جانا چاہتا ہے۔

'کیوں کہ خاتونِ اوّل کا خیال ہے کہ وہ قوم کی لینے میں ہی اتنا مصروف ہے۔' وہ

اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہتا ہے۔ جب اس کے اردگرد کوئی شخص نہیں ہنستا تبھی اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے لطیفے کی پنچ لائن پہلے ہی مُنھ سے اگل چکا ہے اور اب اسے باقی ماندہ لطیفہ یادنہیں آ رہا۔ اسے اظہار کی روانی اور صفائی کی تمنا ہوتی ہے جو اس کے گڈ مڈ ذہن سے تیر کی طرح نکلے۔ وہ اپنے اردگرد بے بس چہروں کی طرف دیکھتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے لطیفہ یادنہیں آئے گا۔ کبھی یادنہیں آئے گا۔

اپنے ورثے کو بچانے اور گفتگو جاری رکھنے کے لیے وہ جنرل اختر کی جانب مڑتا ہے۔ 'آپ کا کیا خیال ہے، بھائی اختر، تاریخ مجھے کیسے یاد رکھے گی؟' جنرل اختر کا چہرہ موت کی طرح زرد ہے۔ اس کے پتلے ہونٹ وہ تمام دعائیں دُہرا رہے ہیں جو اسے یاد ہیں، اس کا دل دھڑکنا نجانے کب سے بند ہو چکا ہے اور اس کا زیر جامہ ٹھنڈے پسینے سے بھیگ چکا ہے۔ یقینی موت سے دوچار زیادہ تر لوگ غالباً ایسے موقع پر وہ دو تین باتیں ضرور کہتے ہیں جو انھوں نے ہمیشہ سے کہنا چاہی تھیں، مگر جنرل اختر ایسے لوگوں میں سے نہیں۔ زندگی بھر کے فوجی ڈسپلن اور اپنے سینئرز کے سامنے چپ سادھ لینے کی اس کی فطری جبلّت اس کے موت کے خوف پر غالب آ جاتی ہے اور وہ کپکپاتے ہاتھوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ اپنی زندگی کا آخری جھوٹ بولتا ہے۔ 'ایک اچھے مسلمان اور ایک عظیم رہ نما کی حیثیت سے۔' وہ کہتا ہے اور پھر اپنا استری شدہ سفید رومال اپنی جیب سے نکال کر اپنی ناک پر رکھ لیتا ہے۔

جب میں انھیں سی ون تھرٹی تک لے جانے والی سیڑھی کے قریب سرخ قالین پر جمع دیکھتا ہوں تو میں اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کیا مجھے انکل ستارچی کی دیہاتی قسم کی فارماکالوجی پر اعتبار کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ جنرل ضیا اب بھی اپنا ایک بازو جنرل اختر کی کمر کے گرد کیے اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ وہ ایسے عاشق دکھائی دیتے ہیں جو ایک دوسرے کو اکیلا چھوڑنا نہ چاہتے ہوں۔ شاید جب میں نے اسے اپنی تلوار کی نوک پر رکھ لیا تھا تو مجھے اس کی نوک اس کی گردن کے پیچھے پیوست کر دینی چاہیے تھی۔ اب بہت دیر ہو چکی۔ میں پہلے ہی جنرل بیگ کے طیارے پر ایک نشست سے بندھ چکا ہوں۔ جب مجھے پاک ون سے آف لوڈ کر دیا گیا تو اسی نے مجھے لفٹ دینے کی پیش کش کی تھی۔ ہمارا سیسنا، بلکہ اُس کا سیسنا، ٹارمک پر منتظر ہے کہ پاک ون ٹیک آف کر لے۔ پروٹوکول کہتا ہے کہ رن وے سے پاک ون کو پہلے رخصت لینی چاہیے۔

'تمھیں پھر سے، دیکھ کر خوشی ہوئی، نوجوان۔' وہ اپنی پی کیپ میری جانب لہراتا ہے۔ وہ ایک موٹی سی کتاب کھولتا ہے جس کے سرورق پر ایک موٹے سے آدمی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ آئیاکوکا: ایک سوانح، کتاب کا عنوان ہے۔ 'بہت سا کام پڑا ہے کرنے کو۔' وہ پائلٹ کی جانب دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

کتابوں اور سپاہیوں میں تعلّق ہی کیا ہے؟ میں سوچتا ہوں۔ ساری بلڈی فوج زنخے دانش وروں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں جہاں امریکی سفیر چلتا ہوا جنرل ضیا کے پاس پہنچ رہا ہے؛ دو ہاتھوں کا مصافحہ کرتا ہے، گلے ایسے لگاتا ہے جیسے وہ سفیر کو دو گھنٹے بعد نہیں مل رہا بلکہ اُسے اپنا برسوں سے بچھڑا ہوا بھائی مل گیا ہے۔ جنرل ضیا کے دانت کچھ اور باہر نکل آتے ہیں، اس کے دانت چمکتے ہیں اور اس کا دوسرا بازو خود کو سفیر کی کمر کے گرد باندھ لیتا ہے۔ بینن سوٹ میں ملبوس اُن کے پیچھے کھڑا ہے اور پریشانی کے عالم میں سگریٹ پھونک رہا ہے۔ وہاں ایسی فضا ہے جیسے اہم ترین افراد کسی لطیفے کی ساجھے داری کر رہے ہوں اور خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دے رہے ہوں۔ فقط ان کے سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتے وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ جنرل ضیا اپنے پیر گھسیٹ رہا ہے۔ وہ اپنے اردگرد موجود دو مردوں کے کاندھوں پر تقریباً لٹکا ہوا ہے۔ 'ہاتھی رقص کرے گا، ہاتھی اپنے پیر گھسیٹے گا، ہاتھی دھڑام سے گر کر مر جائے گا۔' انکل ستارچی نے اپنے شہد کے اثرات کے بارے میں مجھے ایک قدم بہ قدم قسم کی گائیڈ فراہم کر دی تھی۔

اگر میں اُس جہاز میں بیٹھا ہوا نہ ہوتا تو میں اپنی پی کیپ فضا میں اچھال کر انکل سٹارچی کے لیے تھری چیئرز پکار چکا ہوتا۔

جنرل بیگ میرے چہرے پر موجود مُسکراہٹ دیکھ لیتا ہے اور اس کا کریڈٹ لینے کی خواہش کرتا ہے۔ 'تم نے بڑا طویل سفر طے کیا ہے، مائی بوائے۔ اس ہول ناک قلعے سے میرے جہاز تک؛ ذرا اس سفر کا اندازہ کرو۔ ایک فوج کو سنبھالنا کسی کارپوریشن کو سنبھالنے سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔' وہ موٹے آئیا کوکا کے چہرے کو چھوتا ہے۔ 'اپنے لوگوں سے اچھا سلوک کرو، جو بھی مقابل آئے اُسے ختم کرو اور ان کا جوش و جذبہ جگاؤ، جوش و جذبہ جگاؤ، جوش و جذبہ جگاؤ۔' وہ ایک لمحے کے لیے توقف کرتا ہے، اور اپنی طاقتِ لسانی کا لطف لیتا ہے۔ 'میرا جہاز ہمیں اسلام آباد لے جائے گا۔' وہ پائلٹ کی جانب مُڑتا ہے۔ 'میرا جہاز تمھیں اکیڈمی میں بھی ڈراپ کر سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ بہتر یہ ہوگا کہ تم وہاں سے کوئی جیپ لے لو۔ اسلام آباد میں مجھے کچھ اہم کام کرنے ہیں۔ اسلام آباد میں میرا پہنچنا ضروری ہے۔' وہ پائلٹ کے کاندھے پر تھپکی دیتا ہے۔ 'میرا جہاز اسلام آباد کب پہنچے گا؟'

اگر انکل سٹارچی کے شہد نے اُس کے وعدے کے مطابق کام کر دکھایا تو آج رات تک یہ شخص اس فوج کا سربراہ بن جائے گا جسے ریڈرز ڈائجسٹ نے دنیا بھر میں سب سے بڑی اور پیشہ ور مسلم فوج کہہ کر بیان کیا ہے، اور آئین کی کسی تخلیقی توضیح کی مدد سے شاید ملک کا صدر بھی بن جائے۔

کیا قسمت ہے اس قوم کی۔

پاک ون ٹیکسی کرنا شروع کرتا ہے اور جنرل ضیا اپنے دونوں انگوٹھے حفاظتی بیلٹ میں ڈال کر اپنے ساتھیوں کو ملاحظہ کرتا ہے۔ اس کا درد ایک لمحے کے لیے رُک گیا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، اس سے وہ مطمئن ہے۔ اس نے اُن سب کو یہاں جمع کر رکھا ہے۔

اس کے تمام ٹاپ کے جرنیل یہاں ہیں سوائے اس دھوپ کے چشمے والے کے جو نکل گیا۔ جب جنرل ضیا کو اُس کی آنکھوں میں دیکھنا یاد آتا ہے تو اس کا دل ایک دھڑکن بھول جاتا ہے۔ متلوّن مزاج حرامی، اسے سبق ضرور سکھانا چاہیے۔ میرا خیال ہے مجھے چاہیے کہ اسے ماسکو میں سفیر بنا کر بھیج دوں اور دیکھوں کہ وہ وہاں دھوپ کا چشمہ کیسے لگاتا ہے۔ وہ اپنے گرد ایک اور نظر گھماتا ہے اور خود کو یقین دلاتا ہے کہ جس کسی کی بھی کوئی اہمیت ہے وہ وہاں موجود ہے، بلکہ بھائی اختر بھی جس کے جسم پر لگتا ہے کہ پیلا پسینہ بہہ رہا ہے۔ اور سب سے اہم تو یہ کہ آرنلڈ اور وہ سی آئی اے کی قسم کا بندہ بھی یہاں ہے جو سفیر کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ کون ہوگا جو بہ قائمی ہوش و حواس امریکی سفیر کو قتل کرنے کا سوچے گا؟ اچھا ہے، وہ سوچتا ہے۔ میرے سارے دوست یہاں ہیں۔ میں نے سب کو بٹھا لیا ہے۔ تعداد میں طاقت ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو خود اُسے بھی یہیں موجود ہونا ہوگا۔ ہم سب جائیں گے تو اکٹھے جائیں گے۔

لیکن کوئی مجھے مارنا چاہے گا ہی کیوں؟ میں کر ہی کیا رہا ہوں، اپنے جہاز پر ایک دعوتِ آم کرنے کے سوا۔ کیا یہ کوئی گناہ ہے؟ نہیں۔ لیکن چلو پھر بھی دعا تو کر ہی لیں۔ وہ حضرت یونس کی دعا پڑھنا شروع کرتا ہے لیکن اس کے مُنھ سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ اس سے پہچانے نہیں جاتے: 'میرے عزیز ہم وطنو، تمھیں بد دعا دی جا چکی، تمھارے کیڑے ہیں۔۔۔' اس نے دعا کی مشق ہر رات کر رکھی ہے۔ ایک دعا اور آپ بخش دیے جاتے ہیں۔ ایک لمحے میں آپ وہیل مچھلی کے پیٹ کے اندر ہوتے ہیں، تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں، اور دوسرے لمحے آپ دنیا میں پھینک دیے جاتے ہیں، زندہ۔ جیسے آپ پھر سے پیدا ہوئے ہوں۔ وہ پھر سے کوشش کرتا ہے؛ وہ اپنا مُنھ کھولتا ہے اور اس سے گڑگڑاہٹ جیسی ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ پریشانی میں اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا وہ سب اسے یہ تو نہیں بتائیں گے کہ وہ اپنی تمام دعائیں بھول چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چیخ کر اُن کی درستی کرے کیوں کہ اسے کوئی دعا نہیں بھولی، اسے سب یاد

ہیں؛ یہ فقط اس کے پیٹ میں ہونے والے اندوہ ناک درد کی وجہ سے ہے کہ اس کی تمام یادداشت صاف ہوئے جا رہی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شاید اسے دوسروں کے لیے دعا کرنا چاہیے۔ جب آپ دوسروں کے لیے دعا کرتے ہیں تو یہ بات اللہ کو پسند آتی ہے۔ دراصل یہ اپنے لیے دعا مانگنے سے بھی بہتر ہے۔ وہ وی آئی پی پوڈ میں سوار چہروں کا جائزہ لیتا ہے اور ان کے لیے دعا کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔

'ماں چود۔' وہ چلاتا ہے۔

وہ سب اس کی طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی شریر بچہ ہو اور اس سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ ہو کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے۔

پاک ون رن وے کے درمیان میں سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے پنکھے رفتار پکڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ پائلٹ، جن کا پسینہ پہلے ہی سے بہنے لگا ہے اور جو اپنے نقشے تہ کر کے خود کو پنکھا جھل رہے ہیں، آخری چیکنگ کے مراحل طے کرتے ہیں۔ ائر ٹریفک کنٹرولر بڑے احترام کے ساتھ انھیں ٹیک آف کے لیے کلیئرنس دیتا ہے۔ وی آئی پی پوڈ کے باہر، جہاز کی پشت پر، میجر کیانی اپنی پتلون کا ایک اور بٹن کھول لیتا ہے اور زیادہ آسانی سے سانس لینے لگتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، وہ خود سے کہتا ہے۔ جنرل اختر کے پاس ہمیشہ کوئی پلان بی اور پلان سی ضرور ہوتا ہے۔ اس نے تو خود کو دیے جانے والے احکامات پر عمل درآمد کر دیا۔ اب طیارے میں ائر کنڈیشننگ نظام کو چالو نہیں کیا جائے گا۔ 'جنرل اختر کا حکم ہے۔' اس نے پائلٹوں کو بتا دیا ہے۔ وہ ابھی سے کچھ بہتر محسوس کر رہا ہے۔ جنرل اختر جانتا ہے کہ یہ دنیا کیسے کام کرتی ہے۔ جنرل اختر یہ بھی جانتا ہے کہ دنیا کس درجہ ء حرارت پر بہترین کام کرتی ہے۔ وارنٹ افسر فیاض ایک ایسے کیڈٹ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے جو ایک کتاب پڑھنے میں منہمک ہے۔ وہ اپنی ران کے ساتھ اس کی ران کو مس کرتا ہے؛ کیڈٹ اس بات کا نوٹس بھی نہیں لیتا۔

وی آئی پی پوڈ کے اندر جنرل اختر اپنی نشست پر پہلو بدلتا ہے اور خود سے کہتا ہے

کہ اُس نے زندگی بھر اس لمحے کا انتظار کیا ہے اور اگر اب بھی اسے جہاز سے اترنے کا کوئی اچھا سا بہانہ مل جائے تو وہ اپنی تقدیر کا لکھا پورا کر سکتا ہے۔ وہ آدمی جس نے بڑے بڑے جھوٹ تخلیق کرنے اور تیرہ کروڑ عوام کو ان کا یقین دلانے میں پوری ایک دہائی صرف کی ہے، وہ شخص جس نے اپنے ملک سے کہیں بڑے ملکوں کے خلاف بڑی بڑی نفسیاتی جنگیں لڑی ہیں، وہ شخص جو خود کو یہ کریڈٹ دیتا ہے کہ اس نے کریملن کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا، اب ایک آئیڈیا سوجھنے سے بھی قاصر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ائر کنڈیشننگ نظام چالو نہیں کیا گیا، لیکن کیا کوئی واقعی یہ بات جانتا بھی ہے کہ ایک ائر فریشنر کام کیسے کرتا ہے؟

وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتا ہے، اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کرتا ہے اور کہتا ہے، 'مجھے ذرا واش روم جانا ہے۔' اور کوئی اور نہیں بلکہ بینن، ایک کم رتبہ لیفٹیننٹ، اپنا ہاتھ اس کی ران پر جماتے ہوئے کہتا ہے، 'جنرل، میرا خیال ہے آپ کو اس پرندے کے ٹیک آف کرنے کا انتظار کر لینا چاہیے۔'

سفیر رافیل سوچتا ہے کہ وہ کسی جنوب امریکی ملک میں تبادلے کی درخواست بھیج دے گا اور ایک بچہ پیدا کرنے کے بارے میں بھی سوچے گا۔

• • •

ڈیڑھ میل دور، آموں کے ایک اونگھتے ہوئے باغ میں، دھول سے اٹے گہرے سیاہ پتوں کے پیچھے ایک شاخ پر بیٹھا کوا اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور اُس چنگھاڑتی ہوئی آواز کی جانب پرواز شروع کر دیتا ہے جو پاک ون کے پندرہ سو ہارس پاور کے چار انجنوں سے آ رہی ہے۔ پاک ون رن وے سے جا رہا ہے، اسے دوبارہ کبھی نہ چھونے کے لیے۔

جیسے ہی صدارتی طیارہ ہوا میں پرواز کرتا ہے ہمارا سیسنا طیارہ بھی رن وے کی جانب ٹیکسی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس جیسی جسامت کے طیارے کے لیے ایسی اڑان بہت عمودی سی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پاک ون کششِ ثقل کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے لیکن اس کے چاروں انجن دہاڑتے ہیں اور جہاز ایسے اوپر اُٹھ جاتا ہے جیسے کوئی وھیل مچھلی ہوا خوری کے لیے پانی کی سطح سے اوپر اچھلتی ہے۔ اس کی اُٹھان کم زور ہے لیکن اس کی مدد سے جہاز رن وے سے آگے نکل جاتا ہے اور پھر ہنوز اوپر اُٹھتے ہوئے دائیں جانب مڑ جاتا ہے۔

ہمارے اپنے جہاز کا ٹیک آف پُر شور لیکن سہل ہے۔ ہمارا سیسنا طیارہ رن وے سے رخصت ہوتے وقت ہلکا پھلکا ہے اور ہوا میں ایسے سوار ہو جاتا ہے جیسے ہوا اس کی فطری بود و باش کا مقام ہو۔ جنرل بیگ اپنے رے بین کے چشمے اپنی ناک کی پھننگ پر ٹکائے اپنی کتاب کے مطالعے میں مستغرق ہے۔ پائلٹ نوٹ کرتا ہے کہ میں اپنے کانوں میں انگلیاں مار رہا ہوں اور وہ مجھے ہیڈ فون کا ایک سیٹ فراہم کرتا ہے لیکن اس کا پلگ اُتارنا بھول جاتا ہے۔ میں ٹاور کے ساتھ اس کی بات چیت اور ساتھ ہی ٹاور کی پاک ون کو بات چیت بھی سن سکتا ہوں۔

'پاک ون اسلام آباد کا راستہ لے رہا ہے۔'

'روجر۔' ائر ٹریفک کنٹرولر کہتا ہے۔

'رن وے کلیئر کر رہا ہوں۔ دائیں مڑ رہا ہوں۔'

'اللہ حافظ۔ ہیپی لینڈنگ۔'

میں ان کی گفتگو کے اس تبادلے میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ جب ہمارا سیسنا طیارہ یکایک ڈبکی کھا جاتا ہے تو مجھے دھچکا سا لگتا ہے۔ طیارہ جلد ہی اس جھٹکے سے سنبھل جاتا ہے اور پھر سے اونچائی کی طرف اُڑان بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ جنرل بیگ کے ہاتھ ہوا میں ہیں۔ 'ایک بلڈی کوا۔ میرے جہاز کی طرف آیا تھا وہ۔ کیا تم نے دیکھا تھا؟ کیا تم

اندازہ کر سکتے ہو کہ جب ہم نے پورے علاقے کو ہر قسم کے خطروں سے پاک کر دیا ہے تب بھی یہاں کوے گھوم پھر رہے ہیں۔ کوڈ ریڈ زون میں کوے۔ کیا کسی نے سنی ہے ایسی عجیب بات؟ یہ تو میرے پائلٹ کا شکر ہے کہ ہم اب تک زندہ ہیں۔' پائلٹ ہماری جانب دیکھے بغیر اپنا انگوٹھا اوپر کر کے ہماری جانب اشارہ کرتا ہے۔

'پرندے مارنے والے۔' جنرل بیگ ایسے کہتا ہے جیسے سیب ابھی ابھی اُسی کے سر پر گرا ہو۔ 'یہی تو ضرورت ہے: پرندے مارنے والے۔' وہ ایک فائل پر قلم چلانا شروع کر دیتا ہے اور ہوا بازی کی تاریخ کے ایک انمول کارنامے کا نظارہ کرنے سے رہ جاتا ہے۔

پاک ون ناک کی سیدھ میں ڈبکی لگا کر ایک گہرا سا غوطہ کھاتا ہے، پھر اس کی ناک اُٹھتی ہے اور جہاز پھر سے اونچائی کی جانب بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہوا میں معلق کسی رولر کوسٹر کی طرح، پاک ون اگست کی گرم ہوا میں کسی نہ دکھائی دینے والی لہر پر چل رہا ہے۔ اوپر اور نیچے اور پھر دوبارہ سے اوپر۔

اس مظہر کو کہتے ہیں فوگوئڈ (phugoid)۔

ڈھیلے ڈھالے انداز میں پرواز کرتا ہوا کوا گرم ہوا کی لہروں پر جھولتا جاتا ہے۔ خود اپنے وزن کے برابر آم کھا کر اب کوا بہ مشکل اپنے پر ہلا پا رہا ہے۔ اس کی چونچ جھک جاتی ہے، اس کی آنکھیں آدھی بند ہیں، اس کے پر سلو موشن میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔ کوا سوچ رہا ہے کہ اس نے آموں کے باغ میں اپنا گوشہ ء عافیت چھوڑا ہی کیوں۔ وہ اپنا دایاں پر اپنے جسم کے نیچے دبا لیتا ہے اور واپس مڑنے کے لیے سُستی سے ایک دائرہ سا بناتا ہے۔ اچانک کوا خود کو ہوا میں لڑھکنیاں کھاتا اور دھات کی بنی ہوئی ایک عظیم الجثہ وھیل کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا ہے جو دنیا بھر کی ہوا کو اپنے اندر کھینچ رہی ہے۔ کوا ایک منٹ میں پندرہ سو بار گھوم کر ہوا کے ٹکڑے کرنے والے پروپیلر کے نیچے سے غوطہ کھاتا ہے اور خوش قسمتی سے بچ جاتا ہے۔ لیکن یہ اسکی آخری خوش بختی ثابت ہوتی ہے۔ کوا

لڑھک کر انجن میں پھنس جاتا ہے، اس کے اندرونی دائرے میں گھومتا ہے اور سائیڈ ڈکٹ میں کھینچ لیا جاتا ہے؛ اس کی مہین چیخ انجن کی دہاڑ میں دبی رہ جاتی ہے۔

سی ون تھرٹی کی معمول کی پرواز کے دوران کوئی پائلٹ اپنے راستے میں آنے والے کوے پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالتا اور اپنی پرواز جاری رکھتا ہے۔ لیکن پاک ون کو اُڑانے والا پائلٹ ایسے کسی کوے سے بچنے کی ضرور کوشش کرے گا۔ جب آپ صدر (اور امریکی سفیر) کو لے جا رہے ہوں تو آپ ہر قسم کے خطرے سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے اس خطرے کا تناسب ایک ہاتھی کے مقابلے میں کسی چیونٹی جتنا بھی کیوں نہ ہو۔ بہت زیادہ پسینہ بہاتے ہوئے پائلٹ فوجی جرنیلوں کی فطری حماقت پر لعنت بھیجتا ہے اور جہاز کو غوطہ دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ پرندے سے ٹکرانے سے بچ نہیں سکا، کیوں کہ اس کے پورٹ انجن کو مانیٹر کرنے والی پریشر نیڈل اچانک گر جاتی ہے اور جہاز کا ائرکنڈیشننگ نظام خود بہ خود چالو ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک تر و تازہ کردینے والا جھونکا اس کی پسینے سے بھری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لیونڈر کی خوش بو اسے وہ حکم بھول جانے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ائرکنڈیشننگ نظام کو بند رکھنا تھا۔

جنرل ضیا جہاز کو غوطہ کھاتے ہوئے محسوس کرتا ہے، اپنی حفاظتی بیلٹ کھول دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں اب یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اب ان چوتیوں کو یہ بتانے کا وقت آ چکا ہے کہ یہاں ان چارج کون ہے۔ گیارہ سال، وہ سوچتا ہے۔ کیا کوئی شخص اللہ کی مخلوق پر گیارہ سال حکومت کر سکتا ہے اگر اللہ اس کے ساتھ نہ ہو؟

جنرل ضیا مضبوطی سے کھڑا ہوتا ہے، اس کے ہاتھ اُس کے کولہوں پر ہیں، جیسے وہ کسی متلاطم سمندر میں پھنسی کشتی کا کمانڈر ہو۔ اس کے سامعین اپنی نشستوں پر سکڑ جاتے

ہیں اور خود کو کوئی غیر فطری سا موڑ مڑتی ہوئی رولر کوسٹر میں بیٹھے لوگوں کی طرح ایک دوسرے سے چپکا ہوا پاتے ہیں۔

جنرل ضیا اپنا بایاں بازو پیچھے لے جاتا ہے اور پھر اسے آہستگی سے اوپر لاتا ہے، جیسے کوئی بیس بال کا پچر بچوں کے ایک جگھٹے کو اپنی بات سمجھا رہا ہو۔ وہ اپنی مٹھی بلند کرتا ہے اور اس مٹھی سے اس کی شہادت کی انگلی برآمد ہوتی ہے۔ 'یہ جہاز، اللہ کے حکم سے، پھر بلند ہوگا۔' وہ اپنی شہادت کی انگلی بلند کرتا ہے جیسے وہ جہاز کی ناک کو اپنی انگلی کے پوٹے سے کھینچ رہا ہو۔ وہ سب دیکھتے ہیں، پہلے سکون اور پھر دہشت کے احساس کے ساتھ کہ جہاز واقعی ایک مرتبہ پھر اوپر جانے لگتا ہے۔ وہ پچھلی جانب لڑھک جاتے ہیں۔ آرنلڈ رافیل کا سر ایک لمحے کے لیے جنرل اختر کے کاندھے پر ڈھے جاتا ہے۔ وہ معافی کا خواست گار ہوتا ہے اور اپنی حفاظتی بیلٹ کو مزید کس لیتا ہے۔

جنرل ضیا نیچے بیٹھ جاتا ہے، اپنی رانوں پر دوہتڑ مارتا ہے اور داد طلب نگاہوں سے اردگرد دیکھتا ہے۔

جنرل اختر اپنے خیالات تبدیل کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ اسے معلوم بھی نہ تھا لیکن وہ شاید تمام عمر ایک برگزیدہ اور معجزاتی شخصیت کی نوکری کرتا رہا ہے۔ وہ جنرل ضیا کی جانب تعظیم کی نظروں سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ شاید اسے قبول کر لینا چاہیے کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے اور جنرل ضیا پھر اس کیے کو نہ کیا ہوا بنا سکے گا۔ شاید وہ ائرفریشنر ٹیوب میں موجود وی ایکس گیس کو پھر سے لیونڈر کے قطروں میں تبدیل کر سکے گا۔ پھر وہ خود کو روک لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر جنرل ضیا واقعی کوئی پہنچا ہوا شخص ہوتا تو وہ جان لیتا کہ جہاز کے پائلٹ اب تک مر چکے ہیں۔ وی ایکس گیس مفلوج کرنے کے لیے دو منٹ لیتی ہے، اور مارنے کے لیے مزید ایک منٹ۔ اگر آپ پاک ون اُڑا رہے ہوں تو آپ باقی بچ جانے والے اُس ایک منٹ میں بہت زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر جنرل ضیا واقعی کوئی برگزیدہ شخصیت ہے تو پھر تو وہ شاید پائلٹوں کو بھی موت سے واپس لا سکتا ہوگا۔

ائر کنڈیشننگ ڈکٹ زندگیوں میں اپنی زہریلی پھنکار پھونکتی ہیں۔

جنرل اختر امید کر رہا تھا کہ موت لیونڈر کے ایک جھونکے کے ساتھ اپنی آمد کا اعلان کرے گی، لیکن اس کے نتھنوں میں کسی مُردہ پرندے کی بو محسوس ہوتی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنی مشکل کو کیسے بیان کرے کہ جہاز کی ناک پھر سے غوطہ کھا جاتی ہے اور ایک اور چھلانگ کے لیے نیچے کا رُخ کرتی ہے۔

وی آئی پی پوڈ کا پچھلا دروازہ کھلتا ہے۔ لوڈ ماسٹر فیاض پوچھتا ہے، 'کیا میں آم پیش کر سکتا ہوں، سر؟'

• • •

'کیسا فحش لفظ ہے؟ آخر کیا ہوتا ہے فوگوائڈ؟' جنرل بیگ یکا یک بہت مجتسس ہو جاتا ہے۔

'بس سمجھیے کہ یہ اُس کام کو کہتے ہیں جو جہاز تب کرتا ہے جب اس کا کنٹرول نیوٹرل ہو جائے۔ جہاز نیچے گرنا شروع ہوگا۔ لیکن پھر جب وہ ایک خاص زاویے سے نیچے چلا جاتا ہے تو اس کا اندرونی محور خود کو درست کرتا ہے اور جہاز ایک بار پھر اوپر آنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نیچے گرنے لگتا ہے۔ لیکن اُس سے پہلے وہ اوپر بھی اُٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی پھر سے کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔'

'تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'

'میں نے یہ سب اپنی فضائی حرکیات کی کلاس میں پڑھا۔'

'کنٹرول نیوٹرل کیوں ہو جاتا ہے؟ اس بلڈی جہاز کو کوئی شخص اُڑا کیوں نہیں رہا؟' وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔

کیوں؟

'پاک ون، کم اِن، پاک ون۔ پاک ون۔' ائر ٹریفک کنٹرولر کی آواز سے لگتا ہے

کہ وہ آنسو بہانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔

بینن کی آواز ہیڈ فون پر سنائی دیتی ہے۔ 'یسوع مسیح۔ یہ مردار تو سو رہے ہیں۔ نہیں۔ یہ مر چکے ہیں۔ پائلٹ مر چکے ہیں۔ ہم سب مارے جا چکے ہیں۔' آخری جملے میں اس کا حلق رندھا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہیڈ فون پر واحد آواز الیکٹریکل سٹینک کی باقی رہ جاتی ہے۔

جنرل ضیا کی آنکھیں خود اپنی معجزاتی قوت دیکھ کر چمک رہی ہیں۔ 'میں ان گانڈوؤں کو سکھا دوں گا۔ دیکھو، یہ پھر سے اوپر آ جائے گا۔ دیکھو۔ یہ لو یہ جا رہا ہے اوپر۔ دیکھو۔' وہ اپنی شہادت کی انگلی ہوا میں بلند کرتا ہے۔ جہاز نیچے کی طرف جانا جاری رکھتا ہے۔

وی آئی پی پوڈ کے کچھ مسافر اب قالین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جنرل اختر اپنی نشست پر ہی بیٹھا رہتا ہے۔ اپنی حفاظتی بیلٹ بھی باندھے رہتا ہے۔ ایک اور معجزے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

جنرل ضیا کسی شوقیہ بھنگڑا ڈالنے والے کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں بلند کرتا ہے اور چلّاتا ہے: 'اب بتاؤ مجھے کہ مجھے کون مارنے کی کوشش کر رہا ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ تم مجھے مار دو گے؟ ذرا دیکھو کہ اب مر کون رہا ہے۔'

کنڈو دانے اب جنرل ضیا کے قلب کو کھا رہے ہیں۔ کریٹ سانپ کے زہر نے اس کے درد کا احساس کم کر دیا ہے لیکن وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کی آنتیں پھٹی جا رہی ہیں۔ وہ زندگی کے ساتھ جڑے رہنے کی کوشش میں ائر کنڈیشنر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کی سانس بھرتا ہے۔ اس کی سانسوں میں وی ایکس گیس داخل ہو جاتی ہے۔

اگر یہ سب جنرل ضیا کو مارنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو انھیں مارنے کی کوشش کون کر رہا ہے؟

اس سے پہلے کہ میں خدا سے رجوع کروں، میں جنرل بیگ کی طرف دیکھ کر چلاتا ہوں،'سر، پلیز کچھ کریں۔ جہاز نیچے گر رہا ہے۔ پائلٹ مر چکے ہیں۔ کیا آپ سن رہے ہیں؟'

جنرل بیگ اپنے ہاتھ بے بسی سے ہوا میں لہراتا ہے۔'میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہاں فضائی حرکیات کا ماہر میں تو نہیں؟'

وہ اپنے رے بین کا چشمہ آنکھوں سے ہٹاتا ہے اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔ وہ بہت زیادہ پریشان نہیں لگتا۔

خدایا، میں ان لوگوں میں سے ایک نہیں بننا چاہتا جو تیری طرف تب رجوع کرتے ہیں جب اُن کی گاف پھٹتی ہے۔ میں کسی چیز کا کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔ یہ بلا سوچے سمجھے وعدے کرنے کا وقت بھی نہیں، لیکن اگر تو اس جہاز پر صرف ایک آدمی کو بچا سکتا ہے تو پھر عُبید کو بچا لے۔ اگر اس جہاز میں کوئی پیرا شوٹ ہے تو اُسے عنایت کر۔ اگر تیری قدرت میں کوئی معجزہ باقی رہ گیا ہے تو وہ معجزہ ابھی دکھا۔ اور اس کے بعد میں پھر تیری بارگاہ میں حاضری دوں گا۔ تجھ سے بات کروں گا۔ میں ہمیشہ تیری بات سنوں گا۔

میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں اور نارنجی آگ کے ایک بہت بڑے بگولے سے پاک ون کی دُم اُڑ کر باہر نکلتی ہوئی دیکھتا ہوں۔

پہلے تو تینتالیس سو ہارس پاور کے چار انجنوں سے کھینچے جانے والی اٹھتر ٹن کی دھات اور ایندھن اور سامان کے گرم صحرائی زمین سے ٹکرانے اور لڑھکنے، ٹائی ٹینیئم جوڑوں کے ایک دوسرے کو کھینچنے، مزاحمت کرنے اور پھر مزاحمت ترک کرنے کی آواز آتی ہے۔ ایندھن کے پورے بھرے ہوئے ٹینک زمین سے ٹکرانے پر ابلنے لگتے ہیں اور پھر پھٹ پڑتے ہیں۔ صحرا دھات اور گوشت اور عجیب و غریب اشیا کی ایک بارش وصول کرتا ہے۔ میڈل ایسے اُڑتے ہیں جیسے آسمان سے کوئی سونے کے سکّوں کی مُٹھی بھر کر پھینک دے،

فوجی بوٹ جو باہر سے چمک رہے ہیں اور جن سے کٹے ہوئے پیروں کا لہو ٹپک رہا ہے، پی کیپ ہوا میں ایسے اچھل رہی ہیں جیسے فریبی ہوں۔ جہاز اپنے راز اگل رہا ہے: بٹوے جن میں مُسکراتے ہوئے بچوں کی تصویریں ہیں، داشتاؤں کو لکھے جانے والے نامکمل خط، فلائٹ مینول جن پر ایمرجنسی قواعد وضوابط کی نشان دہی سرخ رنگ سے کی گئی ہے، وردیوں کے سنہری بٹن جن پر ٹکراتی ہوئی دو تلواروں کے نشان ہیں، ایک سرخ پٹی جس پر بری، بحری اور فضائی افواج کے لوگو لگے ہیں ہوا میں بہتی ہوئی آ رہی ہے، ایک ہاتھ ہے جو مٹھی کی صورت بند ہے، منرل واٹر کی بوتلیں ہیں جو ابھی تک ٹھیک ٹھاک ہیں، دیدہ زیب چائنا کراکری ہے جس پر صدارتی نشانات بنے ہوئے ہیں، ٹائی ٹینیئم پلیٹیں ہیں جن کے کنارے جل رہے ہیں، بند الٹی میٹر اور جائروسکوپ ہیں جو اب بھی اسلام آباد کی جانب اشارہ کر رہے ہیں، پشاوری چپلوں کی ایک جوڑی ہے، ایک تیل کے داغ لگا اوورآل ہے جس پر نیم پلیٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے؛ لینڈنگ گیئر کا ایک حصہ لڑھکتا ہوا آتا ہے اور نیوی بلیو کوٹ پہنے ہوئے ایک ایسے دھڑ کے پاس آ کر رُک جاتا ہے جس کا سر موجود نہیں۔

تین منٹ بعد صحرا میں ایک اور بارش ہوتی ہے: اوّل درجے کے ایوی ایشن فیول کے بیس ہزار لیٹر ہوا میں بکھر جاتے ہیں، خود کو جلا ڈالتے ہیں اور واپس صحرا کی جانب آتے ہیں۔ جہنم کی طرف سے مون سون آئی ہے۔

اور گوشت؛ ہر قسم کا گوشت ہے یہاں: بھورا گوشت پگھل کر سفید ہو رہا ہے، بافتیں ہیں، عضلات ہیں، ہڈیوں سے پھٹا ہوا گوشت ہے، بھنا ہوا گوشت ہے، جلا ہوا گوشت ہے؛ جسم کے مختلف اعضا ایسے بکھرے پڑے ہیں جیسے آدم خوروں کی دعوت میں پھینک دیے ہوئے پکوان۔

ایک پتلی سی کتاب کے جلے ہوئے صفحات بھی ہیں، ایک ہاتھ کتاب کو پکڑے ہوئے ہے، ایک انگوٹھا، جس پر ناخن ابھی آدھا اُگ سکا ہے، کتاب کے آخری صفحے میں

سختی سے دھنسا ہوا ہے۔

جب پاکستان کا قومی ٹیلے وژن اپنی شام کی نشریات کا ڈرامہ سیریل روک کر اچانک قرآن کی تلاوت چلا دیتا ہے تو خاتونِ اوّل کچھ دیر تک انتظار کرتی ہے۔ یہ کسی بریکنگ نیوز کا ابتدائیہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن قرات کرنے والے مُلّا نے قرآن کی طویل ترین سورت منتخب کر لی ہے اور خاتونِ اوّل جانتی ہے کہ وہ ابھی مزید کچھ گھنٹے تلاوت جاری رکھے گا۔ خاتونِ اوّل وزیرِ اطلاعات کو کوستی ہے اور فیصلہ کرتی ہے کہ ابھی وہ کچھ گھر کا کام کر لے۔ اس کا پہلا پڑاؤ اس کے شوہر کا بیڈ روم ہے۔ وہ بستر کے ساتھ رکھی میز سے دودھ کا گلاس اُٹھاتی ہے، اور پھر اسے واپس رکھتے ہوئے اسے بیڈ شیٹ پر ایک سیاہ دھبہ نظر آتا ہے۔ وہ خون کے دھبّے کو غور سے دیکھتی ہے اور اپنی ناک سکیڑتی ہے۔ 'بے چارہ بیمار ہے۔' خاتونِ اوّل کو پچھتاوے کا احساس ہوتا ہے جو پہلے غصّے اور پھر بے انتہا مایوسی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ 'وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ اسے اور کسی وجہ سے نہیں تو صحت کی بنیاد پر ہی ریٹائر ہو جانا چاہیے۔' لیکن وہ اُسے اتنے عرصے سے جانتی تھی کہ اسے علم تھا کہ وہ کبھی ریٹائر ہو کر سکون سے نہیں رہے گا۔ خاتونِ اوّل بستر کے ساتھ کی میز پر سے ریڈرز ڈائجسٹ کا نیا شمارہ اُٹھاتی ہے۔ شمارے کی مرکزی اسٹوری اس بارے میں ہے کہ اگر آپ کا شوہر آپ کو دھوکا دے تو آپ کیسے اپنی زندگی کو پھر سے مجتمع کر سکتی ہیں۔ شادی کے لیے کوئی تھراپی ہوگی؟ وہ سوچتی ہے۔

میرے لیے نہیں ہے یہ، وہ سوچتی ہے اور خون کا داغ لگی شیٹ لانڈری باسکٹ میں ڈال دیتی ہے۔

• • •

ہمارا سیسنا جہاز نارنجی آگ کے گولے کے گرد دائرے میں چکر لگاتا ہے۔ میری

آنکھیں کسی پیرا شوٹ کی تلاش میں سارا افق اور پھر کسی آگ اور دھوئیں میں سے نکل کر جاتے ہوئے کسی اکیلے شخص کی تلاش میں سارا صحرا چھان مارتی ہیں۔ آسمان کا نیلا رنگ صاف ہے اور آگ کے گولے اور اڑتے ہوئے ملبے کے گرد صحرا خالی اور لاتعلق دکھائی دے رہا ہے؛ اس جہنم سے نکل کر کوئی بھی باہر نہیں آ رہا۔ ہمارے جہاز کے پائلٹ کو ہدایات وصول کرنے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ 'کچھ نہیں بچا یہاں۔ یہاں لینڈ کرنے کی کوئی تُک نہیں۔' جنرل بیگ فیصلہ کر چکا ہے۔ 'ہمیں اسلام آباد پہنچنے کی ضرورت ہے۔'

وہ اپنی نشست کی پشت سے بار بار ٹکریں مارتے ہوئے میرے سر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ 'نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک نظر اور ڈالنے کے لیے چکر ہی لگاتے پھریں۔ نہیں، نوجوان، ہم تمھیں یہاں سے نیچے بھی نہیں پھینک سکتے۔ یہاں ڈھونڈنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آ جاؤ، تھوڑی اُٹھاؤ، سپاہی بن کر دکھاؤ۔ ہمیں ایک پورا ملک چلانا ہے۔'

کوڈ زی کا آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے اور صحرا پر ہر ممکن سائز اور بیان کی حامل ایمرجینسی گاڑیاں ہلّہ بول دیتی ہیں۔ ان میں عام سپاہیوں سے بھرے ہوئے ٹرک ہیں جن کا مشن نا معلوم ہے، بکتر بند گاڑیاں ہیں جن پر مشین گنیں کاک کی جا چکی ہیں، ایمبولینسیں ہیں جن میں آکسیجن سیلنڈر تیار پڑے ہیں، کمانڈو ہیں جو کھلی چھت والی جیپوں میں سوار ہیں، فائر انجن ہیں جن کے دروازوں سے سرخ ہیلمٹ باہر لٹک رہے ہیں، ائر کرافٹ ٹیکنیشین سے بھری بسیں ہیں جیسے پاک ون میں کوئی معمولی سا میکانکی نقص آ گیا ہو۔ حد بندیاں کر دی گئی ہیں، ایمرجینسی مواصلاتی سسٹم بھی بے قرار آوازوں کے ساتھ چالو کر دیے گئے ہیں اور کریش کے مقام کے ارد گرد کئی میل طویل سرخ ٹیپ باندھ دی گئی ہے۔

ایک کیٹرنگ وین بھی نمودار ہو چکی ہے جیسے مُردے شاید بھوک محسوس کریں گے اور سہ پہر کے لیے کچھ جھٹ پٹ قسم کی چیز کھانے کو مانگیں گے۔

سفید ماسک پہنے ہوئے ایک سپاہی بڑی احتیاط سے ملبے کے درمیان سے گزرتا

ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جسمانی اعضا اس کے پیروں تلے نہ آ جائیں۔ وہ پگھلتی ہوئی دھاتوں کے ٹکڑوں اور سیکرٹ کی مہر لگی دستاویزات کے درمیان راستہ بناتا ہے، اس کی آنکھیں کسی ایسی علامت کو تلاش کر رہی ہیں جس کی مدد سے وہ ایک ایسی بات کی تصدیق کر سکے جس کی تصدیق کرنے کے لیے اسے اسلام آباد سے کہا گیا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کوئی ایسے مایوس کن منظر سے کیوں ایسی تصدیق چاہے گا۔لیکن پاکستان کا قومی ٹیلی وژن اس وقت تک قرآن کی تلاوت چلاتا رہے گا، جھنڈا اس وقت تک بلند رہے گا اور ملک میں افواہیں پھیلی ہی رہیں گی لیکن ان کی تصدیق نہیں ہوگی جب تک یہاں سے کوئی شہادت نہیں مل جاتی۔ خاتونِ اوّل کو بھی تب تک نہیں بتایا جائے گا جب تک اُن کے پاس مصدّقہ ثبوت نہیں آ جاتا۔

سپاہی ایک کٹے ہوئے سر کو دیکھتا ہے جس کے چمکتے ہوئے بالوں میں بیچ کی مانگ نکلی ہوئی ہے اور یوں وہ شے ڈھونڈ لیتا ہے جس کی اُسے تلاش تھی۔

مارے جانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ، وہ سوچتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کئی مرتبہ مرا۔ اس کا چہرہ اس کی ناک کے اوپر سے ٹوٹا ہوا تھا، مونچھ آدھی جل چکی تھی، لیکن پھر بھی مُڑی ہوئی تھی، ہونٹ اور ٹھوڑی پگھل چکی تھی اور ان کی جگہ چمک دار سفید دانت نظر آرہے تھے جو ایک طنزیہ ہنسی میں ابد تک کے لیے جمے رہ گئے تھے۔

وہ اپنی شہادت کا یہ ٹکڑا اُٹھانے کے لیے جھکتا ہے تو اُسے قرآن پاک کی ایک جلد نظر آتی ہے جو درمیان سے کھلی ہوئی ہوتی ہے اور محفوظ بھی۔ اس پر ایک بھی خراش نہیں، آگ یا دھوئیں کا ایک مرغولہ بھی اسے چھو کر نہیں گزرا۔ قرآن کو چومنے اور اسے احتیاط سے بند کر دینے سے پہلے وہ اپنے سامنے کھلے ہوئے صفحے پر ایک آیت پڑھتا ہے اور ایک پرانے پیغمبر سے مُتعلّق ایک بھولی بسری کہانی یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لا الٰہ اِلّا اَنتَ سُبحٰنَکَ اِنّی کُنتُ مِنَ الظّالِمین

گارسیا مارکیز نے کہا تھا کہ اگر ایک شخص خوش بخت ہو تو اُس کی زندگی میں ایک ایسی عورت آتی ہے جو اُسے مرد بنا دیتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ایک مصنف خوش بخت ہو تو اُس کی زندگی میں ایک ایسا ناول آجاتا ہے جو اُسے ایک بڑا ناول نگار بنا دیتا ہے۔ میں محمد حنیف کی قسمت پر رشک کرتا ہوں کہ اُس کی زندگی میں "A Case of Exploding Mangoes" جیسا ناول آگیا جس نے کُل جہان میں اُس کی ناول نگاری کی دھاک بٹھا دی۔ ایسی بٹھائی کہ آج تک کسی اور سے اٹھ نہ سکی۔ "منطق الطیر جدید" لکھنے کا خمیازہ مجھے یوں بھگتنا پڑا کہ دن رات عطار کے پرندوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے میرے دماغ کے خلیوں میں ایک خلل نے جڑیں پکڑ لیں۔ مجھے آس پاس لوگوں کی شکلیں نہیں بھانت بھانت کے پرندے نظر آنے لگے —— اور ان میں کوّں، چیلوں اور چمگادڑوں کی بہتات ہے۔ حنیف بھی ایک پرندہ ہے اور وہ مجھے کوئل دکھائی دیتا ہے جو ادب کے باگوں میں عجب بولیاں بولتی ہے۔ جب وہ پنجابی میں کُوکتی ہے تو ایسی ٹھیٹھ کہ سارے میں مکئی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی خوشبو دُھوم جاتی ہے۔ اردو میں چہکتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ موصوفہ کوچہ بلّی ماراں دتی میں گھونسلہ بنائے بیٹھی ہے اور انگریزی بولتی ہے تو اے فوگی ڈے اِن لنڈن ٹاؤن یاد آنے لگتا ہے۔

میں بھی جب آئینہ دیکھتا ہوں تو اُس میں مجھے ایک بوڑھا عقاب نظر آتا ہے جس کی آنکھیں مرجھا رہی ہیں اور چونچ جس نے بہت شکار کیے تھے وہ ٹوٹ چکی ہے۔ تو یہ بوڑھا عقاب جس کے پر جھڑ چکے ہیں دعا کرتا ہے کہ ادب کے گلشن کی یہ بلبل سدا اِن باگوں میں بولتی رہے۔ سدا گیت گاتی رہے، اس کی تخلیق کا حُسن جوانی سدا قائم رہے اور اس کے لہجے کے کنگن سدا کھنکتے رہیں۔ یہ کبھی زوال آشنا نہ ہوں۔

مستنصر حسین تارڑ

سسپنس سے بھرپور اور نہایت استادی سے بُنے گئے اس ناول میں محمد حنیف تاریک ترین مقامات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان مقامات میں آئی ایس آئی کے قید خانے، فوجی بیرکیں اور جنرل ضیا کی خواب گاہ شامل ہیں۔ سیاہ مزاح، احتیاط سے قابو کیا ہوا غصہ اور دلیرانہ بداعت اس ناول کو ان ہیجان خیز ترین ناولوں میں شمار کرتی ہے جو میں نے ایک طویل عرصے میں پڑھے۔

کاملہ شمسی

ظریفانہ، سلیقے سے لکھا ہوا اور مزے داری کی حد تک انتشار انگیز۔ حنیف کی آنکھ مستعد ہے اور کان اُس سے بھی بہتر۔

جان لی کارے (John Le Carre)